مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

بعنوان

امت مسلمہ کے زوال کے اسباب اور اسکی نشاۃ ثانیہ کے مدارج

"ایک علمی و تحقیقی مطالعہ"

محقق

حافظ سید محمد نسیم سرور

زیرِ نگرانی

پروفیسر ڈاکٹر حسام الدین منصوری

ڈین

کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی

ماہ محرم الحرام بمطابق دسمبر ۲۰۱۰ء



Faculty of Islamic Studies

University of Karachi

KAR.-75270

DEAN

Dated 10-11-11

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ حافظ سید محمد نسیم سرور ولد سید محمد نصوح حسین نے مقالہ بعنوان امت مسلمہ کے زوال کے اسباب اور اسکی نشاۃ ثانیہ کے مدارج ایک علمی وتحقیقی جائزہ "بورڈ آف ایڈوانس سٹڈی اور ریسرچ" کی اجازت سے میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ مقالہ ہذا پی ایچ ڈی کی شرائط کو پورا کرتا ہے۔ لہٰذا انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے ایوارڈ کے لیے جمع کرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

نگران مقالہ 16/11/11

پروفیسر ڈاکٹر حسام الدین منصوری

ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز

جامعہ کراچی

انتساب

میں اپنی اس حقیر کاوش کو امت مسلمہ کے رہبر اعظم، سیدالانسانیت، سرور دو عالم حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام معنون و منسوب کرتا ہوں کہ امت مسلمہ کی از سر نو ابتداء و عروج آپ ﷺ ہی کی مرہون منت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نشاۃ الثانیہ بھی ان کے دامنِ شریعت سے وابستہ ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔

فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَيْسَ لَهُ
حَدٌّ فَيُعْرِبُ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمٍ

ہو نہیں سکتی بیاں ہم سے فضیلت آپؐ کی
حد سے بھی آگے بہت آگے ہے رفعت آپؐ کی

اظہار تشکر

الحمد للہ! تمام حمد وثناء اللہ رب العالمین کے لیے جس نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اتنی صلاحیت دی اور موقع عطا کیا کہ جس کی بدولت یہ علمی اور تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس سعی میں میرے استاد محترم، مربی ومخدوم، میرے مقالے کے نگران پروفیسر ڈاکٹر حسام الدین منصوری ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی پدرانہ شفقت میرے علمی سفر کو جاری رکھنے کا باعث بنی ہے۔ آج کے مادہ پرستانہ دور میں ان کی بے لوث محبت، ہمدردی، خلوص اور علم دوستی قابل ستائش ہے۔ اگر مجھے ان کی سرپرستی، قیمتی مشورے، خصوصی توجہ اور تحقیقی استعانت حاصل نہ ہوتی تو میں اس تحقیق کے کٹھن مراحل کو کبھی بھی طے نہ کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا کرے اور ان کو مزید عزت وسربلندی عطا کرے (آمین) (جزاك الله خيرا)

میں ڈاکٹر احسان الحق صاحب اور محترم جناب شعاع النبی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے مجھے مقالے کی تیاری کے لیے اہم معلومات وہدایات دیں۔

میں اپنے والدین کے مسلسل توجہ، ہدایات اور دعاؤں پر تہہ دل سے مشکور ہوں کہ ساری مشکلات ان کی دعاؤں سے بفضل تعالیٰ آسانی میں تبدیل ہوگئیں۔

میں بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ (B.A.S.R) کے تعاون کا بھی مشکور ہوں۔

میں نے اس مقالے کی تیاری میں متعدد کتب خانوں سے استفادہ کیا جن میں جامعہ کراچی کی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد لائبریری، علامہ اقبال لائبریری مری، پی اے ایف لائبریری، دعوۃ اکیڈمی لائبریری، مکتبہء سرور کے منتظمین کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ جناب اعجاز اور ثاقب صاحب کا خصوصی طور پر مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے مقالے کی تیاری میں کتب کی فراہمی کا بہترین انتظام کیا اور جمیل صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے کمپوزنگ کے مرحلے میں اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر قسم کی معاونت کی۔ آخر میں اپنی شریک حیات کے تعاون کا بھی مشکور ہوں جسکی بھرپور معاونت سے مقالے کی تصحیح کا کام مکمل ہوا۔

جزاهم الله خيراً كثيرا

حافظ سید محمد نسیم سرور

تلخیص مقالہ

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اشرف المخلوقات کے لیے کچھ اٹل قوانین مقرر فرمائے ہیں جس کو سنت الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ قوانین الٰہی بغیر کسی تبدیلی کے جاری اور نافذ ہیں۔ **فلن تجد لسنت الله تبديلا و لن تجد لسنت الله تحويلا o** (۳۵:۴۳)

قوانین الٰہی میں سے ایک اہم قانون اقوام و ملل کے عروج و زوال کا ہے۔ زندہ قوموں کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ماضی اور حال پر ناقدانہ نظر ڈالتی رہتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کو تنقید کا نشانہ بنانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور عموماً افراد اور قومیں خود تنقیدی سے احتراز کر کے دوسروں ہی کو ہدف تنقید بناتی ہیں لیکن کسی قوم کی ''ذہنی بالیدگی'' کا تقاضا یہ ہے کہ خود کو تنقید کا ہدف بناتے ہوئے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس شکست و ریخت میں خود اسکا اور اسکی قوم کا کتنا حصہ ہے۔

اس مقالے کو تحریر کرنے کی غرض و غایت یہی تھی کہ امت مسلمہ کے عروج و زوال کا سنت الٰہی کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور اسباب زوال کو تلاش کر کے اس کے تدارک اور نشاۃ ثانیہ کے لیے نشان راہ کا تعین کیا جاسکے۔

محسن انسانیتؐ نے امت مسلمہ کو وحی ربانی سے جوڑ کر خیر امت بنایا اور شریعت الٰہی کی وہ شمع تھما گئے جو امت مسلمہ کے لیے تا قیامت مشعل راہ ہے۔ اس کو امام بناتے ہوئے اسی کی روشنی میں سفر طے کرنا تھا مگر جب ہم نے اس کو پس پشت ڈال دیا تو تاریکی میں گھر گئے اسی حقیقت کے تحقیقی جائزے کے لیے میں نے جو ابواب و فصول باندھے ہیں وہ امت مسلمہ کے تعارف، عہد رسالت، خلافت راشدہ و فتوحات سے ہوتے ہوئے ملوکیت اور اس کے نتائج کا ذکر ہے۔ جس میں امت مسلمہ کے نشیب و فراز کی داستان کا مختصر عکس ہے۔

اس میں امت مسلمہ کے اہم مفکرین، مفسرین و مجتہدین کے خیالات و افکار کو ذکر کرتے ہوئے امت مسلمہ کے زوال کے محرکات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے کہ امت مسلمہ نے جامعیت یعنی ایمان و تقویٰ اور وسائل و تدابیر کے اعلیٰ امتزاج کو جب تک قائم رکھا وہ سر بلند رہی اور جب اس نے جامعیت سے کام نہیں لیا تو عروج کی منزلوں سے پستی کی طرف دھکیل دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب عالم اسلام پر مجرمانہ خوابیدگی طاری ہوئی اور وہ اپنے اصل مشن سے غافل ہو گئے تو انجام کار

مغرب نے زمام اقتدار چھین لی۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے علوم کی روشنی میں سائنسی میدان میں تہلکہ مچا دیا اور صنعتی میدان میں اپنی دھاک بٹھادی۔ لیکن مغرب اس امانت عظمیٰ کا حق ادا نہ کر سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے مادی، روحانی واخلاقی مفسدات نے انسانیت کو زخم خوردہ کر دیا ہے۔ جہاں پر انصاف وحق طاقت والوں کے لیے اور انسانی مسائل کے حل کے لیے دہرا معیار وطیرہ ٹھہرادیا گیا ہے۔ دراصل قوموں کی زندگی میں یہی وہ فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے جب سنت الٰہی کے مطابق دنیا کی قیادت نااہل لوگوں سے چھین کر کسی اور کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

تاریخی شواہد سے اس بات کا واضح اشارہ مل رہا ہے کہ عالم انسانیت کی قیادت وسربراہی پھر امت مسلمہ کے ہاتھوں میں آنے والی ہے کیونکہ امت مسلمہ کے پاس "شریعت اسلام" کا ایسا مرہم موجود ہے جو نہ صرف مغرب کے لگائے گئے زخموں کو مندمل کر سکتا ہے بلکہ عالم انسانیت کو امن وسکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آج کی دنیا اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

الحمد للہ! آج امت مسلمہ میں بیداری کی لہر پیدا ہو چکی ہے۔ احیائی تحریکوں نے سرچشمہ ہدایت سے تعلق کو جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ عبادات سے لے کر اقتصادی معاملات تک از سر نو تحقیق واصلاح کا کام جاری ہے اسلامی ممالک کی تعداد و وسائل بھی قابل قدر حد تک ہیں اور **واعدو الھم ما استطعتم** کے پیش نظر عسکری قوتوں سے بھی لیس ہیں۔ پس آج امت مسلمہ کے نشاۃ ثانیہ کے لیے ایسی عالمی قیادت کی ضرورت ہے جو مسلم امہ میں نصب العین کے تعین اور اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ کو ہموار کرتے ہوئے حج کو ملت اسلامیہ کی سالانہ عالمی کانفرنس کے طور پر استعمال کرے، جمود کی فضا کو توڑے اور امید کی فضا کو عام کرے اور مسلم امہ میں جانی و مالی تعاون کا وہ جذبہ پیدا کرے جو نبی مہربان ﷺ نے انصار ومہاجرین کے درمیان پیدا کیا تھا۔

بلاشبہ آج امت مسلمہ کے نوجوان نسل عصری ودینی علوم میں تحقیق کا عنصر بڑھ رہا ہے جو بالآخر عروج امت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور وہ وقت دور نہیں جب........ ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اور انشاء اللہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ

حافظ سید محمد نسیم سرور

امیدوار برائے پی ایچ ڈی

Abstract of the Thesis

Some firm sets of laws have been given to the crown of creation by Allah Almighty, and these laws are called Sunnat-e-Ilahi. These rules and laws, without any change, have been implemented ever since as clearly stated in the Holy Quran:

فلن تجد لسنت الله تبديلا و لن تجد لسنت الله تحويلا o (35:43)

One of these laws is the law of climax and downfall of nations.one of the basic features of a living nations is that they cast a critical look at past and the present.Indeed, it's quite easy to criticize others, and it is a common practice by the individuals and the nations that instead of criticising themselves they criticise others.While criticising oneself,the mental maturity of a nation should demand to know the amount of share that nation shares in its devastation and destruction.

The purpose of this thesis was to throw light on the Climax and Downfall of Ummat-e-Muslima in the perspective of Allah's Laws and to delve into the causes of this downfall so that the path for renaissance of the Muslim may be paved through these findings.

The Holy Prophet Muhammad (S.A.W) fastered and linked all the

Muslims to one another by the revelations of the God Almighty and handed over them such candle of Islamic Teachings which will keep on throwing light of guidance till Resurrection Day. We had to follow this light in our quest of right path, but, we ignored and turned our backs to it and fell into deep pit of ignorance. To make an analytical study of the causes of the down fall of the Muslims, I have divided my findings into different chapters encompassing Introduction of the Muslims, Prophetic age, Four Caliphs, Conquests of the Muslim and Sultanate and results, and this portrays a brief sketch of the story of nemises of the Muslims.

In this thesis I have analyzed the reason for the downfall of the Muslims in the light of great thinkers and Islamic scholars. It's a reality, until and unless the Ummat Muslima was united; practiced and maintained a balance in worldly matters and religious affairs, were successful. When they got segregated, were thrown in the gorge of humiliation.

This is a fact when Muslims underwent an ominous slumber and got strayed from their real mission, resultantly the West got hold of everything and dominated the scenario and came to power. But the west could not bear the burden of this great treasure.

In fact, the political, spiritual and moral annihilative effects of

European renaissance deeply hurt and injured the very soul of humanity. Now justice and right is only for the fittest and for the solution of human problems double standards have been evolved and formulated. In fact, this is the decisive turn in the lives of nations when the reign of world leadership is taken from incapable people and is given to those who deserve and this is what we call Sunnat-e-Ilahi

Historical evidences clearly suggest and indicate that the Muslims, once again, are going to rule the whole world because the Religion Islam not only has the ointment for the wounds afflicted by the Europe but it's such an antidote which can remove every malady clung to the humanity making it a paragon of serenity and tranquility, and today's world needs nothing more than this.

Alhamd-0-Lillah Today, we can see a visible surge of awakening within Ummat-e-Muslima, the reincarnation movement has, at long last, started to connect to the ultimate guidance. From rituals to economic matters, research and correction process has been initiated. The number of Islamic countries and their resources is increasing to a satisfaction extent, and they are well equipped with military equipment and arsenals. Thus for the renaissance of the Muslims, we need such leadership on world level which should set up a right direction and ultimate objectives for the Muslims and utilize the pilgrimage as annual Islamic Conference. Moreover, this new leadership should melt the ice on the glaciers of

pessimism and try to create an environment of unity, fraternity and sacrifice as The Holy Prophet Muhammad (SAW) created among Ansa'r and Muhajireen.

Undoubtely, the earnest to research in religious as well as contemporary disciplines is on the increase among Muslim youth that may be the first sign of the Climax of the Muslims to regain the lost status, and time is not far when darkness will have to give way to the dazzling light of Tauhid, Insha Allah.

ع　　ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی اور انشاءاللہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلاَّ بِاللّٰهِ

Hafiz Syed Muhammad Nasim Sarwer
Candidate for

Ph.D

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمة

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ
خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَo

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنہ نسیم سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

تمام حمد وثناء اسی ذات کو سزاوار ہیں جس نے اس کائنات کی تخلیق کی اور اسے مزین کیا۔ اسی خالق کائنات کا فضل ہے کہ انسان کو بہترین مخلوق کی حیثیت سے اچھی ساخت پر پیدا کیا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo (۱)

ترجمہ: "تحقیق ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔"

اور انسانوں کو پیدا کر کے یونہی آزاد و بے مقصد نہیں چھوڑ دیا بلکہ فرمایا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَo (۲)

ترجمہ: "اور ہم نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔"

اس سے بڑھ کر زمین پر خلیفہ کی حیثیت سے اعلان فرمایا اور

اس احسان عظیم کا بار اٹھانے اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کے لیے روز اول سے اس کا اہتمام بھی فرمادیا۔ لہٰذا دنیا میں پہلے بھیجے جانے والے انسان حضرت آدمؑ کو رہبر و پیغامبر کی حیثیت سے مبعوث کیا۔

کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرامؑ اس دنیا میں بھیجے گئے اور سب سے آخر میں محبوب رب ذوالجلال، سرور دو عالم، رحمۃ للعالمین ﷺ مبعوث کیے گئے جو نہ صرف آخری نبی کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے بلکہ دین اسلام کی تکمیل بھی آپ ﷺ پر کر دی گئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۝ (۳)

ترجمہ: "میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

لہٰذا قیامت تک کے لیے راہ ہدایت وحی الٰہی کی صورت میں دے دیا گیا۔

حضور ﷺ نے اپنی تعلیمات اور محنت شاقہ سے امت مسلمہ کو از سر نو شرک و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے اور مختلف قبائل میں بٹے لوگوں کو باہم شیر و شکر کر دیا اور اس وقت کی بڑی طاقتوں کے مد مقابل لا کھڑا کیا۔ فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ تیئس سال کے مختصر عرصے میں مسلم امہ کو نا قابل تسخیر بنا کر جب اس دنیا سے جانے لگے تو یہ فرمادیا کہ:

ترکت فیکم امرین لن تضلو اما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ نبیہ (۴)

ترجمہ: "میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم انہیں مضبوطی سے پکڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت"۔

امت مسلمہ کی قیادت کا سب سے اعلیٰ معیار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قائم کر گئے اور اس کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وحی الٰہی سے نہ صرف اپنے آپ کو منسلک رکھا بلکہ ساتھ ساتھ حضور ﷺ کی نصیحت و فرمودات کو اپنا مسلک بناتے ہوئے امت مسلمہ کی رہنمائی کرتے رہے اور آدھی دنیا سے زائد حصوں کو نور اسلام سے منور کر دیا۔

خلفائے راشدینؓ کے بعد مسلم امہ خلافت سے ملوکیت کی طرف مائل ہوئی مگر احکام و فیصلے سنت نبویؐ کی روشنی میں کی جاتی رہی اور اس طرح سے فتوحات کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ اسلامی تعلیمات کی پرچار بھی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پہلی صدی کے اختتام سے قبل انہوں نے مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک اپنی حکومت و مملکت کے حدود وسیع کر لیے اور ان ملکوں میں صرف سیاسی طاقت و قوت ہی حاصل نہیں کی بلکہ اسلام کی حقانی تعلیمات اور اسلامی تمدن و تہذیب کی ناقابلِ رو دل کشی نے ایسا رنگ جمایا کہ چند ملکوں کو چھوڑ کر تمام مفتوحہ ممالک خالص اسلامی بن گئے۔

پھر علوم وفنون میں، ایجادات واختراعات میں، تہذیب نفس اور نظام اخلاق کی ترتیب وتدوین میں انہوں نے اپنے ذہنی ودماغی عظمت وبرتری اور مافوق العادۃ عملی جدوجہد کا ایسا عمدہ ثبوت دیا کہ بڑے سے بڑا معاہدہ مؤرخ بھی ان کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کرسکتا (۵) مگر رفتہ رفتہ مسلمان وحی ربانی سے دور ہوتے گئے اور اپنی حیثیت وذمہ داری کو بھول گئے جوان کو سونپی گئی تھی۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (۶)

ترجمہ: "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالے گئے ہو۔ تم بھلائی کا حکم دیتے
اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

لہٰذا جب مسلمانوں نے وحی ربانی میں تدبر اور کائنات میں تفکر کو چھوڑ دیا اور دنیا کی زندگی کو اس طرح سے گزارنے لگے گویا دنیا کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہو۔ جبکہ نبی مہربان ﷺ نے فرمایا تھا:

الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر (۷)

ترجمہ: "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے (مثل) جنت ہے"

مسلمانوں نے اپنے اندر آفاق کو گم کرنے کے بجائے خود آفاق میں گم ہوگئے۔ اپنے علوم سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ نے اسے بطور مال غنیمت حاصل کرلیا اور اس کی روشنی میں اپنے آپ کو سائنسی اور مادی اعتبار سے مستحکم کرلیا اور امت مسلمہ ذہنی اسیر ہوگئی۔ اور ذہنی غلامی نے آہستہ آہستہ ہمارے جسم وروح میں پنجے گاڑنے شروع کردیئے۔ دشمن نے ملت اسلامیہ کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کردیا اور ہم یہ فرمان الٰہی بھی بھول گئے کہ یہ صرف "لتعارفوا" یعنی تعارف کے لیے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ پوری دنیا کے مسلمان پر آشوب دور سے گزر رہے ہیں۔ طاغوتی قوتوں نے مسلم امہ کو تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے ذریعے یرغمال بنایا ہوا ہے اور امت کے فکری ذہنوں کو نہ صرف منتشر کیا بلکہ سترہویں، اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپی طاغوتی قوتوں نے جب مسلمانوں کو سیاسی اور عسکری میدانوں میں شکست دیئے تو امت مسلمہ اسلامی ثقافت، تمدن اور نظر وفکر پر بھی اعتماد کھو بیٹھی۔

لیکن قدرت نے جو اس خاکستر میں کہیں چنگاری رہ گئی تھی اسے شعلہ بننے کا موقع فراہم کیا اور بیسیوں صدی میں شمع ہدایت کے پروانوں نے ایک بار پھر عالم انسانی کو منور کرنے کے لیے دعوت وعزیمت کا راستہ اختیار کیا اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں بیداری کی لہر دوڑ چکی ہے۔

تاریخی حقیقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس بیداری کی لہر کو رواں رکھنے کے لیے وہ اقدامات کیے جائیں جو امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ضروری ہیں۔ اسی تناظر میں، میں نے اپنے مقالے کا موضوع "امت مسلمہ کے زوال کے اسباب اور اسکی نشاۃ ثانیہ کے مدارج" منتخب کیا۔ اس مقالہ میں امت مسلمہ کی اپنی تاسیس کا بھی ذکر ہے اور عروج کی ابتداء کا بھی کیونکہ آج امت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بھی انہی خاص عناصر کی ترکیب ضروری ہے۔

میرا یہ مقالہ مقدمہ کے علاوہ چھ ابواب اور اختتامیہ (خلاصہ بحث) پر مشتمل ہے۔

باب اول، امت مسلمہ منزل بہ منزل، امت مسلمہ کا قرآن واحادیث کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔
ابتداء میں امت مسلمہ کے مقصدِ وجود اور رہبر اعظمؐ کے دور سے زوال اسپین وبغداد اور سقوط خلافت تک کے ذکر کو واضح کرنے کے لیے چار فصول قائم کیے ہیں۔

فصل اول : امت مسلمہ کا تعارف قرآن وسنت کی نظر میں

فصل دوم : امت مسلمہ کا ابتدائیہ

ان دو فصلوں میں امت مسلمہ کی تاسیس، قرآن وسنت میں ذکر، ابتدائی مراحل اور مقصدِ وجود کی وضاحت تحقیق کے ساتھ کیے گئے ہیں کہ امت مسلمہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نہ صرف **خیر امۃ** بلکہ:

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۸)

ترجمہ: "ہم نے تم کو امت وسط بنایا۔"

کے القابات سے نوازا گیا اور یہ دور جو دورِ نبوت تھا امت مسلمہ کے لیے سب سے بہترین دور تھا۔

فصل سوم : نبوت سے خلافت کی طرف

اس فصل میں خلافت راشدہ جو نبوت کے بعد شروع ہوئی تھی، تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کی تحقیق کی گئی ہے۔ جس میں خلفائے راشدین نے فرمان نبویؐ کے مطابق امت مسلمہ کی رہنمائی کرتے ہوئے عروج کی منزلوں کو طے کیا اور نہ صرف اسلام کا پرچار کیا بلکہ ان عناصر کی بیخ کنی بھی کرتے رہے جو اسلامی تشخص کو داغ دار کرنا یا مٹانا چاہتے تھے۔ خلافت راشدہ کے تیس سال دوسری قوموں کے سینکڑوں سالوں کی تاریخ پر بھاری ہیں۔

اس مختصر مدت میں ایک معمولی مملکت جو جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی دنیا کی سب سے بڑی اور طاقت ور ریاست بن گئی۔ عہد رسالتؐ میں جو انقلابی تبدیلی سرزمین عرب اور عربوں کی زندگی میں آئی تھی ویسی ہی تبدیلی خلافت راشدہ کے دور میں ایران، عراق، شام اور مصر میں اور ان ملکوں میں آباد قوموں میں آئی..... جس کے نقوش چودہ سو سال بعد آج بھی باقی ہیں۔(۹)

فصل چہارم : آغازِ ملوکیت (عروج وزوال کی مختصر داستان بنوامیہ سے سقوط خلافت عثمانیہ تک)

اس فصل میں امت مسلمہ کا خلافت سے ملوکیت کی طرف قدم بڑھانا اور اس کے نتائج کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس میں ملوکیت کے اثرات، فتوحات، نتائج اور ان حقائق کی تحقیق کی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اس نے مسلمانوں کو پستی کی طرف دھکیل دیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ہم نے اپنی پہلی غلطی سے سبق سیکھنے کے بجائے غلطی در غلطی کرتے گئے اور "رہ گئی رسم اذاں مگر روحِ بلالی نہ رہی" کے مصداق ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور ہماری حیثیت سمندر کے جھاگ کی سی ہو گئی لہٰذا رفتہ رفتہ امت مسلمہ، ملت کفر کی سازشوں کا شکار ہو کر برائے نام خلافت عثمانیہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔

باب دوم، امت مسلمہ کا عروج وزوال مفکرین ومجتہدین کی نظر میں کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اس باب میں تین فصلیں قائم کی گئی ہیں۔

فصل اول : مسلم مفکرین ومصلحین کی نظر میں

فصل دوم : مفسرین ومجتہدین کی نظر میں

فصل سوم : نومسلم مفکرین کی نظر میں

ان تینوں فصول میں مفکرین، مفسرین ومجتہدین کے افکار ونظریات کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ وہ اکابر امت ہیں جنہوں نے نہ صرف امت مسلمہ کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اسے حل کرنے کے لیے سرگرداں بھی رہے اور ان میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو آج بھی متحرک ہیں۔ ان مفکرین میں نومسلم مصلحین بھی شامل کیے گئے ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے مذہب باطل کو چھوڑا بلکہ پکے مسلمان کی حیثیت سے مسلم امہ کا درد اپنے سینوں سے لگائے اصلاح کے لیے کوشاں رہے جن میں محمد مارمیڈیوک پکتھال، علامہ اسد، مولانا عبیداللہ سندھی ومریم جمیلہ وغیرہ شامل ہیں۔

باب سوم، امت مسلمہ کے زوال کے محرکات کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں مذہبی، تہذیبی، علمی، اخلاقی، شعوری وسیاسی تنزلی کو مدنظر رکھتے ہوئے دس فصلیں قائم کی گئی ہیں۔

فصل اوّل	:	شریعت الٰہی سے دوری
فصل دوم	:	فرقہ بندی
فصل سوم	:	عیش کوشی و بے جا اسراف
فصل چہارم	:	فریضہ اقامت دین سے غفلت
فصل پنجم	:	عربی زبان کی مرکزیت و وحدت سے دوری
فصل ششم	:	اخلاقی بگاڑ
فصل ہفتم	:	نصب العین سے دوری
فصل ہشتم	:	تقلید و جمود
فصل نہم	:	حب الدنیا و کراہیت الموت
فصل دہم	:	حکمرانوں و علماء کی کمزوری

دراصل امت مسلمہ کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھی گئی تھی اور یہی اس امت کی اصل ہے۔وحی ربانی سے دوری نے ہی مسلمانوں کو اپنے اصل مقاصد سے دور کیا پھر رفتہ رفتہ غیر اسلامی تہذیب نے مسلمانوں کی نظر کو اپنی چمک سے خیرہ کر دیا اور مسلمان اس دام فریب میں پھنستے چلے گئے۔مسلم امہ کی ہوا اس وقت اکھڑ کر رہ گی جب مسلمانوں نے قرآن کا یہ حکم وجعلنٰكم شعوبا و قبائل لتعارفوا ۚ(۱۰) کو بھلا کر فرقہ بندی کا شکار ہو گئے۔اسی طرح وہ فریضہ اقامت دین سے بھی بیگانہ ہو کر عیش کوشی اور دنیاوی جاہ وجلال کو اپنی عزت وتوقیر سمجھ کر اس میں مسابقت کرنے لگے۔

اسی طرح جب کوئی قوم سوچنا، تحقیق کرنا اور نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ دیتی ہے تو وہ جمود میں مبتلا ہو کر بالآخر انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے۔ایک وقت تھا کہ علمی و تحقیقی کام کا سہرا مسلمانوں کے سر تھا مگر جب تقلید و جمود ہمارے قلب و ذہن میں گھر کر گئے تو مسلمان نہ صرف دینی علوم سے دور ہو گئے بلکہ عصری علوم میں بھی سب سے پیچھے رہ گئے۔

اس کے علاوہ اخلاقی بگاڑ نے بھی مسلمانوں کو پست کیا اور مسلمان وہ قوم بن گئی جو کوئی نصب العین نہ رکھتی تھی۔ امت مسلمہ کے زوال کا اہم نکتہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے دنیا کو آخرت کی کھیتی کے بجائے عشرت گاہ بنالیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مالی اور جانی جہاد سے پہلوتہی کرنے لگے اور پھر علماءِ سوء نے مسلمانوں کے اندر شعور کی بیداری کے بجائے مناظروں و مباحثوں کو پروان چڑھایا اور حکمرانوں کی یہ حالت تھی کہ عیش وعشرت اور اسراف بے جا سے ان کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ مامون الرشید کی شادی میں صرف شب عروسی کی روشنی کے لیے چالیس من موم بتیاں سونے کی لگن میں روشن کی گئی تھیں۔ (۱۱)

مسعودی نے بنوامیہ کے ایک فرد کی زبانی زوال کے اسباب اپنی مشہور تصنیف "مروج الذہب" میں نقل کیے ہیں:

"ہم عیش وعشرت میں ایسے منہمک ہوگئے کے اپنے فرائض حکومت کو بالکل بھول بیٹھے۔ ہم نے رعایا پر ظلم کرنا شروع کیا .... ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہ ملک ورعایا کے حالات سے ہماری بے خبری ہوئی۔ (۱۲)

باب چہارم، یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے اثرات کے عنوان سے رقم کیے گئے اس باب میں تین فصلیں ہیں۔

فصل اول : احیاءِ علم و مادی ترقی

یورپ میں علم کے احیاء کا جوشوق بارہویں صدی میں اجاگر ہوا اس نے مادی ترقیوں کا دروازہ کھول دیا۔ یہی ترقیاں یورپی نشاۃ ثانیہ سے موسوم ہوتی ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء (Renaissance) کا پورا عمل اسلام ہی کے زیر اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم وفنون سے روشناس کرایا۔

فصل دوم : یورپی نشأۃ ثانیہ ایجادات وفتوحات

لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری کی لہر دوڑی انہوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر ایجادات کی دنیا میں اپنا لوہا منوانا شروع کیا اور اسی ایجادات پر مادی طاقت حاصل کی اور رفتہ رفتہ عالم انسانی اور بالخصوص عالم اسلام پر قابض ہونا شروع ہوگئے۔

فصل سوم : یورپی نشاۃ ثانیہ کے فکری و مادی مفسدات:

یورپی نشاۃ ثانیہ بجائے خود ایک قابل ذکر انقلاب تھا جس نے یورپ پر علمی و مادی دونوں قسم کی ترقیوں کے دروازے کھول دیئے مگر بنی نوع انسان، یورپ کے فکری و مادی مفسدات ومظالم سے نہ بچ سکی۔ عالم انسانیت کو مادیت کے حصول کے لئے نہ صرف غلامی کے شکنجے میں جکڑا گیا بلکہ اتنے زخم لگائے گئے کہ یہ تاریخ کے ایک سیاہ باب کے طور پر ہمیشہ یادرہے گا۔

باب پنجم، بیداریٔ اُمت کا آغاز کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں تین فصلیں ہیں۔

فصل اول : مساعی اصلاح اور تحاریک اسلامیہ

فصل دوم : عالم اسلام اور اس کے وسائل

فصل سوم : مساعی تعمیر واستحکام امت

یہ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ کے عروج کا کوئی دور بھی ایسا نہ رہا جو مصلحین کے اصلاحی وتجدیدی کارنامے سے خالی رہا ہو لیکن جب اٹھارہویں صدی میں مسلم امہ کے سیاسی اقتدار کی عمارت زمیں بوس ہوئی اور غیر اسلامی قوتوں نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا تو تمام کمزوریاں نمایاں ہوگئیں۔زوال امت کے پہلو پر غور وفکر کے نتیجے میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں اور احیاء دین کا قابل فخر کام امت میں بیداری کی لہر دوڑا گیا جن میں شاہ ولی اللہ کی تحریک اور تحریک جہاد، تحریک اصلاح (وہابی تحریک) سنوسی تحریک، مہدوی تحریک، الاخوان المسلمون وتحریک اسلامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح مسلم ممالک کے درمیان باہمی تعلقات اور اقتصادی ترقی کے لیے بھی نمایاں کام ہوئے جو امت مسلمہ کی ترقی میں معاون ومددگار ہیں۔الحمدللہ عالم اسلام اس وقت نہ صرف عددی اعتبار سے مستحکم ہیں بلکہ مادی وجدید وسائل کے اعتبار سے بھی بہتر حالت میں ہے۔اسی طرح امت کی تعمیر واستحکام کے لیے مختلف اداروں کا قیام اور کوششیں قابل ستائش ہیں۔

باب ششم، امت مسلمہ کے نشاۃ ثانیہ کے مدارج کے نام سے ہے۔اس باب میں دس فصلیں قیادت کی ضرورت، مذہبی، شعوری، تحقیقی، سیاسی ومعاشی اصلاح کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہیں۔

فصل اوّل : عالم اسلام کو ضرورت قیادت

فصل دوم : وسائل کے استعمال اور مسائل کے حل کے لیے مسلم اقوام متحدہ کا قیام

فصل سوم : خیر امت کے تقاضے کی ادائیگی

فصل چہارم : اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

فصل پنجم : مذہبی قیادت کا اتحاد اور احیائے خلافت کا اہتمام

امت مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ آج وہ قیادت سے خالی ہے۔ اگر امت کو قیادت مل جائے تو با آسانی تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے ستاون آزاد اسلامی بلاکس کو قدرت کی طرف سے حاصل وسائل کا صحیح ادراک ہو اور امت کی فلاح کے لیے استعمال ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مسلم اقوام متحدہ بنائیں کیونکہ مغرب کا مسلمانوں کے معاملات سے عدم دلچسپی اور حقیقت میں اسلام دشمنی کا اصل چہرہ تو سب پر عیاں ہو چکا ہے۔

مسلم امہ میں مذہبی و دینی جذبہ کا فروغ اور نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنے کا عمل تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم امت کے اندر نصب العین کا صحیح ادراک پیدا نہیں کریں گے ہماری جدو جہد بے مقصد رہے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ امت کے نوجوانوں کو بے راہ روی سے بچا کر علوم وفنون سے منسلک کیا جائے۔ اسی طرح اتحاد بین المسلمین کا فروغ اور مساجد کو سطحی مجالس اور بالخصوص حج کو ملت اسلامیہ کی سالانہ عالمی کانفرنس اور مرکز کے طور پر استعمال کیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ عروج ملت اسلامیہ کے دور میں تمام دنیا یہ جانتی تھی اور مانتی تھی کہ اگر تہذیب وتمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے، علم وفکر ہے تو وہ مسلمانوں کا ہے مگر آج مسلمانوں کے دل میں یہ بات اتر گئی ہے کہ کوئی تہذیب وتمدن ہے تو اہلِ مغرب کا ہے اور علم وفن جو کچھ ہے وہ مغرب کا ہے اور یہ سب کچھ جمود اور شعوری ہم آہنگی نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا دینی وعصری علوم میں تحقیق کی راہ کو سہل بنانا ضروری ہے آج مسلم امہ تحقیقی میدان میں سب سے پیچھے ہے اگر ہم دوبارہ تحقیقی وتدوین کا کام مشن کے طور پر کرنے لگیں تو یقیناً اہل مغرب کو شکست دے سکتے ہیں اور مسلم امہ کے ہر طبقے کو خواب غفلت سے جگا سکتے ہیں۔ لسانی روابط کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید ذرائع ووسائل کے ذریعے اسلام اور اسکے حقائق وثمرات کو عام کرتے ہوئے یقین کامل کے ساتھ سفر جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ " **انتم الاعلون** " کا وعدہ آج بھی اسی طرح ہے جیسا کہ پہلے تھا۔

تحقیق کا طریقہء کار:

تحقیق کے لیے انگریزی میں لفظ Research استعمال ہوتا ہے لیکن جب انسان کسی ایک مخصوص نکتہ یا حصہء علم کو حاصل کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ مسلسل کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی یہ کوشش اپنے منطقی اختتام تک پہنچے۔ تو اس کی اس کاوش کو تحقیق (Research) کا عمل کہتے ہیں۔ اور اس عمل کے مقرر کردہ طریقہ کو طریقہء تحقیق (Research Methodology) کہتے ہیں۔ (۱۳)

اسلامی تحقیق کی دو قسمیں ہیں یا تو یہ میکانکی ہوتی ہے یا اصلی۔ مثلاً مقدس کتابوں یا مقدس کتابوں پر لکھی کتابوں میں سے کسی کتاب کی کوئی لغات یا کوئی اشاریہ تیار کرنا یا ان کو نئی ترتیب دینا.... اس غرض سے کہ اس کے حوالے آسانی سے میسر آ جائیں، میکانکی اسلامی تحقیق ہے۔ جبکہ مقدس کتابوں کے مضمون کی علمی تشریح یا تفسیر یا توسیع کرنا اصلی اسلامی تحقیق ہے۔ (۱۴)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تحقیق (Research) کی کئی اقسام ہیں لیکن ان میں سے مشہور اقسام یہ ہیں:

۱۔ فلسفیانہ طریقہء تحقیق — 1. Philosophical Research

۲۔ سائنسی طریقہء تحقیق — 2. Scientific Research

۳۔ تاریخی طریقہء تحقیق — 3. Historical Research

۴۔ شماریاتی طریقہ تحقیق — 4. Stistical Research (۱۵)

میرا یہ مقالہ "امت مسلمہ کے زوال کے اسباب اور اسکی نشاۃ ثانیہ کے مدارج" تاریخی تحقیق سے متعلق ہے۔ ہر قسم کی تحقیق کے لیے الگ الگ طریقہء کار ہوا کرتا ہے۔ معاشرتی تحقیق کے طریقوں کے مندرجہ ذیل اصول ہوتے ہیں۔

۱۔ مسئلہ تحقیق

۲۔ ماخذ اور حوالہ جات کا جمع کرنا۔

۳۔ حوالوں کی جانچ پڑتال۔

۴۔ واقعات اور حالات کی وضاحت۔

۵۔ حقائق کی وضاحت اور نتائج کا بیان۔ (۱۶)

میں نے انہی ترتیب وار مرحلوں سے گزرتے ہوئے یہ تحقیقی مقالہ مرتب کیا ہے۔اس تحقیق کے دوران جن باتوں کی ضرورت تھی یا جن وسائل کی ضرورت تھی ان تمام وسائل کو جمع کیا اور تحقیقی طریقہ ءکار کے مطابق ترتیب دیا۔

ماخذ اور حوالے جمع کرنے کے سلسلے میں تحقیقی طریقہ ءکار کے اُصولوں کے مطابق ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ماخذ اور حوالے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ بنیادی ماخذ — 1. Primary sources

۲۔ ثانوی ماخذ — 2. Secondary sources

۱۔ بنیادی ماخذ سے مراد دستاویزی کتاب، رسالہ یا دوسرا مواد جن میں مقالے کے موضوع کے متعلق ابتدائی معلومات ہوتی ہیں۔

۲۔ ثانوی ماخذ سے مراد مخطوطات، کتاب یا اسی دور کے انسانوں کے آنکھوں دیکھے احوال۔

میں نے اس مقالے میں دونوں قسم کے ماخذ کو استعمال کیا ہے۔جیسا کہ بیسویں صدی تک مفکرین اور علماء کرام کے متعلق لکھے گئے تذکرے کے حوالے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری جانب ربانی روایتیں اور مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ ثانوی ماخذ میں قولی روایتوں کو بھی ایک قسم کی حیثیت حاصل ہے۔ (۱۷)

ثانوی تحقیق کے دوران مصنفین کی تصنیفات جاننے کے لئے کتب خانوں اور لائبریریوں کے مخطوطات کی فہرستوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ (۱۸)

اس مقالے کو ترتیب دیتے ہوئے تصنیفات کے سلسلے میں مذکورہ اُصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے مقالے کی تحقیق کے دوران حوالہ جات کی باقاعدہ جانچ پڑتال کی ہے۔

حواشی وحوالہ جات (مقدمہ)

(۱) القرآن (۹۵:۴)

(۲) ایضاً (۵۱:۵۶)

(۳) ایضاً (۵:۳)

(۴) مالک الامام: "مؤطا امام مالک" مکتبہ رحمانیہ لاہور، باب النھی عن القول فی القدر

(۵) اکبرآبادی، سعید احمد: "مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۴۷ء، ص:۸

(۶) القرآن (۳:۱۱۰)

(۷) القشیری، مسلم بن حجاج: "صحیح مسلم" قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۵۶ء، ج:۲، باب الزھد

(۸) القرآن (۲:۱۴۳)

(۹) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص:۱۲۷

(۱۰) القرآن (۴۹:۱۳)

(۱۱) صباح الدین، عبدالرحمٰن، سید: "مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص:۳۳

(۱۲) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۵۰۶

(۱۳) احسان الرحمٰن خان، ڈاکٹر: "معاشرتی علوم میں طریقہء تحقیق" البلاغ فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۱۱

(۱۴) محمد رفیع الدین (مرحوم)، ڈاکٹر: "اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار"، البلاغ فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۳
(۱۵) غلام حسین، ڈاکٹر: "تحقیق کا فن"، پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی، جامشورو، ۱۹۸۳ء، ص: ۴
(۱۶) رضوی جمیل احمد، سید: "لائبریری سائنس اور اصول تحقیق"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ج: ۲، ص: ۲۲
(۱۷) در شہوار، سیدہ ڈاکٹر: "تحقیق کا طریقہ ءکار"، شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص: ۹۲
(۱۸) انیس خورشید، ڈاکٹر: "تحقیقی مقالہ لکھنے کے دستاویزی ثبوت"، جامعہ کراچی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۴۳

باب اوّل

اُمّتِ مُسلمہ منزل بہ منزل

فصل اوّل : امت مسلمہ کا تعارف قرآن وسنت کی نظر میں

فصل دوم : امت مسلمہ کا ابتدائیہ

فصل سوم : نبوت سے خلافت کی طرف

فصل چہارم : آغازِ ملوکیت (عروج وزوال کی مختصر داستان

بنوامیہ سے سقوط خلافت عثمانیہ تک)

باب اوّل

اُمّتِ مُسلمہ منزل بہ منزل

فصل اول

امت مسلمہ کا تعارف قران وسنت کی نظر میں :

اہل عرب نے دعوت توحید کو بھلا کر تین سو ساٹھ کو اس جگہ سجا دیا تھا جو جگہ حضرت ابراہیمؑ نے صرف اپنے ایک رب کی عبادت کے لیے تعمیر کی تھی۔ اور جس کا اعلان بھی اپنے خالق کے حکم سے کر دیا تھا:

وَاِذْ بَوَّانَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ٥ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ٥ (۱)

ترجمہ: "اور جب ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ایک معبد قرار دیا اور حکم دیا کہ ہماری جبروت میں اور کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا اور اس گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ پاک ومقدس رکھنا' نیز ہم نے حکم دیا کہ دنیا میں حج کی پکار بلند کرو، لوگ تمہاری طرف دوڑتے چلے آئیں گے۔ ان میں پیادہ پا بھی ہونگے اور وہ بھی جنہوں نے مختلف قسم کی سواریوں پر دور دراز مقامات سے قطع مسافت کی ہوگی۔"

مگر اسی صدائے حق کی گونج ابھی باقی تھی۔ خانہ کعبہ کو بیت اللہ سمجھ کر طواف کیا جاتا تھا۔ مگر بہت ساری خرافات و بدعات کے ساتھ ایک خدا کے ساتھ تین سو ساٹھ کو بھی شریک کر دیا گیا تھا۔

اگر چہ حضرت ابراہیمؑ نے بت پرستی کی فضا میں آنکھ کھولی تھی' مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت سے مالا مال کیا۔ اسی نعمت عظمٰی نے ان کے اندر وہ فہم وفراست پیدا کر دی تھی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ایسی استقامت و پامردی کہ تن تنہا پوری قوم سے ٹکرا گئے۔ داعی الی اللہ کی حیثیت سے وہ کام کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرد واحد کو امت کا لقب عطا کیا۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَکُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَo (۲)

ترجمہ: "بلاشبہ ابراہیمؑ (اپنی ذات میں) ایک امت تھے۔ اللہ کے فرمانبردار اور یکسو رہنے والے تھے۔
اور وہ ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔"

اسی یکسوئی یعنی صرف اللہ ہی کے ہو کر رہنا اور باقی تمام معبودانِ باطلہ سے اعلان برأت کا اظہار کرنے پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً (۳)

ترجمہ: "بے شک میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔"

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری یعنی اسلام کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے۔ شرقِ اُردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو اور اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مامور کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ اُن کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے۔ اس لیے وہ اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد جن میں حضرات یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، سلیمانؑ، یحیٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا۔ اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے اُن کا دین قبول کیا۔ انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی اُن کے اندر گم کر دی یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً اِن کے متبع رہے۔ اِسی شاخ میں جب پستی وتنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔ (۴) حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی دعا مانگی اور پھر اپنی اولاد کے متعلق عرض کیا:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَo (۵)

ترجمہ: "اور ہماری اولاد میں سے ایک فرمانبردار اُمت پیدا فرما۔"

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے۔کہ جس وقت یہ دعا کی گئی،اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی موجود تھے۔لہذا امت مسلمہ کی دعا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حق میں جاتی ہے۔کیونکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام تو اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔اسی مقام پر یہود و نصاریٰ دھوکا کھاتے ہیں۔اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ دعا حضرت اسحٰق علیہ السلام کے حق میں ہے۔اور امتِ مسلمہ بھی آپ ہی کی قوم ہے۔حالانکہ تاریخی شواہد سے واضح ہو رہا ہے کہ امت مسلمہ کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہے۔جو اس وقت موجود تھے اور دعا میں شامل تھے۔چنانچہ یہ قبولیتِ دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے مبعوث فرمایا۔(۶)

بہترین امت :

ارشاد ہوتا ہے۔اے محمد الرسول اللہ ﷺ کی امت کنتم خیر امۃ تم بہترین امت ہو۔کنتم ماضی بعید کا صیغہ ہے امام بیضاویؒ اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں۔کہ اس بات کا تذکرہ ماضی میں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور لوح محفوظ میں بھی یہ بات موجود ہے۔کہ اللہ کے ہاں تم سب سے بہتر امت ہو اس کا فیصلہ روز ازل سے ہو چکا ہے۔صحیح حدیث میں آتا ہے نحن الاخرون السابقون یوم القیامۃ ہم دنیا میں تو سب سے آخر میں آنے والے ہیں مگر جنت میں سب سے پہلے جانے والے ہوں گے۔

ایک دوسری حدیث میں یوں بھی آتا ہے کہ جب تک حضور نبی کریم ﷺ جنت میں داخل نہیں ہوں گے کوئی دوسرا نبی داخل نہیں ہوگا۔اسی طرح جب تک حضور خاتم المرسلین کی امت بہشت میں نہیں جائے گی کوئی دوسری امت وہاں نہیں جائے گی۔البتہ کتاب پہلی امتوں کو پہلے دی گئی اور ہم بعد میں آئے ہیں۔لیکن ہم سبقت کرنے والے اور آگے بڑھنے والے ہیں قیامت کے دن سورہ البقرۃ میں بھی آچکا ہے وکذالک جعلنکم امۃ وسطا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے امت محمدیہ! ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے وسط کے معنی درمیان ہوتا ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو اسی لیے حضور ﷺ کا ارشاد ہے خیر الامور اوسطھا "بہترین کام وہ ہیں جو درمیانے ہوں۔" غرضیکہ حضور ﷺ کی امت،امت وسط ہونے کے لحاظ سے بھی باقی اُمتوں سے افضل ہے۔(۷)

ابن عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا:

"دوسری امتوں کی نسبت جو گزر چکی ہیں تمہاری مدتِ عمر اس زمانہ کے مقدار ہے جو عصر سے لیکر غروب آفتاب تک ہوتا ہے تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال اس طرح پر ہے ایک آدمی نے کچھ لوگوں کو کام پر لگایا اور کہا کہ آدھے دن تک کون میرا کام کرتا ہے میں اس کو ایک قیراط دوں گا یہود نے ایک ایک قیراط پر نصف دن کام کیا پھر اس نے کہا نصف دن سے عصر کی نماز تک کون ایک ایک قیراط پر کام کرتا ہے عیسائیوں نے نصف دن سے لے کر عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا پھر اس نے کہا عصر کی نماز سے لیکر مغرب تک کون ہے جو کام کرتا ہے اُس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ تم نماز عصر سے لے کر مغرب تک عمل کرر ہے ہو آگاہ رہو تمہارے لیے دوگنا ثواب ہے۔ یہود و نصاریٰ اس بات پر ناراض ہو گئے کہنے لگے ہم نے کام زیادہ کیا ہے اور ہم کو اُجرت کم دی گئی ہے اللہ نے فرمایا میں نے تمہارے حق سے کچھ کم کیا ہے وہ کہنے لگے نہیں اللہ نے فرمایا یہ میرا فضل ہے جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں۔"(۸)

مؤلف مشکوٰۃ نے اس امت کی فضیلت واہمیت کی بناء پر ایک باب ثواب ھذہ الامۃ کے عنوان سے باندھ کر اس امت کی اہمیت کو احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں اجاگر کیا ہے۔

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم مثل امتى مثل المطر لا يدرٰى اولهٗ خيرام أخرهٗ.

ترجمہ: "انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے۔ یہ نہیں معلوم کیا جا سکتا کہ اس کا اوّل بہتر ہے یا آخر۔"

و عن عبد الرحمن بن العلآء الحضر مى قال حدثنى من سمع النبى صلى الله عليه و سلم يقول انه سيكون فى أخر هذه الامة قوم لهم مثل اجر اولهم يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و يقاتلون اهل الفتن

ترجمہ: "عبدالرحمٰن بن علاٗ حضرمی سے روایت ہے کہ مجھ کو نبی ﷺ کے ایک صحابی نے حدیث بیان کی آپ نے فرمایا اس امت کے آخر میں ایک جماعت ہو گی اسکو پہلے لوگوں کا سا اجر و ثواب ہو گا نیکی کا وہ حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے اور خلاف شرع کام کرنے والوں سے لڑائی کریں گے۔"

و عن ابن عباس ان رسول الله صلی الله علیه و سلم قال ان الله تجاوز عن امتی الخطا و النسیان و ما استکرھوا علیہ۔

ترجمہ: "ابن عباس سے روایت ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا اور نسیان اور جس کام میں ان پر زبردستی کی جائے معاف کر دیا ہے۔"

و عن بھزبن حکیم عن ابیه عن جده انه سمع رسول الله صلی الله علیه و سلم یقول فی قوله تعالی کنتم خیر امة اخرجت للناس قال انتم تتمون سبعین امة انتم خیرھا و اکرمھا علی الله تعالی

ترجمہ: "بہزبن حکیم اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سنا آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق فرمایا ۔تم ستر امتوں کو پورا کرتے ہو تم اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن سب میں سے بہتر اور گرامی قدر ہو۔" (۹)

اللہ رب العزت نے کنتم خیر امة کہہ کر حقیقت میں دوسری تمام امتوں سے ممتاز کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ امت محمدیہ تمام امتوں پر بہتر ہے بخاری شریف میں ہے حضرت ابو ہریرہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں تم اوروں کے حق میں سب سے بہتر ہو تم لوگوں کی گردنیں پکڑ پکڑ کر اسلام کی طرف جھکاتے ہو۔اور مفسرین بھی یہی فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر ہو اور سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچانیوالے ہو.... رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تم نے اگلی امتوں کی تعداد ستر تک پہنچا دی ہے اللہ کے نزدیک تم ان سب سے بہتر اور زیادہ بزرگ ہو۔یہ مشہور حدیث ہے امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اس امت کی افضلیت کی ایک بڑی دلیل اس امت کے نبی کی افضلیت ہے۔آپ تمام مخلوق کے سردار تمام رسولوں سے زیادہ اکرام وعزت والے ہیں۔آپ کی شرع اتنی کامل اور اتنی پوری ہے۔کہ ایسی شریعت کسی نبی کو نہیں تو ظاہر بات ہے کہ ان فضائل کو سمیٹنے والی امت بھی سب سے اعلیٰ وافضل ہے۔اس شریعت کا تھوڑا سا عمل بھی اور امتوں کے زیادہ عمل سے بہتر وافضل ہے۔ (۱۰)

لما دع الله داعینا لطاعته   یا کرم الرسل کنا اکرم الامم (۱۱)

ترجمہ: "جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو جو ہمیں اللہ کی اطاعت کی طرف بلاتے ہیں اکرم الرسل کہہ کر پکارا تو ہم افضل امت قرار دیئے گئے۔"

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلا کر اپنی یاد اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے اور امت محمدیہ ﷺ کو جب اسی کام کے لیے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ "یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" اس میں امت محمدیہ ﷺ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلاواسطہ ہے، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں بخلاف دوسری امتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعے محسن کو پہچانتے ہیں۔ (۱۲)

فصل دوم

امت مسلمہ کا ابتدائیہ

اُمت کی تشکیل نو

ایک نئی امت کی تشکیل کے لیے رُخ متعین کر دیا گیا اور کعبہ کی تعمیر کا کام اپنے خلیل کے ہاتھوں کروانا پسند کیا اور جب تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا کی:

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (۱۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب ان کے درمیان انہی لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیج کہ وہ ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔"

چنانچہ خلیلؑ اللہ کی یہ دعا حبیبؐ اللہ کی صورت میں ٹھیک اس دعا کے مثل پوری ہوئی۔

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق (۱۴)

ترجمہ: "وہی (اللہ) ہے جس نے ایک غیر متمدن قوم میں سے اپنا ایک رسول پیدا کیا جو انکو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

کعبہ کے گرد طواف کرنے والے اہل عرب نے دعوتِ ابراہیمؑ کو شرک و بدعات سے مزین کر کے اصلیت کو چھپا دیا مگر اولادِ ابراہیمؑ ہونے پر فخر بھی محسوس کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ گو بظاہر ایک فردِ واحد تھے۔ مگر انکی فعالیت روحانیہ والٰہیہ کے اندر ایک پوری قوم قانت و مسلم پوشیدہ تھی۔ اب اس امت مسلمہ کے ظہور کا وقت آ گیا اور رسول موعود غارِ حرا کے تاریک گوشوں سے نکل کر منظرِ عام پر نمودار ہوا۔ تا کہ اس نے خود اس اندھیرے میں جو روشنی دیکھی ہے وہ روشنی تمام دنیا کو بھی دکھلا دے۔ (۱۵)

ارشادالٰہی ہے:

يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ (۱۶)

ترجمہ: "وہ پیغمبران کواندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔"

وہ عرب معاشرے کے بحران پر کافی لمبی مدت سے پریشان و متفکر تھے حالیہ عشروں میں ان کا قبیلہ قریش اردگرد واقع ملکوں میں تجارت کے ذریعے امیر ہو چکا تھا۔ مکہ ایک کامیاب ہوتا اور پنپتا ہوا ایک تجارتی شہر بن چکا تھا تاہم دولت کے لیے جاری جارحانہ افراتفری میں کچھ پرانی قبائلی اقدار کھو چکی تھیں۔ اب قریش بدوی ضابطے کے تحت قبیلے کے کمزور ارکان کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے قبیلے کے غریب خاندانوں کی قیمت پر دولت بنانے کی طرف مائل تھے۔ مکہ اور پورے جزیرہ نما میں روحانی اضطراب بھی موجود تھا۔ پورے عرب میں قتل اور جوابی قتل کے ہلاکت انگیز چکر میں ایک قبیلہ دوسرے کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھا۔ اس صورتحال سے عرب کے بہت سے اہل فکر لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے عرب کوئی کھوئی ہوئی نسل ہوں۔ مہذب دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نکالے ہوئے ہوں اور جنہیں خود خدا نے ہی دھتکار دیا ہوا ہو۔ تاہم یہ احساس ۱۷ رمضان کی شب اس وقت تبدیل ہو گیا جب حضرت محمد ﷺ نے اپنے آپ کو ایک محیر العقول حضوری کی وجہ سے بہت زیادہ قوت سے معمور پایا جو اس وقت تک ان پر حاوی رہی جب تک انہوں نے ایک نئے عربی صحیفے کا پہلا لفظ اپنے مبارک ہونٹوں پر رواں نہیں پایا۔ (۱۷)

اس ابتدائے وحی کے الفاظ تھے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۝ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝ (۱۸)

ترجمہ: "(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔"

اس پہلی وحی میں اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ ابتداء اپنے پروردگار کے نام مبارک سے کرو اور پڑھو جو اس خالق کائنات کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ اور اپنی حقیقت واہمیت سے غافل نہ ہونا بلکہ علم (قرآن) کی روشنی سے اب دوبارہ اپنے اس اللہ رب العزت کی طرف یکسو ہو جاؤ جس کا آوازہ حضرت ابراہیمؑ بلند کر گئے تھے۔

دعوت الی اللہ:

اب امت مسلمہ کے از سر نو تعمیر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے داعی اعظم ؐ کو بہت ہی پیارے انداز میں سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات میں آپ ؐ کو اُٹھ کھڑے ہونے، مخلوق کو ڈرانے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرنیکا فرمان جاری ہونے سے ایکنئے مرحلہ کا آغاز ہوا۔ اور یہ اسلام کی طرف بغیر محاذ آرائی و اعلان کے دعوت تھی یعنی خفیہ طور پر تھی۔ آپ ؐ مسلسل تین سال تک خفیہ طور پر اسلام کو ہر اس شخص پر پیش کرتے رہے جس میں بھلائی محسوس کرتے۔ آپ ؐ پر بڑے بڑے لوگوں میں سے چند لوگ ہی ایمان لائے پہلے پہل ایمان لانے والے لوگوں میں آپ ؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت ابو بکر صدیقؓ، آپکے غلام حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت ابو عبیدہؓ عامر بن جراح، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ، حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت ارقمؓ بن ابی ارقم ودیگر شامل ہیں۔ دین جدید کے ظہور کے باوجود قریش نے اس پر تین سال تک کوئی دھیان نہ دیا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اس عرصہ میں ان کے معبودین کے درپے نہ ہوئے لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اعلانیہ دعوت کا اظہار کیا اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین اسلام کی جانب دعوت دینے کا آغاز کیا تو قریش نے سخت مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وانذر عشیرتک الاقربین "اور آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں۔" آپ ؐ نے سب سے پہلے بنو عبد المطلب کو دعوت دی تو سوائے حضرت علی بن ابی طالب کے کسی نے اسلام قبول نہ کیا جیسے کہ کسی نے سنا ہی نہیں لیکن آپ کے چچا ابولہب نے بری طرح رد کر دیا۔ (۱۹)

اس کے بعد کفار مکہ کا ظالمانہ رویہ کھل کر سامنے آنے لگا۔ اب ملت اسلامیہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کافروں سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں میں بالخصوص غلاموں اور لونڈیوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑا گیا مگر ان کا ایمان اتنا پکا تھا کہ انہوں نے یہ سب تکلیفیں اُٹھائیں مگر اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ امت مسلمہ میں شامل ہونے کے بعد اپنے مال و اسباب اور عزیز و اقارب کو تو چھوڑا جا سکتا ہے مگر اسلام کو نہیں۔

ہجرت حبشہ:

جب کفار نے مسلمانوں کو بے حد ستانہ شروع کیا۔ تو نبی ﷺ نے صحابہؓ کو اجازت دے دی کہ جو کوئی چاہے وہ اپنی جان و ایمان کے بچاؤ کے لیے حبش کو چلا جائے۔ اس اجازت کے بعد ایک چھوٹا سا قافلہ ۱۲ مرد اور ۴ عورتوں کا رات کی تاریکی میں نکلا اور حبش کو روانہ ہو گیا۔

اس مختصر قافلہ کے سردار حضرت عثمانؓ بن عفان تھے۔ سیدہ رقیہؓ (بنت النبی ﷺ) انکے ساتھ تھیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: لوطؑ اور ابراہیمؑ کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے۔ جنہوں نے راہِ خدا میں ہجرت کی ہے۔ قریش نے مسلمانوں کا حبش تک تعاقب کیا ان کے پیچھے اور بھی مسلمان (۸۳ مرد ۱۸ عورتیں) مکہ سے نکلے اور حبش کو روانہ ہوئے۔ ان میں نبی ﷺ کے چچیرے بھائی حضرت جعفر طیارؓ بھی تھے۔ قریش نے سمندر تک ان کا تعاقب کیا۔ مگر یہ کشتیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے۔ حبش کا بادشاہ عیسائی تھا۔ مکہ کے کافر بھی اس کے پاس تحفے تحائف لے کر گئے اور جا کر کہا کہ ان لوگوں کو جو ہمارے ملک سے بھاگ کر آئے ہیں ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمان دربار میں بلائے گئے۔ تب نبی ﷺ کے چچیرے بھائی حضرت جعفر طیارؓ نے دربار میں تقریر کی: اے بادشاہ! ہم جہالت میں مبتلا تھے، بتوں کو پوجتے تھے، نجاست میں آلودہ تھے، مردار کھاتے تھے، بیہودہ بکا کرتے تھے، ہم میں انسانیت اور سچی مہمانداری کا نشان نہ تھا۔ ہمسایہ کی رعایت نہ تھی، کوئی قاعدہ وقانون نہ تھا۔ ایسی حالت میں خدا نے ہم میں سے ایک بزرگ مبعوث کیا۔ جس کے حسب ونسب، سچائی، دیانتداری، تقویٰ، پاکیزگی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہم کو توحید کی دعوت دی اور سمجھایا کہ اس اکیلے خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ جانیں۔ اس نے ہم کو پتھروں کی پوجا سے روکا۔ اس نے فرمایا کہ ہم سچ بولا کریں، وعدہ پورا کیا کریں، رحم کریں، گناہوں سے دور رہیں، برائیوں سے بچیں، اس نے حکم دیا کہ ہم نماز پڑھا کریں، صدقہ دیا کریں اور روزے رکھا کریں، ہماری قوم ہم سے ان باتوں پر بگڑ بیٹھی ہے۔ قوم نے جہاں تک ہو سکا ہم کو ستایا کہ ہم "وحدہٗ لا شریک" کی عبادت کرنا چھوڑ دیں اور لکڑی اور پتھر کی مورتیوں کی پوجا کرنے لگ جائیں۔ ہم نے ان کے ہاتھوں بہت ظلم اور تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جب مجبور ہو گئے تب تیرے ملک میں پناہ لینے کے لیے آئے۔ بادشاہ نے یہ تقریر سن کر کہا: مجھے قرآن سناؤ جعفر طیارؓ نے اسے "سورۃ مریم" سنائی بادشاہ پر ایسی تاثیر ہوئی کہ وہ رونے لگ گیا اور اس نے کہا کہ "محمد ﷺ تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیحؑ نے دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ ملا۔" پھر بادشاہ نے مکہ کے کافروں کو دربار سے نکلوا دیا۔ (۲۰)

شعب ابی طالب میں محصوری:

نبوت کے ساتویں سال قریش مکہ کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ظلم وستم کے باوجود یہ قافلہ امت مسلمہ دب نہیں رہا بلکہ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اور حضرت حمزہؓ وعمرؓ بھی ایمان لا چکے ہیں۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیلئے ایک مجلس کا انعقاد کیا۔ جس میں یہ طے پایا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف مقاطعہ کیا جائے۔ جب کہ معاملہ یہ تھا کہ تمام بنو ہاشم اور بنو مطلب مسلمان نہیں تھے۔

انکا قصور یہ تھا کہ مشرکین کے مقابلہ میں آنحضور ﷺ کی حمایت کرتے تھے لہٰذا قریش مکہ نے یہ معاہدہ تحریر کیا۔ کوئی شخص نہ بنی ہاشم سے قرابت رکھے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا نہ ان سے ملے گا نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا۔ جب تک وہ پیغمبر اسلام کو قتل کے لیے حوالے نہ کر دیں۔ قریش میں چند رحم دل اشخاص نے یہ محسوس کیا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ انہوں نے خفیہ تدبیریں سوچنا شروع کیں۔ تا کہ مسلمانوں پر مظالم ختم کرائے جا سکیں۔ آخر کار ہشام بن عمرو جو بنو ہاشم کے ساتھ قرابت داری رکھتا تھا۔ اس نے معاہدہ ختم کرنے کی تدبیر اختیار کی۔ اس سلسلہ میں ہشام بن عمرو نے کچھ ساتھی تیار کئے اور باہم فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ میں آویزاں معاہدہ پھاڑ دیا جائے اور محصورین کو گھاٹی سے نکال لیا جائے۔

طائف کا سفر:

مکہ کے لوگوں نے جب اپنے طرزِ عمل سے رسولِ پاک ﷺ کو مایوس کر دیا تو آپ " مکہ کو چھوڑ کر شہر طائف چلے گئے جو مکہ سے چالیس میل دور ایک پہاڑی مقام ہے۔ آپؐ نے وہاں کے لوگوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن طائف کے لوگ مکہ والوں سے بھی زیادہ سنگدل ثابت ہوئے۔ انہوں نے آپؐ کا مذاق اُڑایا اور پتھر مار مار کر شہر سے نکال دیا مجبوراً آپؐ کو مکہ واپس آنا پڑا۔ مکہ واپس آنے کے بعد جلد ہی آپؐ کے چچا ابو طالب اور آپؐ کی بیوی خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ یہ دونوں رسول پاکؐ کا بہت بڑا سہارا تھے۔ ان کی وفات سے آپؐ کو اتنا صدمہ پہنچا کہ تاریخ اسلام میں یہ سال جس میں حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کا انتقال ہوا عام الحزن یعنی غم کا سال کہلاتا ہے۔

استحکام امت کی طرف قدم:

طائف سے واپسی کے بعد یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ جتنے نفوس اسلامی جمع ہو سکے ہیں ان کو منظم کرنے کے لیے کوئی جگہ ہونی چاہیے۔ جہاں سے وہ اپنے رب کی کبریائی کو بلند بھی کر سکیں اور مزاحمت کرنیوالوں کو منہ توڑ جواب بھی دے سکیں۔ مدینہ کے عربوں کو جب اطلاع ملی کہ مکہ میں ایک شخص نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو انہوں نے تصدیق کرنے کے لیے ایک وفد رسول ﷺ کے پاس مکہ بھیجا۔ اس وفد کے لوگوں نے جب رسول پاکؐ سے ملاقات کی تو اُن کو آپؐ کے نبی ہونے کا یقین آ گیا اور انہوں نے آپس میں کہا کہ "یہ وہی نبی ہیں جن کے بارے میں یہودی پیش گوئی کرتے رہے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسلام قبول کرنے کے معاملہ میں ہم سے بازی لے جائیں۔'' چنانچہ اس وفد کے لوگوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد اگلے دو سالوں میں مدنیہ سے اور لوگ بھی آئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا مدینہ کے ان مسلمانوں سے رسول پاکؐ نے عہد لیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، کسی کے خلاف بہتان نہیں باندھیں گے اور رسول پاکؐ کی کسی معاملہ میں نافرمانی نہیں کریں گے۔ مدینہ کے ان مسلمانوں نے صلح اور جنگ دونوں صورتوں میں رسول پاکؐ کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ یہ عہد تاریخ میں بیعتِ عقبہ اوّل اور بیعت عقبہ ثانی کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد مدینہ میں اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا اور اسی طرح جو سعادت مکہ اور طائف کے لوگوں کو حاصل نہ ہو سکی وہ مدینہ کے لوگوں نے حاصل کر لی۔ رسول پاکؐ نے مدینہ کے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے ایک صحابی حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مکہ سے روانہ کیا جن کی کوشش سے شہر کے بیشتر لوگوں نے اسلام بھی قبول کر لیا اور اسلامی تعلیمات سے واقفیت بھی حاصل کر لی۔ یہ وہی یثرب تھا جو نبیؐ کی آمد کے بعد مدینۃ النبی بن گیا۔ جسے ہم مدینہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور یہی وہ مرکز تھا جس کا مسلمانوں کو انتظار تھا۔ مکہ کو چھوڑ کر حضرت محمد ﷺ نے بہت سے رشتے توڑ دیے تھے۔ اب آپؐ نے خونی رشتے کی جگہ پر مذہبی بھائی چارے کے رشتے قائم کرنا چاہے۔ مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان پائے جانے والے حسد کو دور کرنے کی خاطر آپؐ نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنا دیا اور دونوں گرہوں کو مسجد میں ایک ساتھ عبادت کرنے کا کہا۔ مسجد میں پہلی نماز ادا کیے جانے کے موقعہ پر حضرت محمد ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور بلند آواز میں پکارا: ''اللہ اکبر''۔ ساری جماعت نے آپؐ کی آواز میں آواز ملائی۔ پھر بدستور جماعت کی جانب پشت کیے ہوئے آپؐ آگے کو جھکے اور ساتھ ساتھ دعائیں پڑھتے رہے۔ یہ سجدے اللہ کی اطاعت کا اظہار کرنے کے لیے تھے جس کے باعث نئے عقیدے کا نام پڑا۔۔۔۔ یعنی ''اطاعت،'' ''امن وسلامتی''۔۔۔ اور اس کے پیروکار مسلمین کہلانے لگے۔۔۔ یعنی ''اطاعت گزار'' ''خدا کے ساتھ امن قائم کرنے والے''۔ (۲۱)

اس مسجد کا ایک صحن بھی تھا، جس میں اکٹھے ہو کر مسلمان امت کے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور عسکری معاملات و مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضرت محمدؐ اور ان کی ازواج مطہرات اسی صحن کے گرد بنے ہوئے حجروں میں رہا کرتے تھے۔ چرچ کے برعکس، جو دنیاوی سرگرمیوں سے الگ تھلگ ہوتا ہے اور فقط عبادت کے لیے ہی مخصوص ہوتا ہے، مسجد میں ہر سرگرمی کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ قرآنی تصور کے مطابق دین و دنیا میں کوئی تفریق نہیں۔ زندگی کے تمام معاملات حقیقتاً مقدس تھے اور انہیں الوہیت کے دائرے میں لانا پڑتا تھا۔ توحید مقصد تھی یعنی پوری حیات کا ایک متحد برادری میں ڈھل جانا، جو کہ مسلمانوں کو خدائے واحد کی قربت عطا کرے گی ۔ ۶۲۴ء میں آپؐ نے ایک ایسا اقدام کیا جو آپؐ کے انتہائی تخلیقی ارشادوں میں سے ایک ہے صلوٰۃ کے دوران آپؐ نے جماعت سے فرمایا کہ یروشلم کی سمت رخ کرنے کی بجائے مکہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔

قبلہ کی یہ تبدیلی آزادی کا ایک اعلامیہ تھی۔ یروشلم سے کعبہ کی طرف، جو کہ یہودیت یا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا، رخ پھیر کر مسلمانوں نے واضح طور پر اظہار کیا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی خالص وحدانیت کی طرف رخ کر رہے ہیں جو کہ توریت وانجیل سے بھی پہلے نیز خدائے واحد کے مذہب کے آپس میں لڑنے والے فرقوں میں بٹ جانے سے بھی پہلے موجود تھی مسلمانوں کو صرف خدائے واحد کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ اللہ کے سوا انسانوں کے بنائے ہوئے کسی نظام یا کسی مروجہ مذہب کے سامنے جھکنا شرک تھا۔ بے شک جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے اپنے عقیدے کی وحدت کو توڑ دیا ہے اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ آپؐ کا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کہہ دیجیے ''دیکھو، میرے مالک نے مجھے ایک سچے عقیدے کے ذریعے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی دی ہے، ابراہیمؑ کی طرح، جنہوں نے ہر باطل کو رد کر دیا تھا اور جو ان لوگوں میں سے نہیں تھے جنہوں نے اللہ کے علاوہ کسی اور کو معبود بنالیا تھا''۔ کہہ دیجیے ''دیکھو میری نماز میری عبادت کے (تمام) طریقے اور میرا جینا اور مرنا صرف خدائے واحد کے لیے ہے''۔ قبلہ کی تبدیلی کو تمام عرب مسلمانوں نے پسند کیا، خاص طور پر مکہ سے ہجرت کر کے آنے والوں نے تو اس کو بہت پسند کیا۔ اب مسلمان ان یہودیوں اور عیسائیوں کی پیروی نہیں کریں گے جو ان کی آرزوؤں کا مذاق اڑاتے تھے بلکہ اللہ کی طرف جانے والے اپنے سیدھے راستے پر چلیں گے۔ (۲۲)

رزمِ حق و باطل:

مدینہ میں امت مسلمہ کا ہجرت کر کے جمع ہو جانا دراصل مسلمانوں کی ایک الگ حیثیت کا باقاعدہ اعلان تھا۔ اخوت و بھائی چارے کا اعلیٰ نظام اور میثاق مدینہ جس کو دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے یہ وہ کامیابیاں تھی جو اسلام کی مضبوطی کو ظاہر کر رہی تھیں۔ اسلام کی اس مضبوطی کو دیکھ کر مکہ کے کافروں میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کو تلوار کے ذریعے ختم کیا جائے گا۔ ان لڑائیوں میں پہلی ''غزوہ بدر'' کہلاتی ہے کیونکہ یہ جنگ مدینہ کے شمال میں اسی ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر ہوئی تھی۔ اس جنگ میں صرف تین سو تیرہ مسلمانوں نے ایک ہزار کافروں کو شکست دی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن اور کافروں کا سردار ابو جہل اس جنگ میں مارا گیا۔ دوسری لڑائی ''غزوہ احد'' کہلاتی ہے اس میں سات سو مسلمانوں نے تین ہزار کافروں کا مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ کافروں کا سردار ابوسفیان تھا۔ اس جنگ میں رسول پاکؐ کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہو گئے اور رسول پاکؐ کو بھی زخم آئے لیکن کافر مدینہ پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور واپس چلے گئے۔ احد مدینہ کے شمال میں دو میل دور ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے دامن میں یہ جنگ ہوئی تھی۔ تیسری بڑی لڑائی غزوہ خندق یا غزوہ احزاب کہلاتی ہے۔

اس موقع پر مکہ کے کافروں نے عرب کے کئی قبیلوں کی مدد اور یہودیوں کے تعاون سے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا اور شہر کو بچانے کے لیے مسلمانوں نے خندق کھود لی تھی۔ دفاع کے لیے خندق کھودنے کا طریقہ عربوں نے ایک ایرانی صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر پہلی مرتبہ اس جنگ میں اختیار کیا۔ اس موقع پر بھی کافروں کا سردار ابوسفیان تھا۔ غزوہ احزاب کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حج کرنے کا ارادہ کیا۔ عرب میں پرانے زمانہ سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ حج کے زمانہ میں لڑائیاں بند کردی جاتی تھیں اور عرب کے ہر حصہ کے لوگ بغیر کسی پابندی کے حج کر سکتے تھے۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ ایک ہزار چار سو مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو حدیبیہ کے مقام پر آپؐ کو اطلاع ملی کہ کافر جنگ کی تیاری کررہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ والوں کو یقین دلایا کہ لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ حج کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کافر اپنی ضد پر اڑے رہے اور مسلمانوں کو حج نہیں کرنے دیا آخر کار مکہ کے کافروں اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جو صلح حدیبیہ کہلاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت یہ طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔ اور اگلے سال حج کے لیے آئیں۔ معاہدہ کی بعض شرطیں ایسی بھی تھیں۔ جو بظاہر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے امن و صلح کے دوررس نتائج کی خاطر یہ شرطیں منظور کرلی تھیں۔ معاہدہ ہوجانے کے بعد مسلمان مدینہ واپس آگئے۔ (۲۳) لیکن اس معاہدہ نے مسلمانوں کی ایک حیثیت متعین کردی تھی۔

ہمعصر سلاطین کو دعوت اسلام:

اسلام کا پیغام کسی خاص فرد و ملک کے لیے نہیں تھا بلکہ الارض للہ زمین اللہ ہی کی ہے کے تحت پوری بنی نوع انسان کے لیے تھا۔ تاکہ ساری زمین پر اللہ کی حاکمیت اعلیٰ قائم ہوجائے۔ آپؐ نے جب یہ محسوس کیا کہ عرب کے مختلف حصوں میں اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں ہیں تو آپؐ نے اس وقت کے مختلف سلاطین کو خطوط لکھے جن میں ایران، روم، مصر، حبش، کے بادشاہ شامل ہیں۔ حبش کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا۔ ایران کا بادشاہ خسرو پرویز نے غرور و تکبر میں آکر آپؐ کا خط پھاڑ دیا۔ جب آپؐ کو خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ خسرو کی سلطنت بھی اسی طرح ٹکڑے ہوجائے گی۔ باقی روم کے بادشاہ ہرقل اور مصر کے رومی گورنر مقوقس نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن آپؐ کے قاصدوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اس طرح بہت تھوڑے عرصے میں اسلام کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ محمدؐ جرنیل ہیں، یہ محمدؐ بادشاہ ہیں، یہ سپہ سالار ہیں، یہ تاجر ہیں، یہ داعی ہیں، یہ فلاسفر ہیں، یہ مدبر ہیں، یہ خطیب ہیں، یہ مصلح ہیں، یہ محمدؐ یتیموں کی پناہ گاہ ہیں، یہ عورتوں کے نجات دہندہ ہیں۔

یہ جج ہیں یہ ولی ہیں، یہ تمام اعلیٰ اور عظیم الشان کردار ایک ہی شخصیت کے ہیں۔ ہر شعبہ زندگی کے لیے آپؐ کی حیثیت مثالی ہے۔ آپؐ کے کارنامے کسی ایک شعبہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔ مثال کے طور پر کسی قوم کی اصلاح کرنا عظمت کی علامت ہے تو اس کا سہرا آنحضرت ﷺ کے سر بجتا ہے۔ عرب قوم بربریت کا شکار تھی اور اخلاقی پسماندگی کی ایسی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی کایا پلٹ دی ہیئت بدل دی اور پوری قوم کو سر بلند کر دیا اگر عظمت معاشرے کے منتشر عناصر کو بھائی چارے اور اخوت میں پرو دینے کا نام ہے تو یہ اعزاز بھی اللہ کے رسولؐ کے لیے خاص ہے۔ اگر عظمت شکوک و توہمات اور لایعنی رسومات سے نجات دینے کا نام ہے تو رسول اکرمؐ نے کروڑوں انسانوں کو بے معنی خوف اور بے بنیاد رسومات سے نجات دلائی۔ اگر عظمت اعلیٰ ترین کردار کے مظاہرے کا نام ہے تو آنحضرتؐ کو آپ کے دوستوں اور دشمنوں نے الصادق اور الامین یعنی سچ بولنے والا اور امانت دار قرار دیا ہے۔ اگر فاتح عظیم ہونا تو ہمارے سامنے ایک ایسا شخص ہے جو بے سہارا یتیم اور عام انسان کے درجے سے سر بلند ہو کر عرب کا حکمران بن جاتا ہے۔ ایک ایسا حکمران جو خسرو اور قیصر کا ہم پلہ ہے، جس نے ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھی، جو آپؐ کے چودہ سو برس بعد بھی قائم ہے۔ اگر عظمت کا معیار قائد سے اسکے پیروکاروں کا لگاؤ اور عشق ہے تو آنحضرت ﷺ کا نام دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں چاہنے والوں کے لیے آج بھی طلسماتی کشش رکھتا ہے۔ (۲۴)

فتح خیبر و موتہ کے بعد امت کی عسکری حیثیت بھی مسلم ہو چکی تو اب امت کو اس جگہ واپس لوٹانا مقصود تھا جہاں سے وہ اسی حق کو بلند کرنے کی پاداش میں نکالے گئے تھے۔

فتح مکہ:

زمانہ قدیم سے مکہ معظمہ کو ملک عرب میں سیاسی، معاشی اور مذہبی اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل تھی اسی وجہ سے قریش مکہ کی دیگر قبائل عزت و تکریم کرتے تھے۔ کہ قریش مکہ بیت اللہ شریف کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مسلسل کامیابیوں سے نوازا۔ تو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ دنیا کی یہ مرکزی عبادت گاہ۔ یعنی کعبۃ اللہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سعادت سے بھی شرف بخشا۔ خانہ کعبہ زمین پر مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ یہ دنیا میں پہلا گھر جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے کی۔ اسکی تعمیر کا مقصد اللہ کی عبادت کرنا تھا مگر قریش مکہ نے اس میں سینکڑوں بت سجا رکھے تھے۔

اس طرح بجائے عبادت کرنے کے یہ گھر بت پرستی اور شرک کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ اس اللہ کے گھر کو بت پرستی سے پاک کیا جائے۔ اور بتوں سے پاک کر کے اس میں اللہ کی یاد کی جائے۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ مکہ کو فتح کیا جائے۔ غرض ۱۰ رمضان ۸ ھ کو کو کبہ نبوی نہایت عظمت وشان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائل عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے، مرّ الظہر ان پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل، یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔ آنحضرت ﷺ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ (۲۵) اس عظیم فوج کو دیکھ کر قریش نے حقیقت کا ادراک کر لیا اور انہوں نے شکست تسلیم کرتے ہوئے شہر کے دروازے کھول دیے اور اس طرح بغیر خون خرابے کے مکہ کو فتح کر کے آپ ﷺ نے کعبہ میں نصب بتوں کو توڑ دیا۔ قریش کے کسی فرد پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہیں کیا گیا لیکن امت مسلمہ کی اس عظیم الشان غلبے نے کٹر سے کٹر دشمنوں کو بھی سر اطاعت خم کر دینے یعنی امت مسلمہ کا حصہ بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ آپ ؐ نے صحابہ کے ہمراہ پہلے خانہ کعبہ کی طرف رخ کیا بیت اللہ کو بتوں سے پاک کیا اور زبان مبارک سے یہ اعلان کیا کہ جَآءَ الحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔ (حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بیشک باطل مٹنے ہی کی چیز تھی)۔ بیت اللہ کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرنے کے بعد حضرت بلال ؓ کو آپ ؐ نے ارشاد فرمایا کہ اذان دیں۔ پھر آپ ؐ حضرت بلال ؓ اور حضرت طلحہ ؓ کے ساتھ بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے اور نماز شکرانہ ادا فرمائی۔ پھر باہر تشریف لائے اور خطبہ دیا۔ آپ ؐ نے قریش سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا۔ اے قریش اللہ نے تم پر جاہلیت اور تکبر اور حسب ونسب کا فخر ممنوع کر دیا ہے۔ کیونکہ سب لوگ آدم ؑ کی اولاد ہیں اور آدم ؑ مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو قوموں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹا ہے کہ تماری پہچان ہو سکے۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔ بیشک اللہ علیم اور خبیر ہے۔ پھر آپ ؐ نے اہلِ مکہ سے سوال کیا کہ اے اہل مکہ تمھیں کچھ معلوم ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اُٹھے کہ

اخ کریم وابن اخ کریم

''تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔''

ارشاد ہوا:

"لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقآء"

"تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔" (۲۶)

فتح مکہ کے بعد حضرت محمد ﷺ کا مشن پورا ہو چکا تھا، اسلام اب دور دراز گوشوں میں پھیل رہا تھا، قرآن نازل ہو چکا تھا، اسلامی شریعت تکمیل پا چکی تھی، حکومت الٰہیہ قائم ہو چکی تھی، باطل ناکام ہو چکا تھا، اور حق کا بول بالا ہو چکا تھا جہاں سے اسلام کے داعی کو، مسلمانوں کو، اسلام کے ہمدردوں کو دیس نکالا ملا تھا، آج وہاں اسلام کی حکومت تھی، احکام و فرائض کا نفاذ ہو چکا تھا۔

حجۃ الوداع:

حجۃ الوداع جسے آپؐ کا آخری حج کہا جاتا ہے ۱۰ ہجری میں جب رسول اللہ ﷺ نے حج کرنے کا ارادہ کیا تو مسلم امہ کے افرادِ عرب کے ہر حصے سے مدینہ پہنچنا شروع ہو گئے تاکہ رسولِ خداؐ کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ اندازہ ہے کہ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے حج کیا۔ حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک تقریر کی جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ انسانی حقوق کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: آج عہدِ جاہلیت کے تمام دستور اور طور طریقے ختم کر دیئے گئے۔ اللہ ایک ہے اور تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور وہ سب برابر ہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ اگر کسی کو فضیلت ہے تو نیک کام کی وجہ سے ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اس خطبہ میں رسول پاکؐ نے انتقام کے طریقے کو، جس کا عہدِ جاہلیت میں رواج تھا اور جسکی وجہ سے نسل در نسل خاندانوں میں دشمنی چلی آ رہی تھی اور سودی کاروبار کو سختی سے منع کیا۔ عورتوں اور غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی۔ آپؐ نے مسلمانوں کی ہدایت کی کہ وہ اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑے رہیں تاکہ گمراہ نہ ہوں۔ آخر میں آپؐ نے مجمع کو مخاطب کر کے پوچھا: ''تم سے اللہ کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟'' مسلمانوں نے ایک آواز سے کہا: ''ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا''۔ اس پر رسول پاکؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا''۔

اسی دوران تکمیل دین کی آیت نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔(۲۷)

ترجمہ: "آج میں (اللہ) نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔"

اس ۲۳ سالہ دور میں آپؐ کی جدوجہد سے بت پرستی کی جگہ توحید، قتل و غارتگری کی جگہ امن و محبت اور خاندان، قبیلہ، فخر و غرور، نسل پرستی کی جگہ اخوت و بھائی چارے نے لے لی تھی۔ یہ تھی نئی امت مسلمہ جس کی بناء حضرت ابراہیمؑ پر استوار کر کے اور قرآن و سنت کی صورت میں منبع ہدایت امت کو تھما کر نبیؐ اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جن کی عظمت کو دنیا مانتے ہوئے اپنے تو اپنے غیر بھی سرفہرست رکھنے پر مجبور ہیں۔

My choice of Muhammad (SAW) to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels. (28)

فصل سوم

نبوت سے خلافت کی طرف

خلافت راشدہ وفتوحات

حضورؐ کی وفات جہاں پرصحابہ کرامؓ کے لیے ناقابل برداشت تھی اسی جگہ یہ ذمہ داری بھی عائد ہوچکی تھی کہ اب امت مسلمہ کو پروان چڑھانا اور اسلام کا پیغام ان تک پہنچانا تھا جن تک یہ پیغام ابھی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ آنحضرت ﷺ کا جب وصال ہوا تو سارا عرب مسلمانوں کے قبضے میں آچکا تھا اور ملک میں ایک مرکزی حکومت قائم ہوچکی تھی جس کے سربراہ خود رسول پاکؐ تھے۔ حضور ﷺ نے چونکہ اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا تھا اس لیے اب یہ فیصلہ کرنا عام مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ آپؐ کی جگہ اسلامی ریاست کا سربراہ کون ہو۔ آپ ﷺ نے تو تعلیم وتربیت کا مرحلہ مکمل کردیا تھا، رہنمائی کے لیے کامل نمونہ بن کر دکھادیا تھا اور اب انہی تربیت یافتہ لوگوں کے کاندھوں پر امت مسلمہ کی رہنمائی کی ذمہ داری آچکی تھی کیونکہ

یہی دامن تھے جن کے سائے میں عالم کو بسنا تھا
یہی وہ ابر تھے جن کو زمانے پر برسنا تھا
شرافت لے کے آئے تھے یہ آغوشِ اصالت سے
لیا تھا نور ان لوگوں نے خورشید رسالتؐ سے (۲۹)

چنانچہ مسلمانوں نے مدینہ میں ایک جگہ جمع ہوکر جس کو سقیفہ بنی ساعدہ کہا جاتا ہے، بحث مباحثہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو رسول پاک ﷺ کا جانشین یعنی ''خلیفہ'' منتخب کرلیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ:

عبداللہ ابوبکر بن عثمان، ابوقحافہ کے نام سے مشہور ہیں۔ چھٹی پشت میں آپؓ کا نسب رسول اللہ ﷺ سے جاملتا ہے ،آپؓ کا لقب صدیق ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت کے لیے منتخب کیے گئے تو بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے عوام کے حقوق اور حکمران کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں

حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر غلط راستے پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ تم میں جو کمزور ہے وہ بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اس کو دلا دوں اور تمہارا قوی شخص بھی میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق حاصل کر لوں۔ اگر میں خدا اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں''۔ حضرت ابو بکرؓ کی اس تقریر میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ایک مسلمان حکمران مطلق العنان نہیں ہو سکتا اور من مانی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اسلامی اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو عوام اس کو علیحدہ کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ تقریر اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں عوام کے حقوق کی جو نشاندہی کی گئی ہے اور حکمران کے جو فرائض اور حدود مقرر کیے گئے ہیں وہ اسلام کے سیاسی نظام میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور بعد میں خلفائے راشدین نے ان کو اپنا رہنما اصول بنا لیا۔ یہ وہ حقوق و فرائض ہیں جن کو مغربی دنیا نے اٹھارویں صدی میں اپنایا۔(۳۰)

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے روم پر حملہ کے لیے اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں پانچ ہزار جنگجوؤں کو روانہ کیا۔ رسول ﷺ نے اس لشکر کے پرچم کو اپنی وفات سے قبل شاہانِ غسان سے جنہوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے والد کو شہید کیا تھا انتقام کے لیے تیار کیا تھا لشکر بلادِ شام کی طرف چلا حتیٰ کہ وہ اہل روم کے ساتھ مل گیا، مقام موتہ کے قریب بلقاء میں گھمسان کی جنگ ہوئی پھر لشکر نے اس پر فتح پائی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مرتدوں، مدعیان نبوت اور ان قبائل سے جنہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا تھا مقابلہ کیا اور بحرین، عمان و یمن میں بہت سے لشکروں کو روانہ کیا، انہیں اور ان کے مسیلمہ کذاب جیسے سردار قتل کیے گئے۔ اس طریقہ سے مرتدین کو ختم کر دیا گیا اور اتحاد جزیرہ عرب کی طرف اسلامی جھنڈے تلے لوٹ آیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں ایک لشکر تیار کیا اور حضرت خالد کے تحت قبیلہ بکر کے سردار حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کو سن ۱۲ ہجری میں حیرہ اور انبار پر غلبہ پانے کے لیے بھیجا، چند معرکوں کے بعد ہی اسلامی لشکر فارس کے خلاف فتحیاب ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے شام کو فتح کرنے کے لیے چار لشکر روانہ فرمائے، ایک لشکر حضرت ابو عبیدہ عامرہ بن جراحؓ کی قیادت میں جس کا رخ حمص کی جانب کیا دوسرا لشکر حضرت شرجیل بن حسنہؓ کی قیادت میں جس کا رخ اردن کی جانب، تیسرا لشکر عمرو بن عاصؓ کی قیادت میں جس کا رخ فلسطین کی جانب اور چوتھا لشکر حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کی قیادت میں جس کا رخ دمشق کی جانب کیا۔ جنگجوں میں حفاظِ قرآن کی ایک بہت بڑی تعداد کے شہید ہونے کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں قرآن جمع کیا گیا اور زید بن ثابتؓ کو قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تاکہ وہ سب ایک مصحف میں ہو جائے۔ آپ نے ۱۳ھ مطابق ۶۳۴ء کو ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی، آپ کی خلافت دو سال تین مہینے رہی۔(۳۱)

حضرت عمرؓ بن خطاب:

حضرت عمرؓ بن خطاب، کنیت ابوحفص ہے۔ والد کی جانب سے ساتویں پشت میں آپؓ کا نسب رسول اللہ ﷺ سے جا ملتا ہے اور والدہ کی طرف سے چھٹی پشت میں ملتا ہے۔

حضرت عمرؓ اصول کے معاملہ میں سخت تھے اور حق کے معاملہ میں کسی قسم کی رعایت کے قائل نہ تھے مگر جب خلافت کا بار اٹھایا تو ان میں وہ نرمی آ گئی جس کا اظہار حضرت ابوبکرؓ خلافت کے لیے حضرت عمرؓ کے بارے میں انتخاب کرتے ہوئے کیا تھا۔ لوگ بر سر منبر ٹوک دیتے، اختلاف رائے میں لوگ شدت پسندی دکھاتے۔ مگر حضرت عمرؓ نے عام حکمرانوں کی طرح کبھی قوت و طاقت کے بل پر لوگوں کی آواز دبانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ذمہ داری کا اتنا احساس تھا کہ راتوں کو گشت لگا کر لوگوں کے حالات سے باخبر ہونے کی سعی کرتے اور امیر المومنین ہونے کے باوجود خود کاندھے پر اناج کی بوری رکھ کر بھوکوں کی دادرسی کے لیے چلے جاتے۔

حضرت عمرؓ کے خلیفہ مقرر ہو جانے کے بعد اسلامی فتوحات کا ایک عظیم الشان سلسلہ اپنے عروج کو پہنچا۔ قادسیہ کے میدان میں مسلمانوں نے ساٹھ ہزار ایرانیوں کو شکست دی اور شام میں یرموک کے میدان میں مسلمانوں نے ایک لاکھ سے زیادہ عیسائیوں کو شکست دی۔ قادسیہ کی جنگ میں مسلمانوں کا جذبہء فروغ اسلام اور توکل علی اللہ کی اعلیٰ مثال کہ مسلمان جب دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے اللہ کا نام لے کر اپنا گھوڑا دجلہ میں ڈال دیا۔ اپنے کمانڈر کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر باقی مسلمانوں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے ان کے اسی عزم نے تری کو خشکی میں بدل دیا اور اس طرح پوری فوج نے نصرت الٰہی سے بغیر کسی پُل کے دریا کو عبور کر لیا۔

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے (۳۲)

حضرت سعدؓ نے جب شاہی خزانہ اور مال و اسباب مدینہ روانہ کیا تو حضرت عمرؓ اس کو دیکھ کر رو پڑے۔ لوگوں نے پوچھا کہ ''یہ تو خوشی کی بات ہے آپ روتے کیوں ہیں''؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ''میں اس لیے روتا ہوں کہ مال و دولت کی اس کثرت میں مجھے مسلمانوں کے زوال کے آثار نظر آ رہے ہیں۔'' (۳۳) مسلمانوں نے مدائن کے بعد عراق، نہاوند، شام و مصر وغیرہ بھی یکے بعد دیگرے فتح کر لیے۔ فتوحات کی ایک اہم کڑی بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ جب مسلمانوں نے اس مقدس شہر کا محاصرہ کر لیا تو عیسائی اس شرط پر شہر کو حوالے کرنے اور صلح کرنے پر تیار ہو گئے کہ حضرت عمرؓ خود آ کر صلح کا معاہدہ

لکھیں..... اس صلح نامہ کی رو سے حضرت عمرؓ نے مقامی عیسائیوں کے مطالبہ پر یہودیوں کو بیت المقدس سے خارج کردیا۔اب مسلمانوں کا قبلہ اوّل بھی ان کے اپنے قبضہ میں آ گیا..... شام اور فلسطین سے اگرچہ رومی خارج کردیئے گئے لیکن وہ مصر کی طرف سے اب بھی مسلمانوں کے لیے خطرہ ہوسکتے تھے۔ایک مشہور صحابی حضرت عمروؓ بن عاص نے جو شام کی لڑائیوں میں شریک تھے، حضرت عمرؓ سے مصر پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی۔اجازت ملنے پر انہوں نے دو تین سال کے اندر پورا مصر فتح کرلیا رومیوں کے زمانہ میں بندرگاہ اسکندریہ مصر کا دارالحکومت تھا۔اب مسلمانوں نے دریائے نیل کے کنارے فسطاط کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا۔حضرت عمروؓ بن عاص نے کچھ مدت بعد مغرب میں برقہ اور طرابلس کو بھی اسلامی خلافت کی حدود میں شامل کر لیا۔یہ وہ علاقہ ہے جو آج کل لیبیا کہلاتا ہے۔حضرت عمرؓ نے کل ساڑھے دس سال خلافت کی لیکن اس مختصر سے عرصہ میں انہوں نے ایک عظیم الشان حکومت قائم کردی جو اپنے رقبہ اور طاقت کے لحاظ سے اپنے زمانہ کی سب سے بڑی حکومت تھی۔حضرت عمرؓ کا عہد صرف فتوحات کی وجہ سے مشہور نہیں ہے بلکہ عدل وانصاف، رعایا پروری اور انتظام حکومت کی خوبی کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ آپؓ کے عہد میں پہلی مرتبہ مختلف انتظامی محکمے قائم کیے گئے اور سرکاری آمدنی اور خرچ کا باقاعدہ حساب تیار کیا گیا۔یہ محکمے دیوان کہلاتے تھے۔انتظام حکومت کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے جو اقدامات کیے اور اصلاحات جاری کیں ان کو تاریخ اسلام میں حضرت عمرؓ کی ''اولیات'' کہا گیا ہے یعنی وہ کام جو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے کیے۔(۳۴) حضرت عمرؓ کی ان اصلاحات نے یہ ثابت کردیا کہ ان کی اسلامی حکومت اپنے دور کی ایک نہایت منظم حکومت تھی۔حضرت عمرؓ جس عزم وہمت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور آدھی دنیا سے زائد حصوں پر عدل کے ساتھ حکومت کی وہ بعد کے لوگوں کے لیے مثالی نمونہ ہے۔حضرت عمرؓ ۲۳ھ بمطابق ۶۴۴ء کو ابولؤلؤ مجوسی نے فجر کی نماز میں جب حضرت عمرؓ نماز پڑھا رہے تھے خنجر سے حملہ کردیا۔زخم اتنا زیادہ گہرا تھا کہ وہ آپؓ کی موت کا سبب بن گیا۔وفات کے وقت آپؓ نے چھ آدمیوں کی ایک مجلس بنادی تھی کہ وہ اکثریتی رائے سے جسے چاہیں خلیفہ منتخب کرلیں۔

حضرت عثمان بن عفانؓ:

عثمانؓ بن عفان بن العاص بن امیہ بن عبد شمس، آپ کا نسب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کے دادا عبد مناف پر جا کر مل جاتا ہے۔حضرت عمرؓ نے خلافت کو مسلمانوں کے مشورہ پر چھوڑ دیا، اور انہیں حکم دیا کہ وہ کبار صحابہ میں سے جسے چاہیں منتخب کرلیں (اور چند نام بتائے) جن میں عثمانؓ بن عفان، علیؓ بن ابو طالب، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ بن عبداللہ اور زبیرؓ بن عوام شامل ہیں، ان چھ میں سے عثمانؓ بن عفان کو منتخب کیا گیا۔

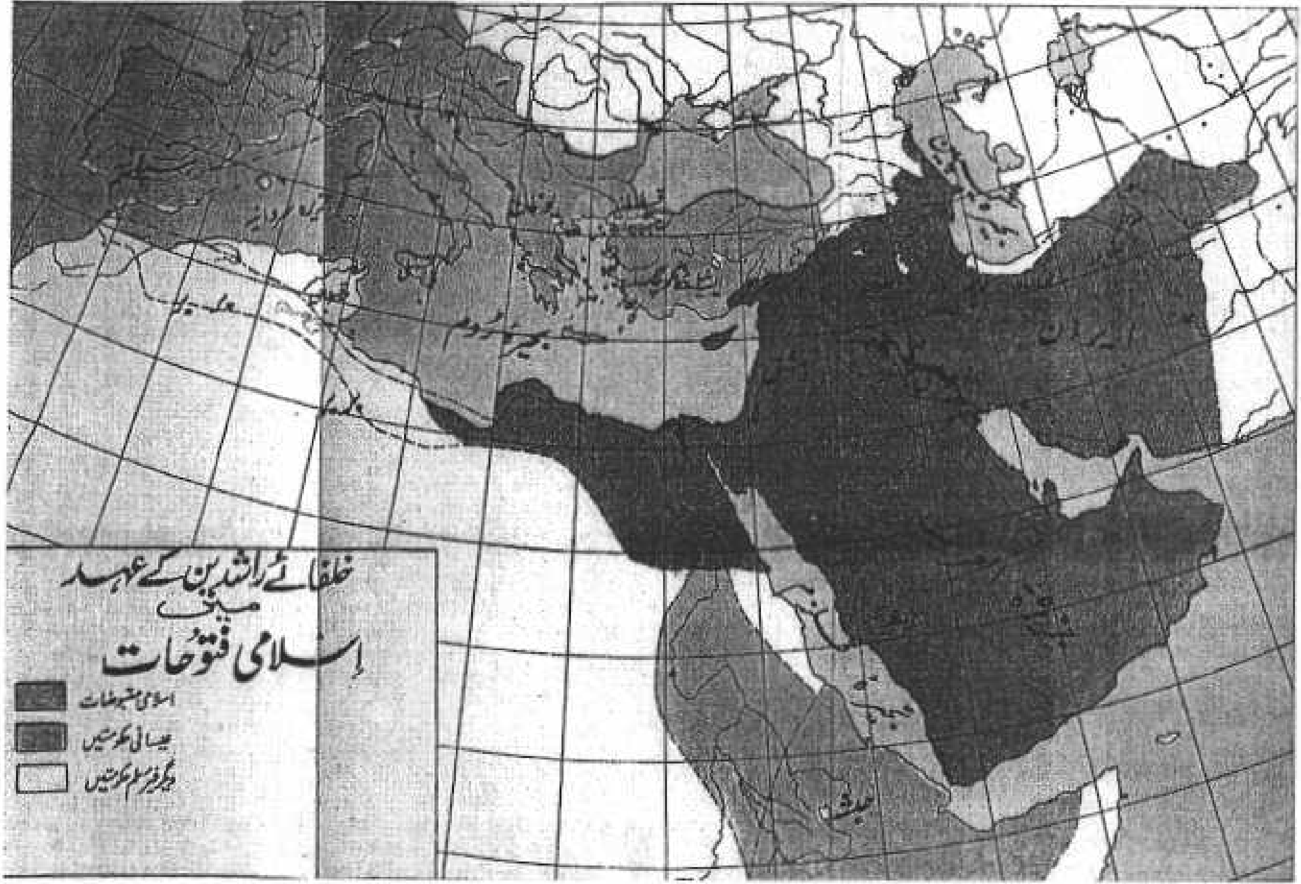
خلیفہ عثمانؓ بن عفان کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، لہٰذا خراسان، آزربائیجان، طبرستان اور مغربی طرابلس جو مسلسل روم کی حکومت کے تحت رہا تھا فتح کیا گیا، اس طرح بلاد فارس میں اٹھنے والی شورش ختم ہوئی اور سن ۳۴ ہجری ۶۵۵ء مقام ذات الصواری میں رومی بیڑوں کے خلاف اٹھنے والا واقعہ اسلامی بیڑوں کے لیے بہت بڑی فتح بن کر ظاہر ہوا۔ (۳۵)

عبداللہ بن عامر اور سعید بن العاص خراسان روانہ ہوئے اور اسے فتح کر کے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مہینے کے محاصرہ کے بعد نیشاپور کے حاکم مرزبان نے صلح کر لی۔ ساسانی خاندان کا آخری تاجدار یزدگرد ان دنوں یہیں آیا ہوا تھا۔ خراسان اور نیشاپور پر دوبارہ اسلامی تسلط ہو جانے کی خبر سنی تو مایوس ہو کر بھاگا۔ مگر ایک دیہاتی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب ابن عامر نے طخارستان، کرمان، وغیرہ کی مہمات پر مختلف سرداروں کو مامور کیا۔ جنہوں نے یکے بعد دیگرے ان علاقوں کو فتح کر کے نہ صرف غزنی اور کابل کو مطیع کیا۔ بلکہ آگے بڑھ کر ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے۔ ان فتوحات کے باعث اسلامی حکومت کی حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کی مشرق سرحدات تک پھیل چکی تھی۔ (۳۶)

حضرت عثمانؓ بہت نرم دل تھے ان کی نرم دلی سے لوگوں نے ناجائز فائدے بھی اٹھائے، حضرت عثمانؓ نے مختلف صوبوں میں جو گورنر مقرر کیے تھے ان کے بعض طور طریقوں سے لوگوں کو شکایات پیدا ہوئیں خود حضرت عثمانؓ کے جود و عطا سے بھی محرومین کو صدمہ پہنچا، اور وہ سازش پر آمادہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ خاص مدینۃ الرسولؐ میں باغیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا یہ محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا، حضرت علیؓ نے باغیوں اور مفسدوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ راہ راست پر نہ آئے، احتیاطاً آپ نے حضرات حسنینؓ کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ صدر دروازہ پر حفاظت اور نگہبانی کے لیے مامور کر دیا۔ باغی یہ رنگ دیکھ کر پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئے اور شہید کر دیا، یہ واقعہ ایسا اچانک پیش آیا کہ سارے مدینہ پر ایک سراسیمگی طاری ہو گئی، تین روز تک باغیوں کی حکومت رہی اس کے بعد جا کر کہیں امن وامان قائم ہوا۔ (۳۷)

حضرت علیؓ:

آپؓ کا نام علیؓ بن ابی طالب ہے۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے اور بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف آپؓ کو حاصل تھا۔ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپؓ گذشتہ تینوں خلفاء کے عہد میں خلافت کی مجلس مشاورت کے رکن اور انتظامی امور میں شامل رہے۔


خلفائے راشدین کے عہد میں
اسلامی فتوحات
اسلامی مقبوضات
عیسائی حکومتیں
دیگر غیر مسلم حکومتیں
بحیرۂ روم
ایران

حضرت علیؓ کی خلافت کا آغاز بڑے مشکل اور پیچیدہ حالات میں ہوا۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت علیؓ کا پہلا کام حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا دینا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ قاتل کا کسی کو پتہ نہ تھا اور فسادی جو ہزاروں کی تعداد میں تھے مدینہ پر چھائے ہوئے تھے اور خود حضرت علیؓ کی فوجوں میں شامل ہو گئے تھے۔ دوسری طرف حضرت علیؓ نے بیعت لینے کے بعد ان گورنروں کی معزولی کا حکم صادر کیا، جن کے متعلق حضرت عثمانؓ کے دور میں شکایات موصول ہو چکی تھیں۔ اس وجہ سے بعض نے ناراض ہو کر اس حکم کے خلاف بغاوت کر دی۔ شام کے گورنر معاویہؓ بن ابوسفیان نے بھی بغاوت کرتے ہوئے شام میں اپنی ریاست کی بقاء پر مصر رہے اسی دوران قصاص کے معاملہ پر جنگ جمل ہوئی اور صفین کا واقعہ رونما ہوا۔ جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ مدینہ واپس نہیں آئے اور کوفہ کو دارالخلافہ بنالیا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا، جو خارجی کہلاتا ہے حضرت علیؓ کے حامیوں میں کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دینی معاملات میں انسان کو حکم بنانا کفر ہے اور حضرت علیؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو حکم بنانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے چنانچہ یہ لوگ حضرت علیؓ سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ خارجی اپنے طرز عمل میں انتہا پسند تھے۔ اور تشدد پر ان کو یقین تھا چنانچہ انہوں نے ایک خوف ناک منصوبہ تیار کیا۔ انہوں نے طے کیا کہ حضرت علیؓ امیر معاویہؓ اور حضرت عمرؓو بن عاص مسلمانوں میں خانہ جنگی کے ذمہ دار ہیں اس لیے ان کو قتل کر دینا چاہیے۔ چنانچہ صلح کے کچھ عرصہ بعد ایک مقررہ دن تین خارجی اپنے اپنے گھروں سے اس مقصد سے نکلے۔ امیر معاویہؓ اور عمرؓو بن عاص تو کسی طرح بچ گئے لیکن تیسرے خارجی جس کا نام ابن ملجم تھا حضرت علیؓ کو جب کہ وہ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جا رہے تھے شہید کر دیا۔ حضرت علیؓ نے تقریباً ساڑھے چار سال خلافت کی۔ شام اور مصر کے علاوہ باقی تمام سلطنت ان کے قبضہ میں تھی ان کا عہد چونکہ خانہ جنگی میں گزرا اس لیے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا گیا... حضرت علیؓ کی وفات کے بعد دارالخلافہ کوفہ کے لوگوں نے امام حسنؓ کو خلیفہ منتخب کرلیا۔ امام حسنؓ مسلمانوں میں خونریزی کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے جب امیر معاویہؓ نے عراق پر حملہ کیا تو آپؓ نے جنگ کرنے کے بجائے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہونا پسند کیا اس طرح حسنؓ کی بے مثال قربانی نے مسلمانوں کو خانہ جنگی سے نجات دلا دی۔ (۳۸)

خلافت راشدہ پر ایک نظر:

خلافت راشدہ سے پہلے محمد عربی ﷺ کا دور تھا۔ امت مسلمہ کی بنیاد خود محمد عربی ﷺ نے تعمیر کی تھی۔ ایک اسلامی معاشرہ کا وجود اور اسلامی ریاست کی بنیاد جسے مکمل طور پر رفاہی مملکت کہا جا سکتا ہے، اسکا نمونہ نبیؐ نے دیا۔

دوسرا مرحلہ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور سے شروع ہوتا ہے اور حضرت علیؓ کی شہادت پر بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری پر ختم ہوتا ہے۔ اسی دور کو خلافت راشدہ یعنی راست رو خلافت کہا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ میں اسلامی حکومت، بین الاقوامی حیثیت اختیار کرتے ہوئے ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آچکی تھی۔ خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں اسی اصول سیاست وانتظام مملکت کا التزام کیا گیا جو عہد رسالت میں کیا گیا تھا۔ اس مختصر سے عرصہ میں خلفاء راشدین نے باہمی مشاورت سے اصلاح معاشرہ، سیاست و قیادت اور انتظام مملکت میں جو کارنامے انجام دیے وہ نہ صرف اسلامی تاریخ کا سنہرا باب ہے بلکہ عالمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آج بھی وہ امت مسلمہ کے روشنی کا مینار ہے۔

فصل چہارم

آغازِ ملوکیت (عروج وزوال کی مختصر داستان بنوامیہ سے سقوط خلافت عثمانیہ تک)

خلافت سے ملوکیت کی طرف

کوفہ کے مسلمانوں نے حضرت امام حسنؓ کو خلافت کے لیے منتخب کیا لیکن امیر معاویہؓ نے آپؓ کے انتخاب کو قبول نہ کیا تو حضرت حسنؓ نے معاملات کی نازکی کو دیکھتے ہوئے ان سے صلح کر کے خلافت سے دستبردار ہو گئے۔امام حسنؓ کی دست برداری کے بعد امیر معاویہؓ مسلمانوں کے متفقہ خلیفہ تسلیم کر لیے گئے لیکن ان کی یہ خلافت انتخابی خلافت نہیں تھی۔

یعنی امیر معاویہؓ کو مسلمانوں نے انتخاب کے ذریعہ خلیفہ منتخب نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے طاقت کے زور سے خلافت حاصل کی تھی اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں نے مجبوراً بیعت کر لی کیونکہ اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو امیر معاویہؓ خلافت سے دست بردار نہیں ہوتے اور خانہ جنگی بدستور جاری رہتی۔اس طرح خلافت راشدہ کا انتخابی پروگرام ختم ہو کر اسلامی تاریخ میں ملوکیت کا آغاز ہوا۔امیر معاویہؓ کی بیعت ہو جانے کے بعد جب مشہور صحابی فاتح عراق حضرت سعد ابن وقاصؓ ان سے ملے تو انہوں نے امیر معاویہؓ کو السلام علیکم ایھا الملک (یعنی اے بادشاہ السلام علیکم) کہہ کر خطاب کیا۔ اگرچہ امیر معاویہؓ کو امیر المومنین کی بجائے بادشاہ کہہ کر خطاب کرنا ناگوار گزرا لیکن ان کو خود بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ وہ مسلمانوں میں پہلے بادشاہ ہیں۔(۳۹)

امیر معاویہؓ اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ ۲۳ھ میں حضرت عثمانؓ نے پورے شام کا والی بنادیا تھا۔حضرت معاویہؓ کو سلطنت اموی کا بانی گردانا جاتا ہے۔امیر معاویہؓ بڑے حلیم اور بردبار تھے،لوگوں سے سخت وست سنتے تھے مگر خاموش رہتے تھے،بس سب کی لیتے تھے کرتے وہ تھے جو چاہتے تھے بڑی سے بڑی بات پر بھی غصہ سے دور رہتے تھے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب نظام خلافت ختم ہو چکا تھا اور ملوکیت کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔بنوامیہ کی خاندانی حکومت نے اسلامی خلافت کی جگہ لے لی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

"میں کہتا ہوں آنحضرت ﷺ کی وفات سے نبوت کا اختتام ہو گیا اور وہ خلافت جس میں باہم مسلمانوں میں تلوار نہ تھی حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ختم ہوئی اور اصلی خلافت حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت امام حسنؓ کی معزولی سے ختم ہوگئی اور ملک عضوض یعنی گزندہ کا وہ زمانہ ہے جس میں بنی امیہ سے صحابہؓ کی لڑائیاں رہیں اور بنی امیہ سختیاں کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت قائم ہوگئی اور جبر و سرکشی کا زمانہ عباسیوں کا ہے اس لئے کہ انہوں نے کسریٰ اور قیصر کی رسوم و آئین کے مطابق خلافت کی بنیاد ڈالی تھی۔ (۴۰)

امیر معاویہؓ بڑے تجربہ کار سپہ سالار تھے۔ عثمان غنیؓ کے دور میں، بحری بیڑہ تیار کر کے رومیوں سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ ان کے دور میں سندھ کی فتح کے ساتھ ہندوستان کی شمالی سرحد پر کئی مقامات فتح کیے گئے۔ بخارا، سمرقند کے بعد ترمذ اور شمالی افریقہ کے کئی علاقے فتح کیے گئے۔ قبرص تو دور عثمانی میں فتح ہو چکا تھا مگر حضرت معاویہؓ نے روڈس اور ارواد پر بھی فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ امیر معاویہؓ کے دور میں آہستہ آہستہ وہ خرابیاں نمو پا گئیں تھیں جو خلافت راشدہ میں پنپ نہ سکیں تھیں۔ اگرچہ اس کے خطرناک اثرات امیر معاویہؓ کے دور ہی میں شروع ہو گئے تھے لیکن آپ کے بعد اس کے نتائج اتنے مہلک ثابت ہوئے کہ اسلامی حکومت زوال کے دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ آپ نے اپنی وفات سے تقریباً دس سال قبل اپنے بیٹے یزید کو جانشین مقرر کر کے اور اسکی بیعت تمام زیر کنٹرول صوبوں سے حاصل کر کے اسلام میں ملوکیت و جبر کا وہ دروازہ کھول دیا جس نے امت کی شان و عظمت کو گھن کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا۔ ۸۷ سال کی عمر میں ۱۹ سال ۳ مہینے حکومت کی رجب ۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

یزید : امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد رجب ۶۰ھ میں تخت نشین خلافت ہوا۔ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں اس کی ولی عہدی کی بیعت لے لی تھی۔ انہوں نے طوعاً و کرھاً یزید کی اطاعت کرنے کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس کی اطاعت کی۔ لیکن عزیمت کی راہ پر چلتے ہوئے حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ حادثہ کربلا کا عظیم سانحہ اسی کے زمانے میں پیش آیا۔ یہ سیر و شکار کا شائق تھا، امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ یزید نے عقبہ بن نافع کو افریقہ کی فتوحات پر معمور کیا تھا۔ اسطرح اس کے دور میں رومیوں کے کئی مقبوضات کے ساتھ بحر ظلمات کے کنارے تک کا علاقہ فتح کر لیا گیا تھا۔ ۶۴ھ میں ۳ سال ۹ مہینے حکومت کر کے ۳۸ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

معاویہ بن یزید : یزید کے مرنے کے بعد ربیع الاول ۶۴ھ میں اس کا لڑکا معاویہ تخت حکومت پر بیٹھا۔ لیکن وہ بڑا ہی نیک اور دین دار شخصیت کا حامل تھا۔

اپنے باپ کے دور کی غلط کاریوں سے وہ بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا مشکل سے تین مہینے اس نے حکومت کی، پھر اس نے مسلمانوں کے سامنے تقریر کی کہ میں اس منصب سے دستبردار ہوتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ بنالو۔

مروان بن حکم : اگر چہ اہل حجاز نے عبداللہ بن زبیرؓ سے خلافت کی بیعت کی تھی۔ امویین نے آپ کے شام نہ آنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مروان کو ۶۴ھ میں خلافت کے لیے چن لیا۔ اس نے اپنے بعد اپنے بیٹے عبدالملک اور اس کے بعد عبدالعزیز کو ولی عہد بنادیا، رمضان ۶۵ھ میں مروان کا انتقال ہو گیا۔

عبدالملک بن مروان : عبدالملک نے علمائے دین سے فقہ حاصل کی تھی اسی لیے بڑے بڑے ائمہ اس کے علمی پایہ کے معترف تھے۔ اس کے علاوہ وہ بہادر بھی بہت تھا۔ رمضان ۶۵ھ میں یہ تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی دلچسپی کا رُخ داخلی معاملات میں زیادہ رکھا۔ پے در پے اندرونی خلفشار کی وجہ سے بیرونی ممالک کے فتوحات کی جانب کم پیش قدمی ہوئی۔ قیروان اور شمالی افریقہ مستقلاً مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ ۸۶ھ کو ۲۱ سال حکومت کر کے انتقال پا گیا۔

ولید بن عبدالملک : شوال ۸۶ھ میں ولید تخت حکومت پر بیٹھا۔ ولید کا زمانہ امن وسکون کا زمانہ تھا۔ خوش قسمتی سے اسے چند بہترین جرنیل مل گئے تھے۔ جنہوں نے ترکستان، چین، سپین اور سندھ کے علاقے فتح کر کے اسلامی حکومت کی سرحد کو چین سے لے کر وسط یورپ تک وسیع کر دیا تھا۔ ۹ سال اور چند ماہ حکومت کر کے جمادی آلاخر ۹۶ھ میں انتقال کر گیا۔

سلیمان بن عبدالملک : ولید کے انتقال کے بعد جمادی الثانی ۹۶ھ میں سلیمان تخت نشین ہوا۔ تقریباً تین سال حکومت کی۔ سلیمان نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کی خاطر ولید کے زمانہ کے تمام بڑے بڑے سپہ سالار اور جرنیل اور فاتح قتل کر دیئے۔ سلیمان کی اس ظالمانہ کنبہ پروری اور عظیم سپہ سالاروں کے قتل سے اسلام کی عظمت وسر بلندی کو بہت نقصان پہنچا۔ صفر ۹۹ھ میں انتقال ہوا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ : صفر ۹۹ھ میں سلیمان کے انتقال کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر بیٹھے۔ ان کی والدہ حضرت عمر فاروقؓ کی پوتی تھیں۔ یہ خود عبدالملک کے داماد تھے۔ خلافت سے قبل بیس برس سے زیادہ مصر کے گورنر رہے۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے نقش قدم پر چلنے کو اپنا شعار بنایا۔ ان کے دور خلافت کو خلافت راشدہ کا نمونہ اور تتمہ کہا جاتا ہے۔

انہوں نے پھر سے خلافت میں وہی جھلک پیدا کر دی جس کی نظیر صرف ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے دور میں مل سکتی تھی۔ جب تک خلافت کے منصب پر فائز نہیں ہوئے تھے، عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے تھے، خلافت کا منصب قبول کرنے کے بعد یکسر خشیت الٰہی کی تصویر بن کر رہ گے تھے، تقویٰ آپ کی فطرت بن گیا تھا سلیمان کی تدفین کے بعد جب گھر پہنچے تو پریشان تھے ایک کنیز نے پوچھا خیر تو ہے؟ جواب دیا مشرق و مغرب میں امت محمدی کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو، اور بغیر اس کے مطالبہ یا اطلاع کے جس کی ادائی مجھ پر فرض نہ ہو پھر بھلا میں پریشان کیسے نہ رہوں! ڈھائی سال کے قریب منصب خلافت پر فائز رہ کر رجب ۱۰۱ھ میں وفات ہوئی وفات کے وقت آپ کی عمر صرف ۴۰ سال کے قریب تھی! ابن سعد کی روایت ہے کہ بنو امیہ نے شرعی اصلاحات سے تنگ آ کر ایک غلام کو ہزار اشرفی انعام میں دی اور زہر دلوا کر آپ کی جان لی۔ یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ چند سال بھی عمر بن عبدالعزیزؒ اور زندہ رہ جاتے تو پھر اموی دور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا اور نظام اسلام منظم ہو جاتا۔ (۴۱)

یزید بن عبدالملک : ۱۰۱ھ میں یزید بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد تخت خلافت پر براجمان ہوا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تمام اصلاحات کو ختم کر کے دوبارہ عیش و عشرت اور بے راہ روی کو پروان چڑھایا جس کی وجہ سے خلافت کی بنیادیں کمزور ہو گئیں اور فتح و کامرانی کا سلسلہ رک گیا۔ اس کے بعد زوال و انحطاط نے ڈیرے جمانے شروع کر دیے۔ یزید نے اپنے بھائی ہشام بن عبدالملک کو خلیفہ اور اپنے بیٹے ولید کو اس کا ولی عہد نامزد کیا۔ شعبان ۱۰۵ھ میں یزید کا انتقال ہو گیا۔

ہشام بن عبدالملک : رمضان ۱۰۵ھ میں ہشام نے مسند خلافت سنبھالی۔ اس کی بیس سالہ حکومت ملکی معاملات اور مہمات کے حوالے سے بہت اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس نے ترکستان میں بغاوتوں کے سلسلے کو ختم کیا، آرمینیا اور آذربائیجان میں دشمنوں کو شکست دی۔ خزر کا علاقہ اور اس کے اطراف کی چھوٹی ریاستیں جو ارمنستان سے طبرستان تک پھیلی ہوئی تھیں فتح کیے۔ اسی طرح سندھ میں راجا داہر کا لڑکا جے سیہ مرتد ہو کر دوبارہ مقابلہ پر آمادہ ہوا تو اس کا قلع قمع کیا اس کے علاوہ مسلمانوں نے فرانس میں مزید پیش قدمی کی۔ ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں اس نے وفات پائی۔

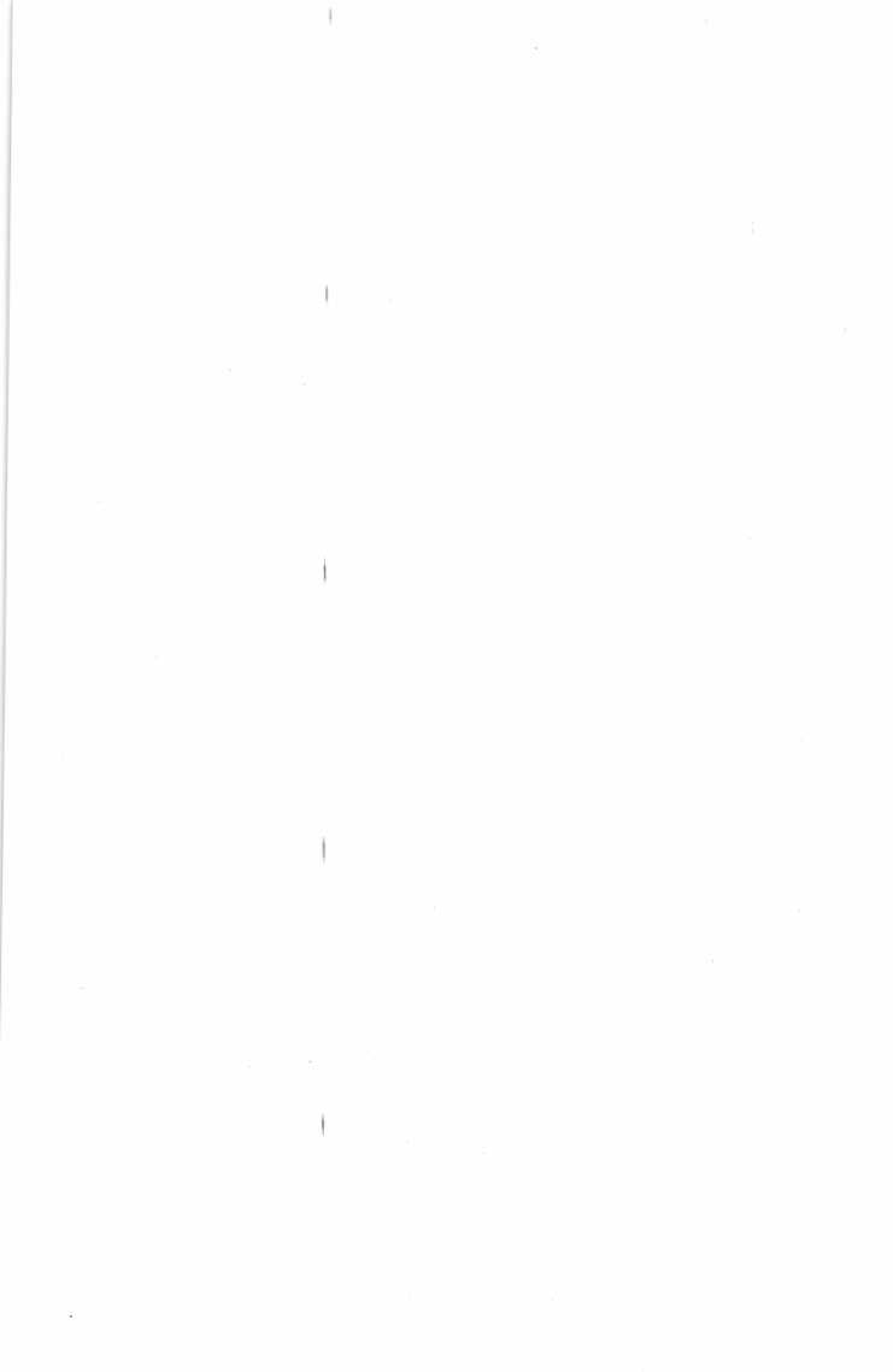
ولید بن یزید : ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں ولید بن یزید تخت حکومت پر بیٹھا، ایک سال دو مہینے حکومت کرنے کے بعد جمادی الثانی ۱۲۶ھ میں قتل کیا گیا۔ ہشام اس سے بہت نالاں تھا اس کے بجائے اپنے لڑکے مسلمہ کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔

لیکن یہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ وہ اس دنیا سے سدھار گیا، اور تخت حکومت پر یزید بیٹھ گیا۔ اس کے قتل کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے خوب شراب پیتا تھا، فسق اور مجور اس کی زندگی کا شعار بن چکا تھا ہوسنا کی، سفا کی، شقاوت اور ظلم اس کی خصوصیات زندگی میں شمار ہو سکتے ہیں یزید بن عبدالملک نے اسے شکست دی اور وہ قلعہ میں محصور ہو گیا، لوگ جب اسے قتل کرنے کے لیے اندر داخل ہوئے تو وہ حسب روایت ابن اثیر قرآن شریف کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گیا، اور کہنے لگا جس طرح قرآن پڑھتے ہوئے عثمان مارے گئے اسی طرح میں چاہتا ہوں میرا بھی خاتمہ ہو!

یزید بن عبدالملک : اسے یزید الناقص بھی کہتے ہیں، یہ رجب ۱۲۶ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا لیکن چھ مہینے بعد بعمر ۴۶ سال ۱۲۶ھ میں وفات پا گیا۔

ابراہیم بن ولید : یہ ذی الحجہ ۱۲۶ھ میں تخت پر بیٹھا اور چند ماہ بعد اس کا دور خلافت ختم ہو گیا۔ اس کے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی مخالفت اور بغاوت کا دور پھر شروع ہو گیا۔ جنہیں یزید بن عبدالملک نے ختم کر دیا تھا، وہ پھر زور و شور سے بغاوت کا پرچم لہراتے ہوئے میدان میں آ گئے ابراہیم نے بغاوت کو دبانے، باغیوں کا سر کچلنے اور چھنے ہوئے مقامات کو حاصل کر نے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا لیکن قسمت مخالف تھی، ہر تدبیر الٹی پڑی آخر وہ بھاگ نکلا، اور اس طرح اس کی خلافت اس کی زندگی ہی میں افسانہ پارینہ بن گئی۔

مروان بن محمد بن مروان : اسے مروان اطمار بھی کہتے ہیں، یہ صفر ۱۲۷ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا ابراہیم کو جو مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھگ کھڑا ہوا تھا، اسے قتل نہیں کیا بلکہ معاف کر دیا۔ مروان خاندان بنی امیہ کا آخری فرمانروا تھا، یہ اگر چہ بہت سی صلاحیتیں رکھتا تھا سریرآرائے خلافت ہوا تو حالات اتنے ناسازگار ہو چکے تھے کہ اس کے سنبھالے نہ سنبھل سکے، ہر طرف بغاوت، مخالفت، شورش ہنگامہ آرائی، عباسی خاندان کی طرف سے تبلیغ و دعوت کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا، اب یہ تحریک ابو مسلم خراسانی کے ہاتھ میں آئی یہ تاریخ کا عجیب و غریب انسان تھا۔ سراپا سحر و کرشمہ، بہر حال یہ میدان میں آیا اور بہت جلد اس نے اموی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ایک نئے خاندان (بنو عباس) کو برسر حکومت کر دیا۔ جس کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کبھی حکومت اس کے ہاتھ آئے گی۔ کیونکہ اصل دعوت امامت تو سادات کے لیے تھی لیکن وہ پس پردہ رہ گئے اور خاندان بنو عباس برسر حکومت ہو گیا۔ مروان اطمار ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں قتل ہوا اور اس کے قتل ہوتے ہی اموی خاندان کے جاہ و جلال اور حکومت کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ (۴۲)



عہد بنوامیہ پر ایک نظر:

بنوامیہ کی حکومت بانوے سال قائم رہی جس میں ملوکیت کے قیام واستحکام کو بہت اہمیت دی گئی۔ اگرچہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں ملوکیت کے نتائج شاید اس لیے برے نہیں تھے کہ کچھ عرصہ وہ محبت نبویؐ میں گزار چکے تھے۔ وہ اپنے دور اقتدار میں وہ ان تعلیمات کا بہت حد تک خیال رکھنے کی کوشش بھی کرتے رہے لیکن بعد میں ملوکیت کے زہر نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ سلطنت کے تین اعلیٰ ترین جرنیل امیر معاویہؓ، عبدالملک اور ہشام نے شام پر تقریباً بیس برس تک حکومت کی تھی۔ اور عربوں کی فتح کردہ سلطنت کے نہایت اعلیٰ منتظم تھے۔ وہ یونانیوں اور اہل فارس کے انتظامی طریقوں کو اپنی حکومت میں متعارف کروانے اور انہیں اپنانے میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے اور موخر اموی میں کئی ساسانی تیکنیکیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اور عباسیوں کے عہد میں یہ عمل اور بھی بڑھ گیا۔ عسکری فتوحات اب بھی تیزی سے جاری تھیں، بالخصوص الولید اول کے دور میں، حالانکہ اب عرب افواج کو دور دراز کوہستانی علاقوں اور شدید موسمی حالات میں لڑنا پڑتا تھا، اور اب لوٹ مار بھی اتنی آسانی سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ مصر کے مغرب میں سارے شمالی افریقہ میں قبضہ ہو چکا تھا 91/710 میں مسلمان افواج آبنائے جبل الطارق سے گزر کر سپین میں جا پہنچے، اور پھر کیرولنجی فرانس پر حملہ کیا۔ کاکیشیا سے پرے ترکوں کے ساتھ تعلق واسطہ بنا اور مشرقی اناطولیہ میں یونانی سرحدوں میں مداخلت کی گئی۔ مشرقی ایران میں خوارزم پر حملہ کیا گیا اور مقامی ایرانی حکمرانوں اور ان کے ترک حلیفوں کی مدافعت کے باوجود جیحون کے اس پار کا علاقہ اسلام کے لیے حاصل کر لیا گیا۔ انجام کار عرب سپہ سالار مکران کے راستے سندھ میں داخل ہوئے اور پہلی مرتبہ سرزمین ہندوستان میں اسلام کے بیج بوئے۔ (۴۳)

اموی دور میں اسلامی خلافت نے رقبہ کے لحاظ سے انتہائی وسعت اختیار کر لی تھی۔ اتنی وسیع سلطنت اب تک دنیا میں کسی قوم نے قائم نہیں کی تھی۔ ایرانیوں اور رومیوں کی سلطنتیں اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اتنی وسیع نہیں تھیں۔ اموی مملکت بھی خلافت راشدہ کی طرح مختلف صوبوں میں تقسیم تھی جن کا حاکم یا گورنر والی یا عامل کہلاتا تھا مشرق میں کوفہ کے والی کو اور مغرب میں مصر کے والی کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل تھی کہ ان کی حیثیت گورنر کی نہیں بلکہ گورنر جنرل کی تھی۔ مشرق کے سارے علاقے جو ایران، افغانستان، ترکستان، اور سندھ پر مشتمل تھے بالعموم کوفہ کے والی کے تحت ہوتے تھے اور وہی ان علاقوں کے لیے گورنر مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ سندھ اور ترکستان کوفہ کے والی حجاج بن یوسف ہی کی کوشش سے فتح کیے گئے۔ اسی طرح مغرب میں سارا شمالی افریقہ اور بعض صورتوں میں اندلس بھی یا تو مصر کے والی کے تحت ہوتے تھے یا شمال مغربی افریقہ کے والی کے تحت جس کا مرکز قیروان تھا، موسیٰ بن نصیر جن کی کوششوں سے اندلس اسلامی مملکت کا ایک حصہ بنا شمال مغربی افریقہ کے والی تھے۔

اموی دور میں بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت کئی نئے عہدے بھی قائم کیے گئے چنا چہ مرکزی حکومت کے حسب ذیل چار عہدے بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ کتابت، اس کا سربراہ کاتب کہلاتا تھا۔ خلیفہ کی ڈاک کھولنا، اس کی طرف سے فرمان جاری کرنا اور مہریں لگانا کاتب کا کام ہوتا تھا۔ کاتب موجودہ دور کا چیف سیکٹری تھا۔ حاجب، یہ بالکل نیا عہدہ تھا۔ اور امیر معاویہؓ کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا۔ کاتب بادشاہ اور حکام کے درمیان تحریری واسطہ تھا اور حاجب شخصی واسطہ تھا حاجب کی مرضی کے بغیر کوئی شخص خلیفہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ قاضی، یہ شعبہ قضا یعنی عدالت کا سربراہ ہوتا تھا۔ صاحب البرید، یعنی پوسٹ ماسٹر جنرل۔ یہ ڈاک کے محکمے کا سربراہ ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک نیا محکمہ تھا جو امیر معاویہؓ نے قائم کیا تھا۔ ان کے بعد اموی خلفا نے اس کو اور زیادہ وسعت دی۔ دفاعی نظام، مسلمانوں کی فوجی برتری خلافت راشدہ کی طرح بنی امیہ کے دور میں بھی قائم رہی۔ چین کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک خلافت اسلامیہ کے برابر بڑی فوج میدانِ جنگ میں نہیں لا سکتا تھا۔ بحری قوت میں بھی اس دور میں بہت اضافہ ہوا ۔شام مصر اور تونس میں جہاز سازی کے کارخانے قائم ہوئے جو دار الصناعہ کہلاتے تھے۔ اس دور میں بحیرہ روم میں مسلمان سب سے بڑی بحری قوت بن چکے تھے۔ سلیمان کے زمانہ میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں نے جو حملہ کیا تھا اس میں ایک ہزار آٹھ سو جہاز استعمال کیے گئے تھے۔ اس پہلے دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کسی بحری مہم میں اتنی کثیر تعداد میں جہازوں نے حصہ لیا ہو۔ تمدنی ترقی، بنی امیہ کا دور معاشی خوش حالی کا زمانہ تھا مشرق قریب کے وہ تمام علاقے جو اسلامی فتوحات سے پہلے ایرانیوں اور رومیوں کی مسلسل جنگوں کی وجہ سے اجڑ گئے تھے ایک بار پھر آباد ہو گئے۔ صد سالہ امن اور حکومت کی تعمیری حکمت عملیوں کے نتیجے میں زراعت وصنعت وحرفت کو فروغ ہوا۔ تمدنی ترقی کا اظہار زندگی کے ہر شعبہ میں ہوا اور اگر عمارتیں ایک ملک کی خوشحالی اور دولت مندی کا ثبوت ہوتی ہیں تو پھر اموی دور میں تعمیر ہونے والی عمارتیں اس دور کی خوشحالی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اب عہد خلافت راشدہ کی سادہ عمارتوں کی جگہ پختہ اور عالی شان عمارتوں نے لے لی۔ اموی دور کے فن تعمیر کا پہلا شاہکار قبۃ الصخرہ ہے جو عبدالملک کے زمانہ میں بیت المقدس میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے فن تعمیر کا یہ سب سے اچھا اور اولین نمونہ ہے جو آج بھی موجود ہے۔ (۴۴)

معاشرتی زندگی

اسلحہ سازی، جہاز سازی، پارچہ بافی، اور ظروف سازی اس زمانے کی خاص صنعتیں تھیں ہشام کے دور میں ریشمی کپڑے کی صنعت نے خاص طور پر ترقی کی تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جس طرح ولید کے دور میں لوگوں کی گفتگو کا موضوع عمارتیں اور عمر بن عبدالعزیز کے دور میں دینی باتیں ہوتی تھیں، اسی طرح ہشام کے دور میں گفتگو کا موضوع لباس اور کپڑے ہوتے تھے۔

اسلامی خلافت کی حدود میں آباد لوگوں کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی لیکن اسکی تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق پوری طرح نہ ہو سکی تھی ۔ تربیت کا یہ فرض صرف علماء تک محدود رہ گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کو چھوڑ کر حکومت نے اس معاملہ میں کبھی اس جذبہ کے تحت کام نہیں کیا۔ جو خلفاء راشدین کی خصوصیت تھا۔ چنانچہ اس دور کی معاشرت و ثقافت میں ہمیں کئی ایسی نئی باتیں نظر آتی ہیں ۔ جو اسلامی روح کے خلاف ہیں اور جو محض دولت کی فراوانی، استبدادی نظام حکومت اور نظریاتی تربیت کی کمی کی وجہ سے مسلم معاشرے میں داخل ہو گئیں اور اس طرح اس زوال کی رہ ہموار کر دی جس کی نشاندہی حضرت عمرؓ نے کی تھی ۔ رومی اور ایرانی اثرات کے تحت درباروں میں خواجہ سراؤں کا شرمناک رواج شروع ہوا۔ بڑے بڑے حرم وجود میں آئے جو کنیزوں اور لونڈیوں سے بھرے ہوئے تھے ۔ اس دور میں شراب نوشی ، موسیقی ، اور رقص کو پہلی مرتبہ ثقافتی مرتبہ ملا۔ محلوں کی آرائش میں تصویر کشی سے بھی کام لیا گیا۔ موسیقی کی سرپرستی دربار سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے ان امراء کے گھروں میں بھی جگہ پالی جو مذہبی رجحان نہیں رکھتے تھے ۔

علم و ادب

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں علمی و ادبی سرگرمیاں عباسی دور سے شروع ہوئی، لیکن صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز اموی دور ہی میں شروع ہو گیا تھا اور عباسی دور میں یہ سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں ۔ اموی دور کو علمی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک ابتدائی دور جس میں صحابہ ؓ معلم کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت انس بن مالکؓ اس دور کے مشہور اہل علم تھے ۔ احادیث کی بیشتر روایات ان ہی بزرگوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں ۔ دوسرا دور وہ ہے، جس میں تابعین نے معلموں کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم پر اسلامی مملکت کے ہر حصے سے احادیث کے مجموعے مرتب کر کے دمشق بھیجے گئے تھے جہاں سے ان کی نقلیں اسلامی دنیا کے ہر حصے میں بھیجی گئیں ۔ ان میں صرف وہ مجموعے جو امام زہریؒ نے مرتب کئے تھے کئی اونٹوں پر لادے گئے تھے ۔ انشاء اور خطوط نویسی نے اس دور میں ایک فن کی شکل اختیار کر لی ۔ اس زمانے میں اس فن کو کتابت کہا جاتا تھا۔ اور کاتب کی حیثیت ادیب اور انشاد پرداز کی ہوتی تھی ۔ (۴۵)

تاہم یہ انتظامی علمی معاشرہ، معاشرتی و معاشی ترقی اموی خلافت کو زوال سے نہ روک سکی ۔ خلیفہ کے تقرر کے وقت بیعت کا اہتمام محض نمائشی تھا۔ آزادی رائے مفقود ہو چکی تھی ، تنقید کا مطلب اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا ، بیت المال رعایا کی امانت کی بجائے بادشاہ کی ذاتی ملکیت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ ظلم و بربریت کی انتہا کر دی گئی تھی ۔

امیر معاویہؓ کے بعد شقاوت اور سفاکی ظلم اور بربریت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ عبدالملک کے دور حکومت میں جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو شکست دی تو ان کی لاش سولی پر لٹکا دی۔ کئی روز بعد جب ادھر سے اسماءؓ کا گزر ہوا تو بیٹے کی لاش کو سولی پر لٹکا دیکھ کر فرمایا۔ شہسوار ابھی سواری سے نہیں اترا؟'' قتیبہ بن مسلم بھی جس نے خاقان چین کو حکومت امویہ کا باج گزار بنا دیا تھا، سلیمان کے انتقام سے نہ بچ سکا، اس کی خطا یہ تھی کہ اس نے ولید کی اس رائے کی تائید کیوں کی تھی کہ سلیمان کی ولایت عہد منسوخ کر دی جائے۔ محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا، وہاں اسلام کا پرچم لہرایا، اس شان وعدل سے وہاں حکومت کی کہ ہندو اسکا بت بنا کر اظہار عقیدت کرنے لگے لیکن بغیر کسی خطا اور قصور کے سلیمان نے اسے معزول کر دیا معزول ہونے کے بعد وہ واپس آیا، تو قید خانے کے دروازے اس کے استقبال کے لیے کھلے ہوئے تھے، قید ہونے کے بعد تسکین قلب نہ حاصل ہوئی اور بالآخر وہ وہیں قتل کر دیا گیا۔

موسیٰ بن نصیر سپہ سالار اعظم تھا جس نے سارے اندلس پر اموی حکومت کا پرچم لہرایا، جس نے کرڑوں روپیہ مال غنیمت کے طور پر خزانہ شاہی میں داخل کیا، لیکن سلیمان کے اعتماد کا اہل وہ ثابت نہ ہو سکا سلیمان نے برسر اقتدار آتے ہی دنیا کے اس بہت بڑے فاتح اور جرنیل کو یہ انعام دیا کہ دھوپ میں کھڑا رکھا۔ برسر عام اس کی توہین کی اور کئی لاکھ روپے کا تاوان اس پر عائد کر دیا، جسے وہ نہ دے سکا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیائے دوں سے رخصت ہو گیا۔ حضرت زید بن علی کی نعش مبارک قبر سے نکلوا کر کوفہ کے حاکم نے سولی پر لٹکا دی۔ ولید بن یزید نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ہشام کے تمام عہدداروں کو برطرف کر دیا ، اوران پر اتنے ظلم ڈھائے کہ وہ ہشام کی قبر پر جا جا کر روتے تھے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے عہد خلافت میں حجاج کو پروان چڑھایا اور حجاج نے سفاکی، اور ندگی، شقاوت اور خونریزی کا ایسا ریکارڈ قائم کیا جس کی مثال نہیں مل سکتی ۔ جب ابوہبیرہ عراقین کا گورنر مقرر ہوا، یہ بڑا سخت گیر بھی تھا اور سیاست دان بھی، اس نے چاہا کہ ان تمام لوگوں کو ممنون کرم کر لے، جو علماء کی حیثیت سے ممتاز ہیں اور عوام پر اثر رکھتے ہیں، اس نے امام ابوحنیفہؒ کے سامنے بھی عہدہ پیش کیا مگر آپ نے ابی و متنع انکار کر دیا، امام کے انکار پر وہ بہت برہم ہوا، پہلے انہیں جیل میں ڈال دیا، جب اس پر بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ تو اس نے قسم کھائی کہ امام کو کوڑوں سے پٹوائے گا، اس نے اپنی یہ قسم پوری کی، بیس کوڑے مسلسل امام ابوحنیفہ کے سر پر لگائے گئے یہاں تک کہ آپ لہولہان ہو گئے۔ حضرت ابوبکر جصاص نے اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھا ہے، کہ حجاج منبر پر چڑھ جاتا اور اول فول بکنے لگتا، یہاں تک کہ نماز کا وقت قریب جاتا رہتا، نہ خدا سے ڈرتا تھا، نہ مخلوق خدا سے شرماتا تھا،

لا يقول له قائل الصلوة ايها الرجل ، والله حال دون ذالكالسيف والسوط!

کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کہتا اے شخص نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے (کیونکہ) اس معاملہ میں تلوار اور کوڑا حائل ہو جاتا تھا!

خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں ایک معمولی بدو برسرِ منبر خلیفہ وقت کو ٹوک سکتا تھا، اس کی گرفت کر سکتا تھا، اس پر اعتراض کر سکتا تھا، اسکا محاسبہ کر سکتا تھا، لیکن بعد میں یہ کیفیت نہ رہی عبدالملک نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے اندر، منبر رسول پر کھڑے ہو کر کہا۔

واللہ ماانابالخلیفة المستضعف واللہ لا یا مرفی احدبعد مقامی هذااتق اللہ ار ضربت عنقه

خدا کی قسم میں کمزور خلیفہ نہیں ہوں خدا کی قسم آج کے بعد گر کسی نے خوف خدا کی مجھے تلقین کی تو اس کی گردن اڑا دوں گا۔(۴۶)

بنوعباس

بنوعباس کا تعلق حضرت محمد ﷺ کے چچا حضرت عباس بن مطلب کے خاندان سے تھا۔ اسی حسب ونسب کو بنیاد بنا کر عباسی ایک تحریک لے کر کھڑے ہوئے کہ وہ خلافت چاہتے ہیں صرف اور صرف اس لیے کہ مسلمانوں کو بنوامیہ کے ظلم وستم سے نجات دلائیں اور اس لیے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ورثاء ہیں تو یہ ہی آپ ﷺ کے اوامر کو نافذ کرنے اور آپ ﷺ کے نواہی سے روکنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ عہد عباسیہ میں مسلمانوں کا کاروان فتح واقبال ترقی کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور تاریخ میں یہ دور جہاں دلچسپ ہے۔ وہاں پر سبق آموز بھی اور بالخصوص امت مسلمہ کے لیے کہ جن کا معاملہ دوسری فاتح قوم وملت سے بالکل الگ ہے۔

ابوالعباس عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح: (۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ)

بنی امیہ کے خاتمہ کے بعد ابوالعباس عبداللہ بن محمد تخت خلافت پر بیٹھا۔ خلافت کی بیعت عراق پر عباسیوں کے قبضہ کے بعد ربیع الاول ۱۳۲ھ میں ہوئی اور مروان کے قتل کے بعد ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں وہ دنیائے اسلام کا خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کا زمانہ زیادہ تر فتنوں کے دبانے اور نئی حکومت کے استوار کرنے میں گزرا۔ "سفاح" کے لفظی معنی خونریز کے ہیں۔ اس نے بنی امیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کیا اور بنوامیہ نے ۴۰ھ (سال شہادت حضرت علیؓ) سے لے کر اپنے آخری دور ۱۳۲ھ تک ۹۲ برس میں اہل بیت اور طرفداروں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا سفاح نے اس کا انتقام پانچ ہی برس میں لینا چاہا، سینکڑوں امویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا، یہاں تک کہ بنی امیہ کی قبریں اکھاڑ کر ان کی ہڈیاں جلائی گئیں اور خراسانیوں کے ہاتھوں نئی عباسی حکومت کا رعب بٹھانے کے لیے بہت کچھ مظالم کا ارتکاب کیا گیا۔(۴۷)

اس کے دور میں داخلی فتنوں کا سد باب کیا گیا اور ساتھ ہی فتوحات کی طرف قدم بھی اٹھایا گیا۔ ختن، چاچ، فرغانہ اور کش کے علاقے فتح کر کے عباسی حکمراں مقرر کیے گئے۔ اہم سرگرمیاں جو ابوالعباس سفاح نے انجام دیں ان میں دشمن عناصر کا قلع قمع اور سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کرنا۔ مکہ مکرمہ اور کوفہ کے درمیانی راستے پر میلوں کی علامتیں نصب کیں، سلطنت کے دارالحکومت دمشق سے عراق میں انبار شہر کی طرف منتقل کر دیا اور اس شہر کا نام ھاشمیۃ الانبار رکھ دیا، بیٹھ کر خطبہ دینے کی بدعت کو ختم کیا۔ جسکو سلف امیوں نے اپنا لیا تھا۔ کالے رنگ کو سلطنت عباسیہ کا شعار قرار دیا۔ ابوالعباس سفاح نہایت ہوشیار تھا محفلوں اور امور عامہ کے ماہرین کو پسند کرتا تھا۔ اور اس کی ایک خاصیت یہ تھی کہ اس نے ادب کو تقویت دی، شعر سے لگاؤ رکھا اور شعراء کا اکرام کرتا تھا۔ سفاح نے چیچک کا مرض لاحق ہونے سے شہر انبار میں ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔

ابوجعفر المنصور: (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ)

سفاح کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر عبداللہ بن محمد بن علی بن عباس خلیفہ ہوئے اور یہ اپنے بھائی سفاح سے عمر رسیدہ تھے ۔ ان سے تمام اسلامی سلطنتوں کی جانب سے خلیفہ المنصور کے نام سے بیعت کی گئی، انہوں نے نہایت عقل مندی، شعور و حکمت سے سلطنت کے امور کو انجام دیا اور اس کی بنیادوں کو مستحکم بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے عباسی حکومت کا حقیقی بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اگر چہ سفاح نے اپنے عہد میں بنوامیہ اور ان کے ماننے والوں کا قلع قمع کر دیا تھا اور اسی چیز نے منصور کو مطمئن کیے رکھا تھا مگر چند بغاوتیں اس کے دور میں ہوئیں، عباسی خاندان کے کچھ افراد نے خلافت کا دعویٰ کر کے جن میں عبداللہ بن علی کی بغاوت بھی شامل تھی اور دوسری طرف ابومسلم کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی جس سے خلیفہ منصور خائف رہتا تھا اس نے ان دونوں کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد اہل خراسان کی بغاوتیں ہوئیں، موصل میں خارجیوں کی طرف سے شورشیں ہوئیں۔ اسی طرح محمد بن عبداللہ نفس زکیہ وغیرہ کی بغاوت کا بھی منصور نے بڑی چالاکی وعیاری سے خاتمہ کیا۔ اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کے باوجود بیرونی فتوحات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ منصور کے دور میں کوہستان، طبرستان اور دماوند کے علاقوں کی فتح کے علاوہ سندھ کی فتوحات میں بھی اضافہ ہوا۔ تعمیر کے کاموں میں سے وہ اہم کام جو جعفر منصور نے انجام دیئے وہ بغداد شہر کی تعمیر ہے۔ منصور نے سن ۱۴۵ ہجری مطابق ۷۶۲ء میں ساسانیہ کی پرانی بستی کو توڑ کر اپنے نئے دارالحکومت کی تعمیر کا حکم جاری کیا اور اس پرانی بستی کا نام بغداد ہے اور یہ شہر انجینئرنگ ،فن تعمیر اور انوکھی ڈیزائننگ کے فن میں اپنی مثال آپ تھا، وسط میں خلیفہ کا محل تھا جس کا نام ''باب الذھب'' رکھا تھا۔ اس کے ایک طرف عظیم الشان مسجد تھی اور شہر بغداد (دارالسلام) علم وادب کا منارہ اور اسلامی ثقافت کا عالمی مرکز بن گیا۔ منصور کے دور میں صنعت وحرفت اور تجارت نے ترقی کی تھی جس کی وجہ سے رعایا خوش حال تھی۔

اس کے علاوہ منصور نے علمی وادبی تحریک کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے فارسی و یونانی کتابوں کو عربی زبان میں ترجمہ کی طرف اور فقہ، علم ریاضیات، علم فلکیات اور علم طب کی کتابوں کی طرف علماء کو متوجہ کیا اور اس کے زمانہ میں موطا امام مالک اور فقہ حنفی کی کتابیں رائج ہوئیں خلیفہ منصور کی وفات سن ۱۵۸ہجری مطابق میں ہوئی اس نے اپنے بیٹے مہدی کو ولی عہد مقرر کیا۔

محمد مہدی: (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ)

محمد المقلب بہ مہدی نے اپنے والد منصور کی وفات کے بعد سن ۱۵۸ھ میں خلافت کا عہدہ سنبھالا۔ مہدی کی عفو پسند طبیعت نے سب سے پہلے جس کام کو انجام دیا وہ قتل کے مجرموں کے سوا سب کی رہائی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے نااہل گورنروں کو معزول کر دیا جو اس منصب کے لائق نہیں تھے۔ اور اس نے مقدمات میں بہتری کے لیے ایک مجلس مشاورت تشکیل دی۔ اس کا مقصد سنت کی ترویج، رعایا کی خبر گیری، بدعت کی بیخ کنی اور ملحدین کا صفایا کرنا تھا۔ زندیقیوں کی بغاوت جس میں ایک خراسانی ملحد حکم بن حاکم نے خدائی دعویٰ کیا تھا اس کا خاتمہ کیا۔ رومیوں کے ساتھ چند معرکے ہوئے۔ ۱۶۵ھ میں اپنے بڑے بیٹے ہارون الرشید کو ایک لاکھ فوج کے ساتھ قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور رومیوں نے نوے ہزار سالانہ خراج پر صلح کر لی۔ سندھ کے علاقے میں بھی چند فتوحات ہوئیں۔ مہدی نے سن ۱۶۹ھ میں وفات پائی اور اس کی مدت خلافت دس سال رہی۔

ہادی بن مہدی:

مہدی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہادی خلیفہ بنا۔ البتہ اس کی حکومت کی مدت ایک سال دو ماہ سے زیادہ نہ رہی۔ اپنے باپ کی طرح یہ بھی لامذہبوں اور زندیقیوں کے خلاف تھا۔ اس کی خلافت کے زمانہ میں حجاز کے اندر ایک خطرہ حسین بن علی کی بغاوت کی صورت میں امنڈ آیا تو اس نے محمد بن سلیمان عباسی کی قیادت میں حسین بن علی کی تحریک کو کچل دیا۔ ہادی نے اپنے بھائی ہارون رشید کو ولایت سے معزول کر کے اور اس کی جگہ اپنے بیٹے جعفر صغیر کو ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی اس خواہش کو پوری کرنے پر قادر ہوتا اس کو موت نے آلیا اور اس کی وفات سن ۱۷۰ھ میں ہوئی۔

ہارون رشید: (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ)

سن ۱۷۰ھ میں جس وقت ہارون رشید نے خلافت سنبھالی اس وقت اس کی عمر ۲۲ سال تھی۔ اس کے والد مہدی نے اس کو اس لشکر کی قیادت سونپی تھی۔

جس نے روم پر حملہ کیا اور وہ چڑھائی کرتا ہوا قسطنطنیہ کے دروازوں کے قریب پہنچ گیا تھا اور روم کی ملکہ ایرین پر جزیہ مقرر کیا تھا۔ اس کی قیادت اور مہم نے امور مملکت، معاملات زندگی اور شہروں کے احوال نے قیادت کی صفت اس کے اندر پیدا کر دی تھی۔ حق بات تو یہ ہے کہ اس کا زمانہ استقرار، رفاہ عام، پیش قدمی اور سلطنت عباسیہ کے سنہری دور کو فروغ دینے میں شمار کیا جاتا ہے جو کہ تاریخ میں رقمطراز ہے، اور بادشاہوں، دنیا کے اہل ثروت وعزت لوگوں نے رشید کی دوستی کی قدر کی، اس طویل زمانہ میں مشرق میں کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جس کی شہرت عالم میں اس قدر پھیلی ہو جیسی شہرت ہارون رشید کی ہوئی، اس کے زمانہ میں بڑی بڑی تصنیفات کے مجموعے اور مختلف لغات میں کئی کتابیں نشر ہوئیں جیسا کہ اس کی کمال عقل، قوت ادراک، برجستہ کلام کی سرعت اور کرم وسخاوت اور اس کا طرب وغنا اور شعر کی مجالس کے محبوب رکھنے کے بہت سارے قصے روایت کیے گئے ہیں۔ بہرحال رشید متقی و پرہیزگار، اعمال خیر کو پسند کرنے والا اور خوب عطایا دینے والا شخص تھا۔ (۴۸) مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ دیندار اور علم دوست فرد تھا۔ بیت الحکمہ کے نام سے تالیف وتراجم کا ادارہ اسی نے قائم کیا تھا۔ ہارون نے اپنے عہد میں مختلف بغاوتوں اور شورشوں کا دور کیا۔ ہارون رشید کی خلافت کا پہلا مرحلہ یحیٰی بن خالد کی مدد کی وجہ سے ممتاز رہا، جس نے ہارون کی بچپن میں تربیت کی۔ مختلف اوقات میں کئی قسم کے جھگڑے اور مختلف داخلی فتنے برپا ہوئے ان تمام کا ہارون رشید نے خاتمہ کر دیا، مثلاً یمنیین اور قیسیین کے درمیان فتنہ جو خانہ جنگی کی صورت اختیار کر چکا تھا، سن ۱۸۰ھ میں ختم ہوا۔ ہارون کے عہد میں رومیوں سے بہت سے معرکے یکے بعد دیگرے ہوئے اور ان کی سلطنت کا بیشتر حصہ مسلمانوں کی تسلط میں آ گیا۔ منصور کے بعد مراکش کا علاقہ عباسی خلافت کے اقتدار سے نکل گیا تھا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں ایک اور علاقہ جو افریقہ کہلاتا ہے اور موجودہ طرابلس، تونس اور الجزائر پر مشتمل تھا۔ نیم خودمختار ہو گیا۔ مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کا انتظام چونکہ مشکل ہو رہا تھا اس لیے ہارون نے یہاں کی حکومت مستقل طور پر ایک شخص ابراہیم بن اغلب کے اور اس کی اولاد کے سپرد کر دی۔ اس طرح افریقہ میں ایک نئی حکومت کی بنیاد پڑ گئی جو اغالبہ یا خاندان اغالب کی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ اغلبی حکومت عملاً خودمختار تھی لیکن عباسی خلافت کو تسلیم کرتی تھی اور ہر سال باقاعدگی کے ساتھ خراج دیا کرتی تھی جو اس کا ثبوت تھا کہ یہ حکومت عباسی خلافت کا ایک حصہ ہے...... ہارون رشید نے اپنی سلطنت اپنے دو بیٹوں امین و مامون میں تقسیم کر دی۔ امین کو مغربی ایران اور عراق سے افریقہ تک تمام مغربی ملک دے دیئے اور مامون الرشید کو ایران کا بڑا حصہ اور دریائے سندھ تک تمام مشرقی ملک مل گئے۔ ہارون کی وفات کے بعد مامون الرشید نے خراسان کے شہر مرو کو اور امین نے بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ہارون رشید جیسے عقل مند بادشاہ کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی مضبوط سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کمزور کر دیا مثل مشہور ہے کی ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔

چنانچہ امین و مامون میں جلد ہی لڑائی شروع ہوگئی جس میں بڑی خونریزی ہوئی اور کئی سال تک عراق اور اس سے ملے ہوئے صوبوں میں بدامنی رہی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس جنگ میں مامون کو، جو حکومت کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا کامیابی ہوئی اس طرح عباسی سلطنت ایک بار پھر متحد ہوگئی۔ اگر مامون سلطنت کو پھر سے متحد کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو عباسیوں کا زوال پچاس سال پہلے ہی شروع ہو جاتا۔(۴۹)

مامون رشید: (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ)

ہارون رشید کے بعد اگر کسی اور عباسی خلیفہ کا عہد ہارون کے دور کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ مامون الرشید کا دور حکومت ہے۔ اس زمانہ میں عراق خصوصاً شہر بغداد ہنگاموں کی نظر ہو گیا ان ہنگاموں کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مامون اپنے شیعہ اتالیق اور نگرانوں کی وجہ سے حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہو گیا تھی اور وہ حضرت علیؓ کی اولاد کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتا اس معاملہ میں وہ یہاں تک بڑھا کر اس نے امام علی بن موسیٰ رضا کو جو شیعوں کے آٹھویں امام ہیں اپنا ولی عہد مقرر کر دیا اس فیصلے نے عباسی شہزادوں میں بے چینی پیدا کر دی اور انہوں نے عراق میں بغاوت کر دی مامون کو بالآخر اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا اور مرو چھوڑ کر بغداد آنا پڑا ۲۰۴ ہجری میں بغداد پہنچنے کے بعد ہنگامے فرو ہو گئے اور مامون کی خلافت کے باقی چودہ سال امن وامان میں گزرے۔ مامون کے زمانہ میں طبرستان کا علاقہ بھی ہنگاموں کی زد میں رہا۔

مامون کے دور کا ایک اور اہم واقعہ جزیرہ صقلیہ اور جزیرہ کریٹ کی فتح ہے۔ صقلیہ قیروان کے اغلبی حکمرانوں کی کوشش سے فتح ہوا جو عباسی خلافت کے باجگذار تھے اور کریٹ کا جزیرہ اندلس سے نکلی ہوئی مسلمانوں کی ایک جماعت نے فتح کیا۔ مامون کے دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے زمانہ میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ اشروسنہ اور قابل کے حکمرانوں نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا۔ مامون عادت واطوار میں اپنے باپ کی طرح تھا۔ بلکہ وہ ہارون کے مقابلہ میں زیادہ نرم دل تھا۔ وہ فیاض بھی ہارون سے زیادہ تھا اور علم وادب کی اس نے جس طرح سرپرستی کی اس کی مثال شاید تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ مامون کو عدل وانصاف کا بڑا خیال تھا وہ ہر اتوار کو رعایا کی شکائتیں سنتا تھا۔(۵۰) مامون بڑا نرم دل اور منکسر المزاج تھا۔ نہایت سادگی اور بے تکلفی سے رہتا تھا۔ علوم وفنون کی ترقی کے لیے مامون کے عہد کا زریں باب ہے۔ علم دین کے علاوہ اس کو علم ہیئت اور علم ریاضی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے ماہرین کی مدد سے دو مرتبہ کرہ زمین کی پیائش کروائی۔ مامون نے علم وادب کی خدمت کے سلسلے میں اپنے والد کی طرح کام کیا۔ دیگر زبانوں سے ترجمہ کا کام مامون کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ عقائد کے لحاظ سے وہ مجموعہ اضداد تھا۔ اسی نے خلق قرآن کے نظریہ کو فلسفہ کی روشنی میں اسلام اور کفر کا پیمانہ سمجھ لیا تھا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔

معتصم (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ)

مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم باللہ تخت پر بیٹھا اس کے زمانہ میں فوجی طاقت میں بڑا اضافہ ہوا۔ اور اس نے ایرانیوں کا زور توڑنے کے لیے ترکوں کو آگے بڑھایا اور اس مقصد کے لیے ترکوں کی فوج تیار کی۔ معتصم کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ روم پر حملہ ہے۔ معتصم اس مہم کے دوران عموریہ اور انقرہ کی قلعہ بندیوں کو ڈھاتے ہوئے قسطنطنیہ کے قریب تک پہنچ گیا تھا مگر جب اس کو اپنے بھتیجے عباس کی بغاوت کی اطلاع ملی تو وہ یہ مہم نامکمل چھوڑ کر بغداد واپس آ گیا۔ معتصم کے عہد کا ایک دوسرا اہم واقعہ بابک خرمی کی بغاوت کا خاتمہ ہے۔ بابک خرمی ایک غیر مسلم ایرانی تھا اور اس نے ایک ایسی تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو گمراہ اور بے دین کرنا تھا۔ مامون اپنے عہد میں اگرچہ اس تحریک پر قابو نہ پا سکا تھا مگر معتصم نے مکمل خاتمہ کر دیا۔ معتصم کے عہد کا افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ اس نے امام احمد بن حنبلؒ کو قرآن کو مخلوق ماننے سے انکار پر نہ صرف سختیاں کیں بلکہ کوڑے بھی لگوائے۔ ۲۲۷ھ میں معتصم چند روز بیمار رہ کر وفات پا گیا۔

واثق:

معتصم کے بعد اس کا لڑکا واثق باللہ تخت و تاج کا مالک بنا۔ اپنے باپ کے برعکس واثق فضل و کمال اور علم و فن کا دلدادہ تھا۔ عقائد کے لحاظ سے واثق بھی معتزلہ سے ہمدردی رکھتا تھا۔ ۲۳۲ھ میں اس نے وفات پائی۔

متوکل: (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ)

واثق کے بعد اس کا بھائی متوکل تخت خلافت پر بیٹھا۔ متوکل کا دور عباسی خلافت کے عروج کا آخری دور ہے۔ اس کے عہد میں خوشحالی عام تھی اور چیزیں بہت سستی ملتی تھیں۔ متوکل طبیعت کا بھی نرم تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ سے پہلے کے خلفاء رعایا پر اس لیے سختی کرتے تھے کہ وہ اس سختی کی وجہ سے ان کی فرمانبردار رہیں۔ لیکن میں نرمی کرتا ہوں کہ رعایا مجھ سے محبت کرے۔ متوکل نے خلق قرآن کی سرپرستی ختم کر دی اور اس قسم کے مسئلوں پر مناظرے اور مباحثے بند کرا دیے۔ متوکل بہرحال ایک بادشاہ تھا کسی جمہوری حکومت کا سربراہ نہیں تھا۔ بادشاہ کے اندر جو خودسری اور اپنی بات منوانے کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ متوکل میں بھی تھا۔ اور اس نے اس کا اظہار بڑے بھونڈے طریقہ سے کیا۔ متوکل حضرت علیؓ کی اولاد کی طرف سے ہمیشہ بغاوت کا خطرہ محسوس کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح رومیوں سے مسلسل سرحدی لڑائیوں کی وجہ سے وہ مملکت کی عیسائی آبادی کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ آل علیؓ سے متعلق اس نے اپنے جذبہ کا اظہار اس طرح کیا کہ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا مزار ڈھا دیا۔

اور عیسائیوں سے متعلق اس نے اپنے جذبہ کا اظہار، ان پر بعض پابندیاں عائد کر کے کیا۔ ان میں ایک پابندی یہ تھی کہ وہ مخصوص لباس پہنا کریں۔ (۵۱)

ترکی متوکل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ بغا نے دس سپاہیوں سمیت ایک رات قصر خلافت میں گھس کر شوال سن ۲۴۷ھ متوکل اور اس کے وزیر خاقان کو قتل کر دیا۔ اس کی مدت خلافت تقریباً چودہ سال دس ماہ رہی۔

خودمختار خاندانوں کی ابتداء: متوکل کے قتل سے عباسی حکومت کے زوال کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے جانشین ترک سپاہیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ کیونکہ اب تخت و تاج دلانے والے وہی تھے۔ باپ کی نامزدگی یا امراء کا انتخاب بیکار تھا۔ دوران حکومت میں بھی اگر ترک خوش نہ رہتے تو متوکل کی طرح ہر وقت قتل کا خطرہ تھا۔ اس لئے خلافت برائے نام رہ گئی۔ متوکل کے چار جانشینوں منتصر، مستعین، معتز اور مہتدی نے ترکوں کے رحم و کرم سے تھوڑا تھوڑا عرصہ حکومت کی۔ اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی حاکموں نے خودمختار ریاستیں قائم کرلیں۔ (۵۲)

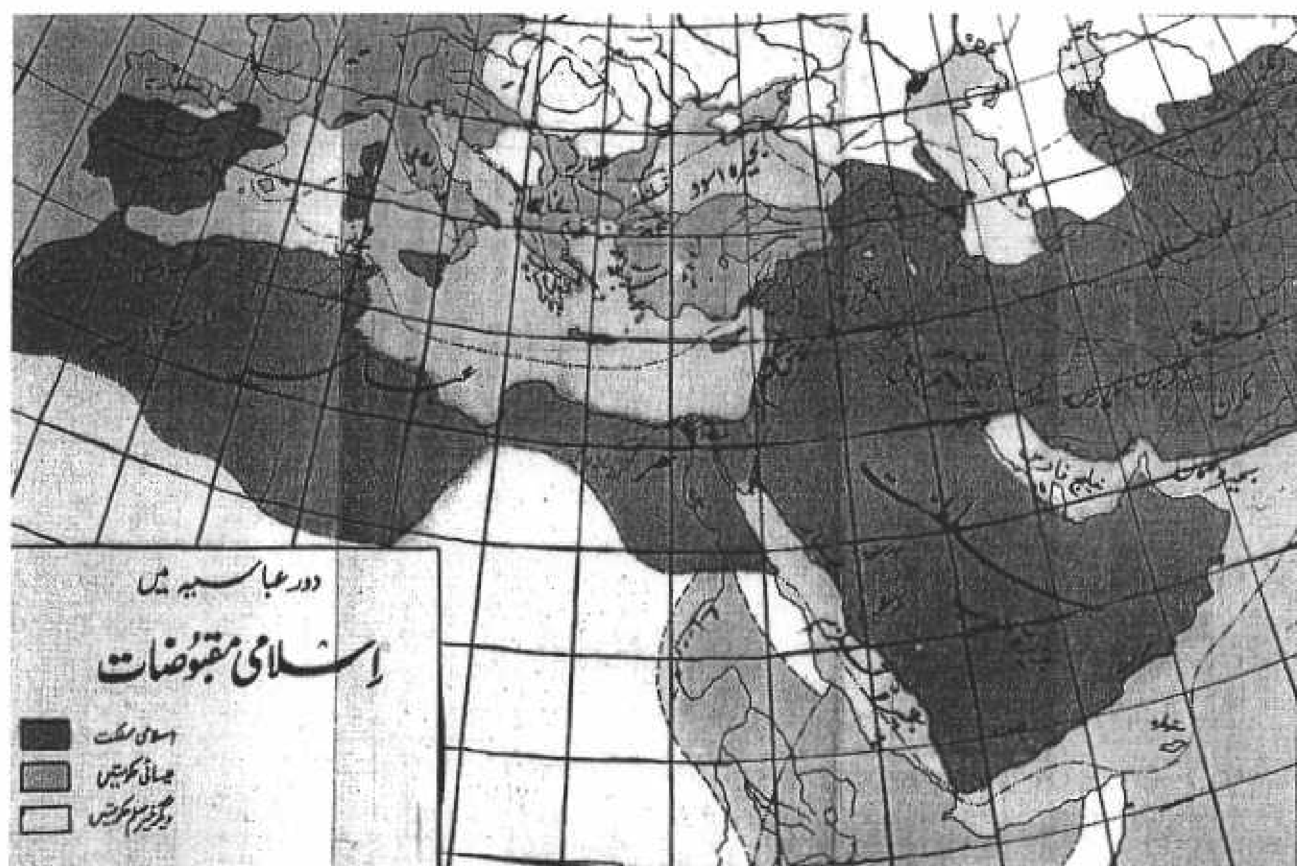
دربار سے اسلامی روح اور اسلامی نظریہ فکر اسی وقت رخصت ہو چکا تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہوئی تھی لیکن اب سیاست کی بنیاد ملت اسلامیہ کے مفاد کے بجائے حکمران کی ذاتی مصلحت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عباسیوں نے ابتدائی دور میں اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کو بعد میں معتصم نے اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ڈر کر ترکوں کو آگے بڑھایا۔ ان ترک فوجی افسروں میں سب مسلمان بھی نہیں تھے اور تربیت یافتہ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب حکمرانوں اور ایرانی امراء اور وزراء کی طرح یہ ترک بھی ہر بات مسلم امہ کے مفاد کے بجائے ترکوں کے مفاد میں سوچتے اور اسلامی نصب العین کو نظر انداز کر کے نسلی اور وطنی بنیاد پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے لگے۔ دور زوال کے عباسی حکمرانوں میں بعض بہت اچھے اور قابل تھے اور انہوں نے زوال کو روکنے کی کافی کوشش کی ان حکمرانوں میں ایک مہتدی ہے۔ اس نے عباسی خلافت کو زیادہ سے زیادہ اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز کے راستے پر چلنے دو تا کہ میں بنو عباس میں بھی عمر بن عبدالعزیز جیسی مثال پیدا کرسکوں۔ لیکن اجڈ ترکوں نے اور ان شاہی حکام اور امراء نے جو اسلامی پابندیوں سے گھبراتے تھے مہتدی کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور یہ خلیفہ ترکوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مہتدی کو گرفتار کرنے کے بعد ترکوں نے اس سے سوال کیا کہ تم لوگوں کو ایسے راستے پر کیوں چلانا چاہتے ہو جس سے وہ ناواقف ہیں۔ مہتدی نے جواب دیا کہ میں لوگوں کو رسول ﷺ اہل بیت نبویؐ اور خلفاء راشدین کے طریقے پر چلانا چاہتا ہوں۔ اس پر ترکوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا سابقہ ایسے لوگوں سے تھا۔

جو دنیا سے کنارا کش اور آخرت کی طرف مائل تھے اور تمہارے ساتھی ترک خزر وغیرہ ایسی قومیں ہیں جو اُخروی فرائض سے ناواقف ہیں اور ان کی زندگی کا مقصد دنیاوی فائدے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ایسی حالت میں تم کیونکر راستہ پر چلا سکتے ہو۔ ترکوں کا یہ جواب اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ تیسری صدی ہجری کے وسط تک دربار کا ماحول کس حد تک غیر اسلامی ہو چکا تھا۔ (۵۳)

معتضد:

دورِ زوال میں جس خلیفہ نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں وہ موفق کا لڑکا معتضد ہے۔ جو معتمد کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا۔ معتضد نے ترکوں کا زور توڑ دیا ایک وسیع علاقے میں جو عرب، عراق، مغربی ایران، اور آرمینیہ پر مشتمل تھا پھر سے امن وامان قائم کر دیا اور عباسی حکومت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا۔ اس کے عہد میں مصر وشام کی طولونی حکومت نے بھی عباسی خلافت کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے جانشین مکتفی کے زمانہ میں مصر وشام براہ راست عباسی خلافت کے قبضے میں آگئے اپنے کارناموں کی وجہ سے معتضد کو سفاح ثانی یعنی عباسی خلافت کا دوسرا بانی کہا جاتا ہے.... معتضد کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے تین لڑکے مکتفی باللہ، معتضد باللہ اور قاہر باللہ کے نام سے تخت نشین ہوئے مکتفی اچھا حکمران تھا لیکن اس کے بعد صورت حال پھر بگڑ گئی۔ اس کے جانشین معتضد باللہ نے پچیس سال حکومت کی لیکن سارا زمانہ ہنگاموں اور شورشوں کی نذر ہو گیا۔ یہ حکمران تن آسان، عیش پرست اور شراب وکباب کا رسیا تھا چنانچہ دربار ناچنے اور گانے والیوں کا مرکز بن گیا۔ اس نے دربار کے اخراجات بے حد بڑھا لیے تھے شاہی محل میں گیارہ ہزار خواجہ سرا تھے۔ معتضد اور مکتفی کے زمانے میں سرکاری خزانہ بھرا رہتا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہو گیا کہ فوج کی کئی کئی ماہ کی تنخواہ چڑھ جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امراء نے پھر زور پکڑا اور معتضد باللہ کو معزول کر کے قتل کر دیا۔ مقتدر باللہ کے عہد کا ایک خاص واقعہ بلغار میں اسلام کی اشاعت ہے۔ بلغار میں روس دریائے والگا کے کنارے اس جگہ جہاں اب شہر کازان آباد ہے ترکوں کا ایک شہر تھا یہاں کے حکمران اسلام قبول کرنے کے بعد ایک وفد بغداد بھیجا تا کہ وہ بلغار کے علاقہ میں اشاعت اسلام اور مسلمانوں کو تعلیم دینے کے معاملے میں خلیفہ سے مدد طلب کرے۔ مقتدر باللہ نے درخواست قبول کرتے ہوئے ابن فضلان کی قیادت میں ایک جماعت بلغار بھیج دی... مقتدر باللہ کے جانشین اور بھائی قاہر باللہ کے عہد مین مقتدر کے دور کی عیاشی کے خلاف سخت ردِعمل ظاہر ہوا۔ لیکن یہ ایک جذباتی ردِعمل تھا۔ اس کے پیچھے نہ کوئی فکر کام کر رہی تھی اور نہ کوئی جماعت تھی۔ قاہر باللہ مذکورہ بالا اقدامات کے باوجود خود نہ شراب چھوڑ سکا اور نہ حسین لونڈیوں کی صحبت ترک کر سکا۔

مسلمانوں کی گرتی ہوئی اخلاقی حالت کے خلاف اسی قسم کا ایک ردعمل بغداد میں قاہر کے جانشین راضی باللہ کے عہد میں عوامی سطح پر بھی ہوا۔امام احمد بن حنبل کے پیروؤں نے جو حنبلی کہلاتے تھے عوامی سطح پر احتساب شروع کردیا... اس کے پیچھے نہ کوئی ٹھوس فکر تھی اور نہ کوئی منظم جماعت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حنبلیوں کی یہ تحریک اصلاح حنبلیوں اور شافعیوں (امام شافعی کے پیرو) کے جھگڑے میں تبدیل ہو کر ختم ہو گئی۔ مختصر یہ کہ حکمرانوں کی عیش پرستی، نااہلی، امراء کی خودسری اور اخلاقی زوال کے نتیجے میں خلافت کی حدود پھر گھٹنا شروع ہوگئیں۔ راضی باللہ کا جانشین متقی باللہ اگرچہ اسم بامسمیٰ تھا یعنی اپنے نام کی طرح نیک اور زاہد تھا لیکن اس کے علاوہ اس میں کوئی اور خوبی نہیں تھی نظام حکومت درہم برہم ہو چکا تھا۔ بالآخر مغربی اور جنوبی ایران میں قائم ہونے والی حکومت بنی بویہ کے ایک حکمران معزالدولہ نے ۳۳۴ھ میں بغداد پر قبضہ کرلیا۔ خلافت اب بھی قائم رہی کیونکہ مسلمان خلافت کو اسلامی سیاسی نظام کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ اور ایک خلیفہ کے بعد دوسرے خلیفہ تخت خلافت پر بیٹھتا رہا لیکن ان خلفاء کو اختیار حاصل نہیں تھا۔ حکومت دوسروں کی تھی۔ یہ حالت دو سال تک رہی اس کے بعد عباسی خلفاء پھر آزاد ہو گئے ان کی حکومت عراق تک محدود رہی۔ وہ کوئی بڑی سلطنت قائم نہ کر سکے... عباسی خلافت کے عروج کا زمانہ ۱۳۲ھ سے ۲۴۷ھ تک ہے اس کے بعد زوال شروع ہو گیا اور ۳۳۴ھ میں بنو بویہ کے ہاتھوں عباسی خلفاء کی خودمختاری ختم ہو گئی۔ (۵۴)


دور عباسیہ میں
اسلامی مقبوضات
اسلامی سلطنت
عیسائی حکومتیں
دیگر غیر مسلم حکومتیں

بنو عباس پر ایک نظر:

مسلمانوں کے تمدنی اور ثقافتی عروج کا بہترین دور عباسی خلافت کا دور تھا۔ عباسی خلافت اگر چہ بنی امیہ کی خلافت کے مقابلے میں کم وسیع تھی کیونکہ اندلس اور مراکش عباسیوں کے دائرہ اثر سے باہر تھے۔ لیکن اس کے باوجود عباسی خلافت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت یا سیاسی وحدت تھی۔ سلطنت کی وسعت کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بنی عباس کا زمانہ فتوحات کا زمانہ نہیں تھا کیونکہ اسلامی حکومت اتنی وسیع ہوگئی تھی، کہ اس کا سنبھالنا ہی مشکل تھا۔ دریائے سندھ سے بحراوقیانوس تک پانچ ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ اس وسیع وعریض سلطنت میں بے شمار قومیں آباد تھیں مثلاً ترک، پٹھان، سندھی، ایرانی، کرد، عرب، مصری، بربر اور اندلسی بے شمار قومیں آباد تھیں۔ اس کے علاوہ تمام مذہب کے ماننے والے اسلامی مملکت میں تھے۔ لہٰذا ایسی وسیع وعریض اور بے شمار لوگوں سے بھری ہوئی سلطنت کو سنبھالنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے عباسیوں کی توجہ فتوحات سے زیادہ امن قائم کرنے کی طرف رہی۔ علاوہ ازیں اب مسلمانوں کا جوش جہاد اور وہ تازہ جوش جو ابتداءِ اسلام میں تھا، ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مسلمان اب مشقت کی زندگی کی بجائے شہر کی آرام دہ زندگی کے عادی ہونے لگے تھے۔ عباسیوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملک کی خوشحالی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کو ترقی دی۔ اس کے علاوہ ان کا ایک بڑا عسکری کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رومیوں کو اس قدر شکستیں دیں کہ انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت میں غنیمت سمجھی۔ اور ہر سال خراج دینے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو رومیوں پر اتنا زیادہ غلبہ دور بنی امیہ میں کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ عباسی خلافت بنی امیہ کی طرح ایک خالص عرب خلافت نہیں تھی۔

اس دور میں ایرانی، ترک اور دوسری اقوام بھی مختلف حیثیتوں سے حکومت میں شریک ہوگئیں۔ خلیفہ اور اس کا خاندان عرب تھا، حکومت کے نظم ونسق میں ایرانیوں کا اور فوج میں ترکوں کا غلبہ تھا۔ بنی امیہ کے دور میں ان کے عربی تعصب کی وجہ سے عجمی قوم پرستی کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، بنی عباس کے زمانے میں وہ پوری قوت سے بھڑک اٹھی اور اس نے صرف عربی عصبیت کے خلاف نہیں بلکہ خود اسلام کے خلاف زندقہ کا ایک محاذ قائم کر دیا..... عباسی حکومت بھی اموی حکومت کی طرح ملوکیت تھی اور حقیقی معنوں میں خلافت نہیں تھی۔ یہاں بھی باپ کے بعد بیٹا یا کوئی قریبی عزیز حکمران ہوتا تھا۔ ملوکیت کے خاتمے اور خلافت کے احیاء کی کوشش کا خیال اب مسلمانوں کے سیاسی نظریات سے تقریباً خارج ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں عمر بن عبدالعزیز کی طرح کسی نے احیائے خلافت کی کوشش نہیں کی۔ عباسی دور کے معاشرے پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے اثر ورسوخ اور مذہب سے دلی لگاؤ کے باوجود معاشرے میں غیر اخلاقی اور غیر صحت بخش سرگرمیوں میں اموی دور کے بعد مزید اضافہ ہوا۔

قبل از اسلام کے ایران میں کاہن، رمال اور نجومیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی..... اسلام نے یہ کہہ کر کہ اللہ کے علاوہ تقدیر کا حال کوئی نہیں بتا سکتا، نجومیوں اور رمالوں کے پیشہ پر کاری ضرب لگائی تھی لیکن جب عباسی خلافت پر ایرانیوں کا اثر بڑھا تو نجومیوں اور رمالوں کا یہ کاروبار پھر چمک اٹھا اور یہ وبا اسلامی دنیا میں ایسی پھیلی کہ اب تک اس کے اثرات موجود ہیں۔ غلامی کا رواج اس دور میں بھی تھا۔ اگرچہ اسلام میں صرف جنگ کی صورت میں غلام بنانے کی اجازت تھی، لیکن اس دور میں نظام غلامی نے باقاعدہ کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔ (۵۵) دور عباسیہ میں تصویر کشی سے زیادہ موسیقی نے غیر اسلامی فن کے طور پر فروغ پایا۔ عباسی نظام حکومت میں ایک بڑی تبدیلی جو ہوئی وہ وزیر کا نیا عہدہ قائم کیا گیا تھا جو اموی دور میں نہیں تھا۔ نظامِ عدالت بھی بہتر حالت میں تھا۔ اس کے علاوہ زرعی نظام بھی قریب قریب وہی تھا جو اموی دور میں تھا۔ بغداد میں کپڑے کے کاریگر مختلف رنگوں کے اونی چادریں ، باریک ململ اور ریشمی کپڑے بنانے میں نامور تھے۔ علوم وفنون اور تصنیف اور تالیف جس کا آغاز بنی امیہ کے دور میں ہو گیا تھا اس دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئے یونانی فارسی، سریانی، سنسکرت سے کتابوں کے بکثرت ترجمے کیے گئے ۔عراق کے شہروں کے علاوہ دمشق، اصفہان، رے نیشاپور، ہرات، بخارا، اسکندریہ، فسطاط، قیروان، خوارزم اور سمرقند بھی بڑے بڑے شہر تھے جن میں سے بعض بصرہ اور کوفہ سے کم نہیں تھے یہ تمام شہر نہ صرف صنعت وحرفت اور تجارت کے بلکہ علمی سرگرمیوں کے بھی مرکز تھے۔ عباسی اگرچہ فتوحات وملک گیری سے دور رہے مگر تمدنی، علمی اور ادبی ترقی میں چار چاند لگا گئے ۔بغداد کی عظمت بھی علم وفن اور تہذیب اور تمدن کی وجہ سے تھی۔ فقہ اسلامی کی تدوین، جمع احادیث اور ترتیب وتالیف عباسی دور کا سنہرا علمی کارنامہ ہے۔ فقہ حنفی، شافعی ، مالکی اور حنبلی اسی طرح فقہ جعفریہ اور صحاح ستہ جیسی مستند کتابیں اسی زمانہ میں مدون کی گئیں۔

اس دور میں نہ صرف تاریخ، سیرت وسوانح عمریوں پر مختلف کتابیں مثلاً سیرت ابن ہشام، فتوح البلدان، تاریخ طبری ،طبقات اور مروج الذہب (مسعودی) وغیرہ لکھی گئیں بلکہ اس دور میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم مثلاً کیمیا، طب، ریاضی، فلکیات، فلسفہ وغیرہ نے بھی ترقی کی۔ ادب اور شاعری پروان چڑھے۔ علم نحو وصرف اور لغت وغیرہ کا باقاعدہ اہتمام ہوا۔ اس علم کے سب سے بڑے ماہر اور مصنف خلیل نحوی ،سیبویہ، اور اصمعی تھے ۔ خلافت عباسیہ کے عروج زمانہ تک (۲۴۷ھ) اندلس اور مراکش کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو چھوڑ کر باقی ساری اسلامی دنیا عباسی خلافت کے ماتحت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس وقت تک سیاسی لحاظ سے بڑے متحد تھے۔ اور عباسی خلافت کے زوال کے بعد اس اتحاد اور وحدت کا خاتمہ ہو گیا۔ لہٰذا جس صوبہ کے والی کو جہاں موقعہ ملا وہاں اس نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس طرح مرکزی حکومت کی جگہ کئی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں چند قابل ذکر حکومتیں ہیں۔

دولت سامانیہ: (۲۶۱ھ تا ۳۹۵ھ)

ماوراء النہر میں قائم ہونے والی یہ حکومت اپنے مورث اعلیٰ اسد بن سامان کے نام پر یہ خاندان سامانی کہلاتا ہے۔اس کا دار الحکومت بخارا تھا۔ نصر بن احمد بن اسد سامانیوں کی آزاد حکومت کا پہلا حکمران تھا اس کے علاوہ موجودہ افغانستان اورخراسان بھی سامانی سلطنت میں شامل تھے۔ سامانیوں کے کل ایک سو چونتیس ۱۳۴ سالہ حکومت میں ان کے دس حکمران ہوئے۔اسی دور میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلا اور چوتھی صدی کے انتہا تک کاشغراوراس سے ملحق علاقے میں اور شمالی ترکستان اور والگا کی وادی میں اسلام پھیل گیا۔عہد سامانی میں بھی علم وادب مکمل سرپرستی کی گئی۔اس دور میں فارسی زبان کی ترقی اہمیت کی حامل ہے۔

بنی بویہ: (۳۳۴ھ تا ۴۴۷ھ)

بنی بویہ، سامانیوں کی طرح دوسری بڑی حکومت جو اس زمانے میں قائم ہوئی وہ بنی بویہ یا دیالمہ کی تھی۔اس خاندان کا مورث اعلیٰ ابوشجاع بویہ تھا چونکہ اس خاندان کا تعلق بحیرہ خزر کے ساحل کے علاقے دیلم سے تھا اس لیے بنی بویہ کو دیالمہ بھی کہا جاتا تھا۔اس کے تین بیٹے علی، حسن اور احمد تھے انہوں نے ایران کے مختلف حصوں کو فتح کر کے خود مختار حکومتیں قائم کرلیں اور خلیفہ کو اپنی کمزوری کے باعث ان کی خود مختاری تسلیم کرنی پڑی۔احمد جو سب سے چھوٹا تھا عراق فتح کرنے کے بعد ۳۳۴ھ میں بے دھڑک بغداد میں جا داخل ہوا۔وہاں اس وقت مکتفی کی حکومت تھی جو متقی کے بعد تخت خلافت پر متمکن ہوا تھا۔اس نے بجائے مقابلہ کے احمد کا استقبال کیا اور معز الدولہ کا خطاب دے کر اسے امیر الامراء بنادیا۔حکومت کی باگ دوڑ اب معز الدولہ کے ہاتھوں میں آگئی۔یہاں تک کہ سکہ اور خطبہ میں بھی اس کا نام خلیفہ کے ساتھ شریک کرلیا گیا۔

بنی بویہ فرقہ شیعہ سے تعلق رکھتے تھے۔اس لئے انہوں نے اپنے دوران اقتدار میں شیعی عقائد کو رواج دینے کی پوری پوری کوشش کی۔بغداد میں چونکہ اکثریت سنیوں کی تھی،اس لئے وہاں بہت سی شورشیں ہوئیں اور کئی لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے۔

آل بویہ میں سب سے دانشمند مدبر اور ممتاز حکمران عضد اللہ دیلمی ہوا ہے جس کے عہد میں اس خاندان کی شان و شوکت حد کمال کو پہنچ گئی۔اس کی وفات کے بعد دیلمی حکومت زوال پذیر ہوگئی خاندان کے افراد میں باہم اتفاق نہ رہا اور انہوں نے جداگانہ حکومتیں قائم کرلیں۔بغداد پر دیلمی اقتدار ۱۱۳ سال تک رہا۔(۵۶)

بنی بویہ کے کئی حکمران اور وزیر علم وادب کے بڑے سرپرست تھے۔س زمانہ کے مشہور طبیب اور فلسفی بوعلی سینا (۳۷۰ھ تا ۴۲۸ھ) مسلم سائنس دانوں میں ابن الہشیم (۳۵۴ھ تا ۴۳۰ھ) کا نام بھی قابل ذکر ہے۔''رسائل اخوان الصفا'' جو کہ فلسفہ کی مشہور کتاب ہے اسی دور کی ہے۔

سلطنتِ فاطمیہ (۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ)

سلطنت فاطمیہ کا نام حضور اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ یہ حکومت ۲۹۷ھ میں شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی۔ اس سلطنت کا بانی عبیداللہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے تھا۔ عبیداللہ تاریخ میں مہدی کے لقب سے مشہور ہے۔ اب تک جو حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ اگرچہ خود مختار تھیں لیکن سب بغداد کی خلافت کو تسلیم کرتی تھیں اور جمعہ کی نماز کے خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام پڑھتی تھیں۔ لیکن فاطمی حکمرانوں نے عباسی خلفاء کا نام خطبہ سے نکال دیا اور خود خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ شروع میں فاطمی حکومت شمالی افریقہ تک محدود رہی لیکن المعز الدین اللہ نے ۳۵۸ھ میں بصرہ بھی فتح کر لیا۔ المعز فاطمی حکومت کا قابل حکمران تھا۔ قاہرہ شہر کی بنیاد اسی کے زمانے میں پڑی۔ اس کے عہد میں جامع ازہر کے نام سے قاہرہ میں ایک مسجد تعمیر کی گئی جو بعد میں دینی علوم کی ایک یونیورسٹی بن گی۔ یہ دنیا کا سب سے پرانا مدرسہ ہے۔ المعز کے بعد اس کا لڑکا عزیز بھی ایک قابل حکمران تھا اس کے دورِ حکومت میں حجاز، شام اور یمن پر بھی فاطمیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ جسکی وجہ سے فاطمی حکومت مسلمانوں کی بڑی سلطنت بن گئی۔ یہ حکومت ۲۹۶ھ سے ۵۶۷ھ تک پونے تین سو سال قائم رہی۔ ۵۶۷ھ میں خلفائے فاطمیہ کے آخری خلیفہ کا انتقال ہو گیا تو شام کے حکمران نورالدین نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا جس کے بعد مصر میں ڈھائی صدی گزرنے کے بعد عباسی خلیفہ کا نام خطبہ میں لیا جانے لگا۔

سلطنت غزنویہ: (۳۶۶ھ تا ۵۸۲ھ)

سامانی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد سبکتگین نے غزنی میں ایک آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ جو تاریخ میں دولت غزنویہ اور آل سبکتگین کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت لاہور میں ایک ہندو راجہ جے پال حکومت کرتا تھا۔ اس کی حکومت کابل تک پھیلی ہوئی تھی اور سبکتگین کی سرحدوں کو چھو رہی تھی۔ راجہ جے پال نے سبکتگین کی حکومت مستحکم ہوتی دیکھی تو ایک بڑی فوج لے کر غزنی کی حکومت پر حملہ کر دیا لیکن لڑائی میں سبکتگین نے اس کو شکست فاش دے کر مسلمان پہلی مرتبہ درہ خیبر کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے۔

محمود غزنوی: (۳۸۷ھ تا ۴۲۱ھ)

سبکتگین کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا محمود غزنوی تخت پر بیٹھا۔ آل سبکتگین کا سب سے بڑا بادشاہ محمود تھا۔ وہ اسلامی تاریخ کا مشہور حکمران، کامیاب سپہ سالار اور بڑا فاتح تھا۔ سلطان محمود ستائیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی، تیس سالہ حکومت کے دور دورہ میں اس نے آرام حرام قرار دے رکھا تھا، اس کا پاؤں ہمیشہ رکاب ہی میں رہا، عراق سے وادی گنگا اور خوارزم سے کاٹھیاواڑ گجرات تک اس کا جولان گاہ تھا۔ کسی لڑائی میں اس نے شکست نہ کھائی، حالانکہ اس کا مقابلہ بہترین جنگجو دلیر سپاہیوں سے ہوا۔ وسط ایشیا کے ترک اور ہندوستان کے راجپوت اس کے سامنے جھک گئے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، محمود کو ہندوستان کا بادشاہ کہنا صحیح نہیں۔ اس نے اس کا کوئی حصہ اپنی مملکت میں شامل نہ کیا جو دراصل عراق سے غزنی تک ہی تھی۔ پنجاب کا الحاق اس نے مجبوراً کیا، محمود نے جب قنوج پر حملہ کیا تو یہاں کے راجا راجپال نے اطاعت اختیار کی، محمود غزنی کی طرف لوٹا تو راجپوت راجوں کی غیرتِ قومی حرکت میں آئی، قنوج کے راجہ کو قتل کیا اور اس کے خاندان کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا، اس کا سرغنہ "چندل" کالنجر کا راجہ تھا، محمود کو اطلاع ہوئی تو راجہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے پھر لوٹا۔ چندل بھاگ گیا، راستہ میں راجہ ترلوچن پال پسر انگ پال پسر جے پال کی طرف سے کچھ مزاحمت ہوئی، اس لئے اسے برطرف کر کے لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا، جو اس کا مشہور غلام ملک ایاز تھا۔ (۵۷)

محمود کا آخری بڑا حملہ سومنات پر ہوا۔ اس کے بعد محمود نے منصورہ فتح کر کے سندھ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ہندوستان پر محمود کے سترہ حملوں کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ محمود ایک بڑا فاتح اور سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک رعایا پرور، عادل اور علم و ادب کا بڑا مربی و سرپرست تھا۔ عباسی خلفاء کی طرح علم و فن کی سرپرستی کی شعراء میں سب سے مشہور فردوسی اس کے دور کے ہیں۔ محمود غزنوی کے بعد غزنی کی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ محمود کے بعد اس کا لڑکا مسعود تخت پر بیٹھا۔ مسعود کے آخری دور میں ترک سلاجقہ نے غزنوی سلطنت کے شمال اور مغربی حصوں پر قبضہ کر لیا۔

مسعود بن محمود غزنوی نے خراسان کو سلاجقہ سے بچانے کا ارادہ کیا، لیکن وہ ناکام ہوا اور دنداقان کے قریب ۴۳۱ھ میں اس نے شکست کھائی اور اسی کے ساتھ خراسان میں غزنوی حکومت زوال پذیر ہوگئی۔ دور زوال کے غزنوی حکمرانوں میں سلطان ابراہیم (۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ) کا کردار سب سے اہم ہے۔ اس نے اپنے چالیس سالہ دور حکومت میں سلطنت کو مستحکم کرتے ہوئے سلجوقیوں سے اچھے تعلقات قائم کیے اور ہندوستان میں مزید فتوحات کیں اور دہلی تک غزنی کی سلطنت کو وسیع کر دیا۔

۵۴۴ھ میں علاء الدین حاکم غور نے غزنی پر قبضہ کر لیا اور شہر میں آگ لگا دی۔ اسی سے "جہاں سوز" کا لقب پایا۔ سلطان بہرام غزنی کی بربادی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اسی غم میں ہندوستان واپس آ کر ۵۴۷ھ میں اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے لڑکے خسرو شاہ ۵۴۷ھ، ۵۵۵ھ نے غزنی ہی میں اپنا تخت بچھانا چاہا مگر غوری آن موجود ہوئے اس لئے وہ نامراد ہندوستان واپس آیا۔ اب غزنویوں کا مامن یہی ہندوستان تھا اور ان کا پایۂ تخت غزنی کے بجائے لاہور تھا۔ (۵۸)

سلطنتِ سلاجقہ:

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد مسلم دنیا دوسو سال تک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم رہی۔مگر اس کے بعد آل سلجوق نے ایک مرتبہ پھر مسلم دنیا کے ایک بڑے حصے کو پھر متحد کر دیا۔ یہ سلجوقی نسلاً ترک تھے۔ جب محمود مشرق میں مصروف تھا تو ترکمانوں کی ایک جماعت میدانوں سے نکل کر ماورالنہر میں آباد ہوگئی، سلطان محمود نے ان سے اطاعت کا وعدہ لے کر ان سے معمولی خراج لینے پر اکتفا کی، یہی سلطان کی غلطی تھی۔اس جماعت کو کمزور کرنے کی غرض سے سلطان محمود نے ان میں سے ایک قبیلہ کو ان کے سردار سلجوق کی رہنمائی میں خراسان میں جلاوطن کر دیا، خراسان میں سلجوقیوں نے طاقت پکڑنا شروع کی۔ (۵۹)

جب غزنوی سلطنت کو زوال ہوا تو غزنوی حکمرانوں سے سلجوقیوں کی خراسان میں خوب لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ سلطان مسعود کو شکست دینے کے بعد سلجوقیوں نے سلجوق کے پوتے طغرل بیگ کو اپنے قبیلے کا سردار چن لیا۔ طغرل بڑا قابل سپہ سالار تھا اسی نے غزنوی حکمران مسعود کو شکست دے کر خراسان میں سلجوقی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔خراسان میں حکومت مضبوط کرنے کے بعد اس نے ایران فتح کیا اور بغداد میں داخل ہوگیا جو اس وقت بنی بویہ کے قبضہ میں تھا۔۴۵۵ھ میں سلطنتِ سلجوقیہ کے ستون مضبوط ہونے کے بعد طغرل بک کی وفات ہوگئی۔

الپ ارسلاں (۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ)

طغرل بک کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلاں تخت نشین ہوا۔الپ ارسلاں نے پہلے مرحلے میں خراسان اور ماوراءالنہر اٹھنے والی سرکش تحریکات کو ختم کر دیا پھر آرمینیا، جورجیہ اور بلاد شام کو فتح کر کے سلجوقیوں کی سلطنت کو اور وسیع کر دیا۔ ایشیائے کوچک کے پاس رومی شہنشاہ کو زبردست شکست دینے کی وجہ سے اس کو شہرت دوام ملی۔اس کے بعد اس کا لڑکا ملک شاہ تخت پر بیٹھا۔اس کے دور میں سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ملک شاہ نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا، اس نے تمام بلاد شام کو فاطمیوں سے چھین لیا۔اس کے علاوہ یمن، عمان اور چین بھی سلجوقی سلطنت کے ماتحت آ گئے۔ملک شاہ نے بیس سال حکومت کی۔اس نے اپنی سلطنت کا سارا انتظام اپنے وزیر نظام الملک کے سپرد کر دیا تھا۔نظام الملک کی قابلیت اور کارگزاری کی بنیاد پر الپ ارسلاں نے تخت نشینی کے بعد قلمدان وزارت سے نوازا تھا۔ذاتی وصف و کمال کے ساتھ ساتھ وہ علم دوست اور علماء نواز تھا۔ اس نے سلطنت کے ہر حصے بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل اور عراق میں بڑے بڑے مدرسے قائم کیے۔جو اس کے نام پر نظامیہ کہلاتے ہیں ان مدرسوں میں سب سے بڑا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا۔تعمیر پر دو لاکھ دینار خرچ کیئے تھے۔ نظام الملک کو ملک شاہ کے انتقال سے چند ماہ قبل ایک شخص نے جو باطنی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا قتل کر دیا۔

سلاجقہ کا آخری طاقت ور حکمران سلطان سنجر تھا جس نے بڑی حد تک سلجوقی سلطنت کے بڑے حصے میں ایک مستحکم حکومت قائم کر دی مگر اس کے بعد انتشار و خانہ جنگی نے نہ صرف تمام سلطنتوں کے حصے بکھرے کر دیئے بلکہ فلسطین پر یورپ کی مسیحی اقوام نے قبضہ کر لیا۔ ملک شاہ کے سلجوقیوں کے دور حکومت میں طغرل کا دارالحکومت شہر رے تھا۔ الپ ارسلان اور سنجر کا مرو اور ملک شاہ کا دارالحکومت اصفہان ۔ یہ شہر نہ صرف اس زمانہ کے علم و ادب کے مرکز بنے بلکہ یہاں عالی شان عمارتیں، مدرسے، شفاخانے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ سلجوقی دور کے اہل علم وفن شخصیات جو ممتاز تھیں، ان میں امام غزالیؒ (۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ) بلند پایہ عالم دین صوفی و فلسفی، فارسی کا مشہور شاعر عمر خیام (۴۴۰ھ تا ۵۲۶ھ) بڑا ریاضی دان، جلال الدین رومی (۶۰۴ھ تا ۶۷۲ھ) کے علاوہ جاراللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) لغت اور ادب کے امام اور محمد بن عبدالکریم شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) اپنے زمانے کے بہت بڑے ماہر علم کلام۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (۴۷۰ھ تا ۵۶۱ھ) ایک بہت بڑے مصلح تھے۔ سلاجقہ دور کے روشن پہلو اور تمام ترقیوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں اخلاقی لحاظ سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا۔

سلطنت غوریہ: (۵۵۲ھ تا ۶۰۲ھ)

غزنی کی سلطنت کے خاتمے کے بعد غوری خاندان کی حکومت اگرچہ صرف پچاس سال قائم رہی لیکن تاریخ اسلامی میں اس کو اس وجہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے زمانہ میں شمالی ہند میں اور مشرقی پاکستان میں پہلی مرتبہ اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی۔ ۵۵۱ھ میں علاؤالدین جہاں سوز جس نے غزنی شہر کو تہہ و بالا کر دیا تھا، انتقال کر گیا۔ لیکن اس کا لڑکا سیف الدین ثانی جو بہترین صلاحیت و عقائد کا حامل تھا تخت پر بیٹھتے ہی غور کے علاقے سے قرامطہ کا اثر ختم کر دیا۔ غور کے خاندان نے حقیقی اہمیت سیف الدین کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے حکومت کرنے والے دو بھائیوں غیاث الدین اور شہاب الدین محمد غوری کے زمانہ میں حاصل کی جو سیف الدین ثانی کے چچا زاد بھائی تھے۔ غیاث الدین غوری نے ۵۶۷ھ میں غزنی کو مکمل فتح کر کے شہاب الدین محمد غوری کو سلطان معزالدین کا خطاب دیا اور غزنی کے تخت پر بٹھایا۔ غیاث الدین نے اسکے بعد ہرات اور بلخ بھی فتح کر لیے اور ہرات کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد ۵۷۵ھ میں محمد غوری نے پشاور اور ۵۷۶ھ میں دیبل کو فتح کر کے بحیرہ عرب کے ساحل تک غوری سلطنت کو وسیع کر دی۔ شہاب الدین نہایت عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان تھا۔ وہ شروع سے ہی ہندوستان کو فتح کرنے کا آرزومند تھا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ضروری تھا کہ پنجاب کو پہلے کی طرح تاج و تخت غزنین کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے لاہور پر حملہ کیا اور آخر کار دو مرتبہ ناکامی کے بعد ۱۱۸۶ء میں فتح کر لیا۔ خسرو ملک جو لاہور میں دولتِ غزنویہ کا آخری نشانی تھا۔

گرفتار کر کے غور بھیج دیا گیا۔ پنجاب پر قبضہ ہو جانے کے بعد شہاب الدین غوری کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنا یونہی آسان تھا کہ اس کو مزید قوت اس سے پہنچی کہ اس وقت قنوج اور دہلی و اجمیر شمالی ہند میں راجپوتوں کی یہ دو مضبوط اور طاقت ور حکومتیں تھیں۔ قنوج کی حکومت جے چند کے قبضے میں تھی اور دہلی اور اجمیر کی سلطنت کا فرماں روا پرتھوی راج تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان دونوں میں سخت پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور اس کا اثر یہ تھا کہ شمالی ہند کے اعیان و امراء میں سے کچھ لوگ جے چند کی حمایت کرتے تھے اور دوسرے لوگ پرتھوی راج کے ساتھی تھے۔ اس موقع کو غنیمت جان کر غوری نے ۱۱۹۱ء میں بھٹنڈہ پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا.... دو سال بعد اس نے پھر پر ہندوستان پر حملہ کیا۔ پرتھوی راج خود بھی بڑا بہادر تھا اور پھر جنگ میں آیا بھی تھا، بڑے تزک و احتشام اور ساز و سامان کے ساتھ لیکن بایں ہمہ غوری کو فتح ہوئی۔ پرتھوی راج کا صف اول میں لڑتے ہوئے گرفتار ہونا تھا کہ پوری فوج میں بھگدڑ مچ گئی، اور آخر کار اجمیر تک کا علاقہ سلطان کے قبضہ میں آ گیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر غوری ہندوستان میں اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنے نائب کی حیثیت سے چھوڑ کر غزنین واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد قطب الدین نے دہلی بھی فتح کر لی۔ ۱۱۹۴ء میں غوری نے شمالی ہند کی دوسری راجپوت حکومت یعنی قنوج پر حملہ کیا۔ جے چند بڑی جگر داری اور بہادری سے لڑا۔ لیکن آخر کار شکست کھائی اور غوری اسے فتح کر کے افغانستان چلا گیا۔ بعد ازاں قطب الدین نے گجرات اور بختیار خلجی نے جو قنوج میں غوری کا نائب تھا۔ پہلے اودھ اور بہار اور پھر مغربی بنگال فتح کرلیا۔

اس میں شک نہیں کہ اب شہاب الدین غوری ہندوستان کے ایک بڑے حصہ پر قابض تھا۔ لیکن یہ فتوحات پے بہ پے اس سرعت کے ساتھ حاصل ہوئی تھیں کہ ان کا انتظام خاطر خواہ طریقہ پر نہ ہوسکتا تھا۔ جگہ جگہ بغاوت اور فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے، سب سے زیادہ زور شمالی ہندوستان میں تھا۔ جہاں ایک قوم کھوکر نے قیامت برپا کرر کھی تھی۔ ۱۲۰۶ء میں سلطان ان کی بغاوت فرو کرنے خود غور سے ہندوستان آیا۔ اس سے فارغ ہو کر واپس جا رہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے (میک نامی) ایک مقام پر ایک اسماعیلی ملحد نے اس زور کا حملہ کیا کہ سلطان جانبر نہ ہوسکا۔ (۶۰)

۶۰۲ھ شہاب الدین کی شہادت کے ساتھ سلطنت غوریہ ختم ہوگئی۔ ہرات اور غزنی کے علاقوں پر خوارزم شاہ اور ہندوستان میں محمد غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے ایک مستقل اسلامی حکومت قائم کر لی۔ غوریوں کے زمانے کے اہل علم میں امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ ،خواجہ معین الدین چشتیؒ متوفی ۶۳۳ھ کی ہے جو شہاب الدین کے ساتھ ہندوستان آ کر اجمیر میں غیر مسلموں میں تبلیغ کی اور اسلام پھیلایا۔ شہاب الدین غوری ہی کی کاوشوں سے شمالی ہندوستان میں اسلامی حکومت کی گویا داغ بیل ڈلی جو تقریباً سات سو سال تک قائم رہی۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتے ہیں "سلطان شہاب الدین ایک خدا ترس، رحم دل اور انصاف پسند بادشاہ تھا اگر چہ وہ ایک خود مختار حکمران تھا لیکن عالموں اور اولیاء کی صحبت میں بیٹھنے کو وہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا اور ان کی عزت و خدمت کرنے کو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا" (۶۱)

صلیبی جنگیں اور حکومت ایوبیہ:

سلاجقہ کے زوال کے بعد مسلمان ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو کر آپس میں لڑنے لگے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو دیکھ کر فلسطین کو مسلمانوں کے قبضے سے واپس لینے کے لیے لڑائیاں شروع کر دیں۔ فلسطین اور خاص طور پر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں وہ صلیبی جنگیں کہلاتی ہیں۔ نصرانیت کی تاریخ میں اسے مقدس لڑائیوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یورپ کی متحدہ عیسائی طاقت نے بیت المقدس پر قبضہ کے لیے پوری قوت لگانی شروع کر دی۔ سلجوقیوں کے زوال کے بعد جرمنی، فرانس، اٹلی اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے ایک زبردست فوج بیت المقدس روانہ ہوئی۔ پہلی فوج کو روم کے سلجوقی ترکوں نے ختم کر کے ان کے مقصد کو ناکام کر دیا لیکن جب دوسری فوج آئی تو مسلمان آپس کی نااتفاقیوں کی وجہ سے عیسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عیسائیوں نے ایشیائے کوچک اور شام کا تمام ساحلی علاقہ فتح کر کے ۴۹۲ھ میں مسلمانوں کو خاک و خون میں نہلاتے ہوئے بیت المقدس فتح کر لیا۔ جب فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں کے ساتھ وحشت و درندگی کا معاملہ کیا گیا تو اسلامی دنیا میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ کہ وہ فلسطین کے معاملہ پر خاموشی اختیار کرتے۔ لہٰذا عیسائیوں کا مقابلہ کرنے میں پہلا مشہور شخص عمادالدین زنگی ہے۔ اس نے سلجوقی حکومت کی طرف سے شہر موصل کا حاکم تھا جب سلجوقی حکومت کمزور ہو گئی تو اس نے اپنی سلطنت بہت بڑھالی اور عیسائیوں کو شکستوں پر شکستیں دیکر ان کی چار ریاستوں میں سے ایک ریاست ختم کر دی جس کا مرکز شہر الرہا تھا جسے آج کل اورفا کہا جاتا ہے اور ایشیائے کوچک میں واقع ہے۔ لیکن بدقسمتی سے عمادالدین کا اس عرصے میں انتقال ہو گیا اور فلسطین تک نہیں پہنچ سکا.... نورالدین زنگی (۵۴۱ھ تا ۵۶۰ھ) عمادالدین کے بعد اس کے لڑکے نورالدین زنگی نے تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس نے عیسائیوں سے بیت المقدس واپس لینے سے پہلے ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے گرد نواح کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے ان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ شروع میں اس کا دارالحکومت حلب تھا۔ ۵۴۹ھ میں اس نے دمشق پر قبضہ کر کے اسے دارالحکومت قرار دیا۔ اس زمانے میں مصر میں فاطمی حکومت قائم تھی لیکن اب وہ بالکل کمزور ہو گئی تھی اور مصر چونکہ فلسطین سے ملا ہوا تھا۔

اس لیے عیسائی اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے یہ دیکھ کر نورالدین نے ایک فوج بھیج کر ۵۶۴ھ میں مصر پر بھی قبضہ کرلیا اور فاطمی حکومت کا خاتمہ کر دیا مصر پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے بیت المقدس پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں..... نورالدین ابھی حملہ کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی عمر ۵۸ سال تھی اور اس نے ۲۸ سال حکومت کی۔ نورالدین بہادری میں اپنے باپ کی طرح تھا۔ ایک مرتبہ اسے دشمنوں کی صفوں میں گھستے دیکھ کر اس کے ایک مصاحب قطب الدین نے کہا: اے ہمارے بادشاہ اپنے آپ کو امتحان میں نہ ڈالیے اگر آپ مارے گئے تو دشمن اس ملک کو فتح کرلیں گے اور مسلمانوں کی حالت تباہ ہوجائے گی۔ اس نے یہ بات سنی تو اس پر بہت ناراض ہوا اور کہا: قطب الدین زبان کو روکو تم اللہ کے حضور میں گستاخی کر رہے ہو مجھ سے پہلے اس دین اور ملک کا محافظ اللہ کے سوا کون تھا؟ یہ صرف ایک فاتح نہیں تھا۔ بلکہ ایک شفیق حکمران اور علم پرور بادشاہ بھی تھا ۔اس نے سلطنت میں مدرسوں اور ہسپتالوں کا جال بچھا دیا (۶۲)۔

سلطان صلاح الدین ایوبی:

سلطان نورالدین زنگی نے ۵۶۹ھ میں وفات پائی تو اب سلطان صلاح الدین ایوبی کو استقلال نصیب ہوا اور مصر کے علاوہ شام، حلب، رہا، سنجار اور موصل پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ مصر اور شام کے اندرونی خلفشار کو دور کرنے اور یہاں کے حالات سے مطمئن ہو جانے کے بعد غازی مرحوم نے اپنی پوری توجہ صلیبیوں کی بیخ کنی پر مبذول کر دی۔ چنانچہ ۵۷۰ھ میں سلطان صلاح الدین نے اہلِ یورپ کے ساتھ جہاد شروع کیا اور متواتر چودہ سال تک لڑ کر ایک ایک شہر ان کے قبضے سے نکال لیا۔ یہاں تک کہ ۵۸۳ھ میں حطین، عکا، طبریہ اور عسقلان اور اس کے مضافات کو فتح کر لینے کے بعد سلطان خلد آشیاں نے بیت المقدس کو بھی صلیبیوں کے ہاتھوں سے چھین لیا اور یہ بلدۂ مقدسہ پھر فرزندانِ توحید کے قبضہ میں آ گیا۔ بیت المقدس کا ہاتھ سے نکل جانا کوئی ایسا زخم نہ تھا جس کو صلیبی آسانی سے فراموش کر دیتے۔ چنانچہ پاپائے روم اربانس ثالث نے اب پھر شور مچایا اور ایک اور صلیبی جنگ کے لیے سب عیسائیوں کو آمادہ کرلیا۔ اس معرکے میں فرانس کا بادشاہ فلپ آگسٹس اور شاہ انگلینڈ رچرڈ شیر دل دونوں اپنی جرار فوجیں لیے ہوئے بڑھے۔ اسٹریا کا بادشاہ فریڈرک بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس مرتبہ پھر شریک تھا۔ پھر بحری راستہ سے یہ سب لوگ فلسطین پہنچے لیکن صلاح الدین کے مقابلہ میں کیا جم سکتے تھے۔ بالآخر شعبان ۵۸۸ھ میں صلیبیوں نے مجبور ہو کر صلح کی پیش کش کی۔ سلطان صلاح الدین نے اپنے مشیرانِ خاص سے مشورہ کرنے کے بعد اس کو منظور فرمالیا۔ اس سلسلہ میں ایک حلف نامہ لکھا گیا۔ جس کی رو سے یہ لڑائی ساڑھے تین برس کے لئے ختم ہوگئی اور سلطان فتح وظفر کا پھریرہ اڑاتا ہوا دمشق آ گیا۔ (۶۳)

صلاح الدین کا ۵۸۹ھ میں انتقال ہوا۔ سلطان کی موت پر شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں

"سلطان کی موت تنہا صلاح الدین یوسف فرمانروائے، مصر وشام کی موت نہ تھی، بلکہ اس مجاہد جلیل کی موت تھی، جس کی تلوار ساری عمر خدا کی راہ میں بے نیام رہی اور جس نے اپنا کل خانماں اور ساری کائنات اس کی راہ میں لٹا دی اور اسلام کی حمایت میں تنہا متحدہ عیسائی دنیا کا مقابلہ کیا اور مرتے مرتے تثلیث کے مقابلے میں اسلام کے علم کو سربلند رکھا، اس لیے اس کی موت سے ساری دنیائے اسلام میں ماتم بچھ گئی، کوئی دل ایسا نہ تھا جو اس کے غم میں محزون، اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے ماتم میں اشکبار نہ رہی ہو"۔(۶۴)۔

اگر چہ صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد بھی اس کی حکومت دائم وقائم رہی مگر وہ عزم وہمت باقی نہ رہی جو صلاح الدین کے دور میں تھی اور اس نے بھی سلطنت کو اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ نتیجتاً اس تقسیم نے سلطنت کو کمزور کر دیا۔ جس حکومت کی بنیاد صلاح الدین ایوبی نے ۵۶۷ھ میں رکھی تھی اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ملک ۶۴۸ھ میں بادشاہ توران شاہ کے قتل کے بعد چھن گیا۔ سلطان نور الدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، ملک عادل نے جس پامردی سے صلیبی جنگوں کا سامنا کیا وہ قابل فخر ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اسلام پر اس نازک اور خطرناک حالات میں اسلام کی مدافعت کا فرض سب سے پہلے خلفائے بنو عباس پر عائد ہوتا تھا لیکن ان کی حیثیت صرف ناظر کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔

سرزمین اندلس :

اندلس عباسیوں کے قبضے میں کبھی نہیں آیا اور ان کی خلافت کے قائم ہونے کے بعد یہاں بنی امیہ کے خاندان کے ایک شخص عبدالرحمٰن نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ عبدالرحمٰن بنی امیہ کے مشہور خلیفہ ہشام کا پوتا تھا۔ جب بنو عباس کا اموی دارالخلافہ دمشق پر قبضہ ہو گیا تو انہوں نے بنی امیہ کے لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تو وہ چھپتا ہوا سمندر پار کر کے اندلس چلا گیا اور وہاں ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی جو ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ تاریخ میں اس کو عبدالرحمٰن الداخل بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے قرطبہ کو دارالحکومت بنایا اور ایک عظیم الشان مسجد جامع قرطبہ کے نام سے تعمیر کی۔ اس نے تقریباً تینتیس سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں شارلمین کے حملے کی پسپائی کا واقعہ بہت اہم ہے۔ ایک عیسائی حکمران شارلمین نے جرمنی فرانس اور وسطی یورپ کے بڑے حصہ پر قبضہ کر کے جب مستحکم حکومت قائم کر لی تو اس نے اندلس سے بھی مسلمانوں کو نکال دینے کی کوشش کرتے ہوئے ۱۶۱ھ میں عبدالرحمٰن کے عہد میں اس نے ایک زبردست فوج کے ساتھ اندلس پر حملہ کیا لیکن مسلمانوں نے شارلمین کو شکست فاش دی اسے ہزیمت اٹھاتے ہوئے اندلس چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا۔

اسطرح فرانس پھر مسلمانوں کا قبضے میں آ گیا۔عبدالرحمٰن الداخل کے بعد اس کا بیٹا ہشام (۱۷۱ھ تا ۱۸۰ھ) تخت نشین ہوا۔اس نے آٹھ سالوں میں امن وانصاف سے حکومت کی ۔جامع قرطبہ کی تعمیر میں جو کام باقی رہ گیا تھا اسے پورا کیا۔ہشام کے بعد اس کا بیٹا حکم (۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ) قابل حکمران ثابت نہ ہوسکا۔اس کی غلط عادتوں کی وجہ سے عوام اس کے خلاف اور علماء بدظن ہو گئے اور بدامنی پھیل گئی اگر چہ حکم نے ہنگاموں اور شورشوں کو ختم کر دیا لیکن اندرونی خلفشار سے فرانس نے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی حکومت کو نہ صرف فرانس میں ختم کر دیا بلکہ اسپین میں بھی باشلونہ تک ساحلی علاقہ پر قبضہ کرلیا۔مسلمانوں کی حکومت اندلس میں اس کے بعد کئی سو سال تک قائم رہی لیکن جنوب مغربی فرانس اور بارشلونہ کے یہ علاقے پھر ان کے قبضہ میں کبھی نہیں آئے ۔حکم قرطبہ میں ۲۰۶ھ میں وفات پا گیا۔حکم اول کا جانشین عبدالرحمٰن ثانی جسے عبدالرحمٰن اوسط بھی کہتے ہیں اس نے ۲۰۶ھ سے ۲۳۸ھ تک حکومت کی ۔وہ ایک قابل اور علم پرور بادشاہ تھا اس کا عہد بڑی حد تک امن وامان کا زمانہ تھا۔عبد الرحمٰن ثانی کے بعد حکومت امویہ اندلس میں انحطاط، ہنگامہ اور تفرقہ و کمزوری میں گھر کر رہ گئے۔اس کے بعد تین حکمران قرطبہ کے تخت پر بیٹھے لیکن ان کے زمانے میں مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی ۔اور ملک ہنگاموں اور جھگڑوں کی نظر ہو گیا۔یہ صورت حال عبدالرحمٰن الناصر (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) کے تخت نشین ہونے تک قائم رہی۔اندلس کے اموی حکمرانوں میں سب سے زیادہ شہرت اور عظمت عبدالرحمٰن ناصر کو حاصل ہوئی۔اسے عبدالرحمٰن ثالث بھی کہتے ہیں۔ملک کی حالت کی خرابی کے باوجود اس نے ایسی قابلیت سے حکومت کی کہ چند سالوں کے اندر ملک میں امن وامان قائم کر دیا۔اس نے نہ صرف اسلامی اندلس میں امن قائم کیا بلکہ شمال کے پہاڑوں میں جو عیسائی ریاستیں تھیں اور جو اندلس کی حکومت کے اثر سے آزاد تھیں۔ان کو بھی اپنا باجگزار بنالیا۔ اس کے دور میں قصر الزہرا کی تعمیر اپنی مثال آپ ہے۔اس کے بعد اس کا لڑکا حکم ثانی (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ) تخت نشین ہوا اس نے سولہ سال حکومت کی ۔چونکہ وہ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق رکھتا تھا لہٰذا اس نے علمی کتب خانے کی بنیاد رکھی ،قیمتی کتاب خریدے ۔تقریباً چار لاکھ کتابیں اس نے جمع کی تھیں ۔اس کے دور میں مدارس کی تعمیر اور مجلس علماء کی بنیاد رکھی گئی۔اس کے بعد اس کا لڑکا ہشام ثانی تخت پر بیٹھا لیکن اس نے اپنی ذمہ داری دربانوں پر چھوڑ دی تھی اس کے عہد میں اندلس پر جس شخص نے حکومت کی وہ محمد ابن ابی عامر (۳۶۶ھ تا ۳۹۳ھ) تھا۔جو منصور کے لقب سے مشہور ہے۔خلیفہ کے انتقال پر وہ حاجب بن گیا تھا۔اندلس میں چونکہ حاجب کی حیثیت وزیر اعظم کے مثل ہوتی ہے لہٰذا منصور نے بطور حاجب ایسی ذمہ داری نبھائی کہ جس کی مثال اندلس کی تاریخ میں نہیں ملتی وہ کہنے کو تو حاجب تھا لیکن صحیح معنوں میں حکمران وہی تھا۔شمال کی مسیحی ریاستوں سے منصور نے ۲۸ سالہ حکومت میں ان کے خلاف پچاس لڑائیاں لڑیں اور ان تمام ریاستوں کو اپنا محکوم بنالیا۔اسکے علاوہ افریقہ میں بھی سلطنت کی حدود میں اضافہ کیا اور مراکش کے پورے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

اس کے زمانے میں اندلس جتنا طاقتور ہوا اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ اس نے اندلس کی حکومت کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا ۔اس کے بعد اس کے لڑکے عبدالملک المظفر (۳۹۳ھ تا ۳۹۹ھ) نے چھ سال کامیابی سے حکومت کا انتظام سنبھالا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد جب اس کے بھائی عبدالرحمٰن سنچول نے حکومت سنبھالی تو اموی خاندان کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ عبدالرحمٰن اس بغاوت میں مارا گیا۔ افراتفری اور بغاوت نے اندلس میں اسلامی اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ بیس سال کے عرصہ میں قرطبہ کے تخت پر کئی اموی شہزادے بیٹھے اور معاملات بگڑتے رہے یہاں تک کہ ۴۲۲ھ میں اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اندلس کے اموی خاندان نے ۱۳۸ھ سے ۴۲۲ھ تک کل ۲۸۴ سال حکومت کی۔ اندلس کی تاریخ کا یہ بڑا شاندار دور ہے مسلمانوں نے اس زمانہ میں سیاسی حیثیت سے اندلس میں عروج حاصل کیا ویسا پھر کبھی نہیں ہوا۔ اندلس کا دارالحکومت قرطبہ اس دور میں ساری دنیا میں بغداد کے بعد دوسرا بڑا شہر بن گیا تھا۔

اموی حکومت کے زوال کے بعد اندلس کے مسلمانوں میں خانہ جنگی کے نتیجے میں کئی خودمختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان حکومتوں میں بنو ذوالنون بربر خاندان کی حکومت طلیطلہ میں ۴۲۸ھ تا ۴۷۸ھ تک قائم رہی اس کے بعد یہ شہر عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا لیکن مسلمان اس شہر میں ۸۹۸ھ میں غرناطہ کے سقوط تک موجود رہے۔ سرقطہ یہ شہر ۵۱۲ھ تک یہ شہر مرابطین کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد عیسائیوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ طلیطلہ کے بعد یہ اسلامی اندلس کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ جو عیسائیوں کے قبضے میں گیا۔ بنی افطس یہ حکومت ۴۳۳ھ سے ۴۸۶ھ تک قائم رہی۔ پھر مرابطین اور اس کے بعد موحدین اس شہر پر قابض ہو گئے۔ بنی امیہ کے اندلس میں کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بن گئی تھیں جو آپس میں گتھم گتھا رہتی تھیں۔ اس لیے شمال کے عیسائیوں کا جن میں قشتالہ کی حکومت بہت طاقتور تھی وہ یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ مسلمانوں نے اندلس کو عیسائیوں سے بچانے کے لیے یوسف بن تاشفین سے جس نے اس وقت مراکش میں ایک طاقتور حکومت قائم کر لی تھی مدد مانگی وہ مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ اور طاقتور فوج کے ساتھ اندلس روانہ ہوا۔ عیسائی بادشاہ الفانسو نے ''زلاقہ'' کے میدان جنگ میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ ایک سخت لڑائی کے بعد یوسف بن تاشفین نے اس کو شکست فاش دی۔ اس طرح عیسائیوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور اس نے اندلس کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے ان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یوسف بن تاشفین نیک اور عادل تھا۔ صحرائے اعظم میں اسلام کی اشاعت اور اندلس میں مسیحی یلغار کو روکنا اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ سلطنت دولت مرابطین کے نام سے اس نے کل پچاس سال حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد یہ حکومت چالیس سال اور قائم رہی۔ اس کے بعد جن لوگوں کی حکومت ہوئی وہ موحدین جو کہ ایک جماعت کا نام تھا اور جسے محمد ابن تومرت نے قائم کیا تھا۔ محمد ابن تومرت کے بعد عبدالمومن کے زمانے میں موحدین نے بڑی قوت حاصل کی۔

انہوں نے ۵۴۱ھ میں مراکش پر قبضہ کر کے مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔اس کے بعد اس کے ایک فوج اندلس بھیجی جس نے مرابطین کی حکومت وہاں سے بھی ختم کر دی۔اب عبدالمومن نے مشرق کا رخ کیا اور طرابلس تک اپنی سلطنت کو وسعت دے دی۔ اب عبدالمومن نے یورپ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔جہاد کی تیاریاں شروع کر دی گئیں مگر اسی دوران عبدالمومن کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد موحدین کی جماعت نے اس کے لڑکے یوسف (۵۵۸ھ تا ۵۸۰ھ) کو امیر منتخب کیا۔اس نے ۲۲ سال تک بڑی قابلیت سے حکومت کی۔موحدین میں سب سے زیادہ مشہور حکمران یوسف کا لڑکا یعقوب المنصور تھا اس کی سب سے زیادہ شہرت اس فتح کی وجہ سے ہے جو اس نے شمالی اندلس کے عیسائی حکمران الفانسو پر ''ارک'' کے میدان جنگ میں حاصل کی تھی۔اس کے بعد اس کا لڑکا الناصر تخت پر بیٹھا۔یعقوب المنصور کی وفات کے بعد عیسائی حکمرانوں نے اندلس پر پھر حملے شروع کر دیے۔اس کا عہد بھی اچھا رہا لیکن اس کو ۶۰۹ھ میں اندلس میں العقاب کے مقام پر عیسائیوں کے مقابلہ میں ایسی شکست ہوئی کہ موحدین کا زور ٹوٹ گیا اور وہ اسی شکست کے غم میں اگلے سال انتقال کر گیا اور اس کے بعد موحدین کا زوال شروع ہو گیا۔۶۳۴ھ میں بلنسیہ پر اور ۶۴۶ھ میں اشبیلیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔اندلس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اور خود مراکش میں ۶۶۸ھ میں خاندان بنی مرین نے موحدین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔اسلامی تاریخ میں یہ دور اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا آخری دور تھا۔اس کے بعد زوال شروع ہو گیا۔

غرناطہ:

اندلس میں مسلمانوں کا پوری طرح زوال موحدین کے بعد شروع ہو گیا تھا۔قشتالہ کی عیسائی حکومت جس نے مرابطین اور موحدین سے متعدد لڑائیاں لڑیں تھیں اور اس کے نتیجے میں قرطبہ،اشبیلیہ اور بلنسیہ جیسے عظیم شہر جو اندلس میں اسلامی تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے مرکز تھے وہ عیسائیوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔پورا ملک افراتفری کا شکار ہو چکا تھا۔اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نصر بن یوسف ابن الاحمر نے فراست و بہادری سے غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔عیسائیوں کے حملے کا بھر پور مقابلہ کرتا رہا۔ابن الاحمر ۶۷۱ھ میں فوت ہوا تو اس کا لڑکا ابوعبداللہ یہاں کا آخری بادشاہ ہوا اور اس خاندان کا آخری عہد خانہ جنگیوں کے سائے میں گذرا۔ابوعبداللہ کے زمانہ میں قشتالہ کی عیسائی حکومت نے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔جب محاصرہ طویل ہو گیا تو ابوعبداللہ نے عیسائیوں کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا بادشاہ کا یہ فیصلہ دیکھ کر غرناطہ کی فوج کے سپہ سالار موسیٰ نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور کہا' غلامی کی شرمناک زندگی سے موت بہتر ہے کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ اہل قشتالہ اپنے وعدے وفا کریں گے؟تمیں فریب دیا جا رہا ہے،دشمن ہمارے خون کا پیاسا ہے۔

موت ان مصائب کے مقابلے پر کچھ نہیں۔ جو کچھ دشمن ہمارے لئے تجویز کر چکا ہے۔ وہ مصائب کیا ہیں؟ نقصان، ذلت، رسوائی، تباہی، لوٹ مار عورتوں کی توہین، مسجدوں کی بے حرمتی، ظلم، بے انصافی اور عدم رواداری ہمیں زندہ جلانے کے لئے آگ روشن ہو چکی ہے..... ابوعبداللہ نے اپنے خاندان سمیت الشراس کی راہ لی، جب وہ پادول کی پہاڑیوں کے قریب پہنچا، تو اس نے غرناطہ پر نظر جما کر رونا شروع کر دیا۔ اس پر اس کی ماں نے اس سے کہا:

اس چیز کے کھوئے جانے پر عورتوں کی طرح آنسو بہاتے ہو جسے تم مردوں کی طرح نہیں بچا سکے۔ (٦٥)

یہ واقعہ ۸۹۸ھ کا ہے اس کے بعد اندلس پر مسلمانوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوئی اور سپہ سالار موسیٰ کا قول حرف بہ حرف پورا ہوا عہد کو توڑا گیا اور ظلم وتشدد کی وہ داستان رقم کی گئی جسے سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک سلطنت غرناطہ قائم رہی جو صرف جنوبی شرقی اندلس کے علاقے میں محدود تھی۔ جس کا رقبہ کل جزیرہ نما کا چوتھائی تھا۔ مسلمانوں کی باہمی رزم آرائیوں اور عیسائیوں کی متحدہ طاقتوں کے باوجود ڈھائی سو سال تک غرناطہ میں مسلم حکومت کا قائم رہنا ایک تعجب خیز واقعہ ہے۔ اس عرصہ میں بارہا مسلمانوں کے سامنے ایسے مواقع پیش آئے کہ اگر ان میں خانہ جنگیاں نہ ہوتیں اور ترکی حکمرانوں نے اندلس کے مسلمانوں کی امداد کی ہوتی تو اسپین کے مسلمانوں کا نام ونشان اس طرح نہ مٹتا، ۱۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ کو اندلس کی مسلم حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور قلعہ حمراء کے سب سے بلند برج پر اسلامی نشان سرنگوں کر کے صلیبی نشان بلند ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (٦٦)

خوارزم شاہی سلطنت:

سلاجقہ کے زوال کے بعد اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ میں جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑی حکومت خوارزم کی تھی۔ اس حکومت کی بنیاد خوارزم کے سلجوقی حاکم اتسز نے سلطان سنجر کے انتقال کے بعد ڈالی تھی لیکن علاؤالدین تکش اور علاؤالدین محمد خوارزم شاہ نے اپنے دور میں سلطنت کو وسعت دی۔ دراصل یہی دور خوارزمی سلطنت کے عروج کا زمانہ تھا۔ علاؤالدین تکش نے خراسان فتح کر لیا اور علاؤالدین محمد نے ایک طرف شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد ہرات اور غزنی کو غوریوں سے چھین لیا اور دوسری طرف ماوراء النہر کے علاقے پر غلبہ حاصل کر لیا۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ بغداد پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

چھٹی صدی ہجری کا آغاز عالم اسلام کے لیے انتہائی کرب ناک وہولناک ثابت ہوا۔ جب وحشی تاتاریوں کا طوفان اٹھا اور اس نے نہ صرف وسط ایشیا کے مسلم ممالک کو تہس نہس کر دیا بلکہ مسلمانوں کی لاشوں سے سڑکیں اور بازار بھر گئے۔

کتب خانے جلا ڈالے گئے۔ املاک لوٹ لیے گئے۔ اور بے مثال شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام پر ایسی تباہی کبھی نہ آئی تھی۔

منگولوں کے تعارف میں مظہر الحق لکھتے ہیں " Like the Turks, the Mongols were the inhabitants of the vast steppe-lands, stretching from the Jaxartes in Turkestan to the borders of China. They dwelt in the eastern parts of this vast region, now called Mongolia. (67)

تاتاریوں کے حملے کا سبب یہ بنا کہ چنگیز خان کے ملک کے چند تاجر تجارتی مال لے کر انزار آئے۔ نیال خان (سلطان کا ماموں زاد بھائی) وہاں کا گورنر تھا۔ بیس ہزار فوج رکاب میں رہتی تھی۔ مال واسباب کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ لالچ پیدا ہوا، شاہی دربار میں اطلاع کر دی کہ یہ تاجر نہیں ہیں بلکہ جاسوسی کی غرض سے آئے ہیں، سلطنت کی جانب سے ان کی نگرانی کا حکم صادر ہوا۔ نیال خان کو موقع مل گیا۔ نگرانی کے بجائے ان لوگوں کو خفیہ طریقے سے قتل کر کے مال واسباب پر قبضہ کر لیا۔ اس بات کی اطلاع چنگیز خان کو ملی تو سلطان کو ناراضگی اور تنبیہ کا خط لکھا۔ بدعہدی پر غصہ کا اظہار کیا۔ سلطان نے چنگیز خان کے ایلچی کو بجائے جواب دینے کے قتل کر دیا۔ (۶۸)

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ چنگیز خان نے خوارزم شاہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا خوارزم شاہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ وہ بھاگتا اور چھپتا رہا اور چنگیز خان تباہی پھیلاتا ہوا علاقے کے علاقے فتح کرتا رہا۔ محمد خوارزم کے بعد اس کے لڑکے جلال الدین خوارزم شاہ نے جو بڑا بہادر تھا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ کئی سال تک منگولوں سے لڑتا رہا لیکن کامیاب وہ بھی نہ ہو سکا۔ منگولوں کا یہ حملہ بہت بڑی تباہی لایا۔ سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، نیشا پور، رے غرض اسلامی دنیا کے وہ تمام شہر جو وسط ایشیا اور ایران میں تھے انہوں نے برباد کر دیئے۔ لوگوں کا قتل عام کیا۔ شہروں میں آگ لگا دی، شہروں کی عمارتیں جلا دیں اور دیکھتے دیکھتے اسلامی دنیا کا ایک بڑا حصہ ویران اور خاکستر کر دیا۔ مسجدیں، کتب خانے اور مدرسے سب برباد کر دیئے گئے...... اس زمانہ کے ایک مورخ ابن اثیر نے جو چنگیز خاں کے حملہ کے وقت موجود تھے ان واقعات کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے ان کے دل پر اسلامی دنیا کی تباہی کا بڑا گہرا اثر ہوا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں: یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس وپیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ واقع بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی موت کی خبر سنانا کس کے لیے آسان ہے اور کس کا دل ہے کہ ان کی ذلت اور رسوائی کی داستان سنائے۔ کاش میں پیدا نہ ہوتا کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا۔ یہ وہ عظیم حادثہ ہے کی دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور شاید دنیا قیامت تک بھی ایسا واقعہ نہ دیکھے"۔

خوارزم شاہ کی سلطنت کو تباہ کر کے اور رے، ہمدان اور آذر بائیجان تک تمام شہروں کو تباہ کر کے چنگیز منگولیا واپس چلا گیا اور کچھ عرصہ بعد مر گیا۔ لیکن پچاس سال بعد اس کے پوتے ہلاکو خاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے بغداد پر قبضہ کرنے کا ارادہ بنایا جو اس وقت اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا (۶۹)۔ اگر چہ سلاجقہ کے بعد بغداد کے خلیفہ خود مختار ہو گئے تھے مگر ان آخری عباسی خلفاء کی سلطنت زیادہ وسیع نہ تھی۔ آخری دور میں سات خلفاء گزرے ہیں جن میں سب سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تھا۔ اگر چہ اس میں کچھ ذاتی خوبیاں بھی تھیں مگر ریاست کی باگ ڈور کی صلاحیت نہیں تھی لہذا اس نے اپنی بیوقوفی اور عیاشی کے نشے میں مستنصر کی جمع کی ہوئی فوج بھی توڑ دی اور ابن علقمی جیسے وزیر پر اعتماد کیا۔ جس نے غداری کی ابوالفداء کا بیان ہے کہ ابن علقمی نے تاتاریوں کو بغداد پر حملہ کے لئے لکھا اور اپنے بھائی کو زبانی پیام دے کر ان کے پاس بھیجا (۷۰) صفر ۶۵۶ھ میں ہلاکو نے ایک ماہ سے زائد محاصرہ کے بعد شہر فتح کر لیا اور منگول کی فوجیں بغداد میں داخل ہو گئیں۔ بغداد کے مشرقی حصہ میں عالیشان محل، دلفریب باغات اور بڑے بڑے بازار تھے۔ یہ وہ بغداد تھا جس پر قبضہ کرنے کے بعد وحشی تاتاریوں نے کئی دنوں تک قتل عام کیا اور چالیس دن تک شہر کو لوٹتے رہے۔ عمارتیں ڈھا دیں اور مکانوں میں آگ لگا دی۔ مسجدیں مدرسے اور شفا خانے جن کی وجہ سے بغداد مشہور تھا۔ برباد کر دیے گئے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا شہر چند دنوں میں کھنڈر بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بغداد میں سولہ لاکھ مرد عورتوں اور بچوں کو منگولوں نے قتل کیا۔ مستعصم کے ساتھ بھی ہلاکو نے برا سلوک کیا اس کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کر دیا اور اس کی لاش کو پیروں میں مسل کو پھینک دیا۔ ابن علقمی جس نے غداری کی تھی اس کے ساتھ تاتاریوں نے کوئی سلوک نہیں کیا اور چند دن بعد وہ بھی مر گیا۔ عراق کے دوسرے شہروں کا بھی یہی حشر ہوا اس کے بعد ہلاکو نے شام کا رخ کیا اور حران اور نصیبین کے باشندوں کا بھی قتل عام کیا۔ پھر حلب میں داخل ہو کر پچاس ہزار آدمی قتل کیے۔ اور دس ہزار عورتوں اور بچوں کو غلام اور لونڈی غلام بنالیا۔ بالآخر مصر کے حکمران بیبرس نے ۱۵ رمضان ۶۵۸ھ کو فلسطین کے ایک مقام جالوت میں منگولوں کو شکست دے کر شام اور مصر کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ ماوراء النہر سے بغداد تک کا علاقہ اسلامی دنیا کا دل تھا۔ منگولوں کے حملے سے یہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے عراق کی ان نہروں کو بھی تباہ کر دیا جس سے عراق سرسبز و شاداب تھا۔ منگولوں کے حملہ کو اگر چہ سات سو برس گزر چکے تھے اور اس عرصہ میں یہاں بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئی۔ لیکن ان ملکوں میں خوشحالی علم و فن کی ترقی پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جو تباہی بغداد کے زمانے تک اس خطہ نے کی تھی اس زمانہ میں اسلامی دنیا کا یہ خطہ علم، تمدن، تہذیب، اور صنعت و حرفت میں ساری دنیا سے بڑھا ہوا تھا۔ موجودہ صدی میں جدید ترقی کے باوجود اسلامی دنیا کو یہ بلند مقام آج حاصل نہیں۔ مسلمانوں کے اس زوال کے مختلف اسباب ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑا سبب منگولوں کا حملہ اور ان کی پھیلائی ہوئی تباہی اور بربادی بھی ہے۔

ایک طرف اندلس میں اسلامی تہذیب اور شہروں کی تباہی اور کتب خانوں اور مدرسوں کی بربادی نے اور دوسری طرف ترکستان سے شام تک اسلامی دنیا کے قلب کی منگولوں کے ہاتھوں تباہی نے اسلامی دنیا کو زوال کی طرف دھکیل دیا۔ ایک قوم کی ترقی میں اس کے علمی ذخیروں، تمدنی اداروں، صنعت وحرفت اور زراعت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر علم اور تہذیب کے یہ نشان ملیامیٹ کردیے جائیں اور شہر اور بستیاں ویران کردی جائیں اور صدیوں کی کوششوں سے جمع کیا ہوا علمی ذخیرہ برباد کردیا جائے تو اس قوم کی تباہی میں جوان مصائب کا شکار ہو کیا شک باقی رہ سکتا ہے..... منگول حملے نے صرف مادی تباہی ہی نہیں پھیلائی اس نے اپنی وحشت اور سفاکی سے مسلمانوں کے حوصلے بھی پست کردیے۔ ان کے دل توڑ دیے۔ جس کے نتیجہ میں مایوسی کی فضا اور ترک دنیا کی خواہش پیدا ہوگئی۔ اور یہ بات بھی مسلمانوں کے زوال کا باعث ہوئی۔ (۷۱)

بغداد کی تباہی اور اندلس میں مسلمانوں کے زوال پر اسلامی تاریخ کا ایک اہم دور جو کہ مسلمانوں کے عروج کا پہلا دور ہے۔ ختم ہو جاتا ہے۔ جس کی ابتداء ۱ھ ، ۶۲۲ء میں مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام سے ہوئی اور ۶۵۶ھ، ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بغداد کی تباہی سے اسلامی دنیا کا بڑا حصہ تاتاریوں کے قبضہ میں چلا گیا اور اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن جب یورپ کے اس گوشہ سے مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا تو دوسری طرف ترکی میں مسلمانوں کے عروج کا سورج بلند ہو رہا تھا۔ یہی دور مسلمانوں کے عروج کا دوسرا دور ہے۔

سلطنت عثمانیہ:

سلیم اول نے ۹۲۳ھ میں مصر فتح کیا اور وہاں سے خلافت اور سلطنت دونوں کا خاتمہ کر کے خلافت کو آل عثمان کی طرف منتقل کرلیا۔ آل عثمان کی حکومت کی بنیاد ۶۹۹ھ میں پڑی تھی۔ جب کہ ارطغرل نامی ایک ترکستانی امیر کے بڑے بیٹے عثمان خان اول نے دولت سلجوقیہ کے دارالسلطنت قونیہ میں آخری سلجوقی تاجدار علاؤالدین ثانی کے مارے جانے کے بعد افسر شاہی سر پر رکھا۔ اس طرح گویا دولت سلجوقی کے کھنڈروں پر آل عثمان کی سلطنت کا قصر رفیع الشان تعمیر ہوا۔ ابتداء میں یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی اور اس کے اطراف و جوانب میں تیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ جو ایشیائے کوچک میں پھیلی ہوئی تھی۔ عثمان خان اول نہایت شجاع، عالی حوصلہ، نیک عمل اور اسلام کا سچا شیدائی تھا..... اس نے بازنطینی سلطنت کے اہم قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ بحیرۂ اسود کے ساحل تک پھیلا دیا اور شہر بنی پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالسلطنت بنایا .... آل عثمان کی حکومت ۶۹۶ھ سے ۱۳۴۲ھ تک جب کہ اس خاندان کے آخری فرمانروا سلطان عبدالمجید ثانی کو معزول کر کے خلافت کا خاتمہ کردیا گیا۔

چھ سو تینتالیس سال رہی۔ اس طویل مدت میں ۳۷ فرمانروا ہوئے جن میں سے سلطان بایزید ثانی (۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ) تک آٹھ فرمانروا سلاطین کہلائے پھر سلطان سلیم اول نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تو اب یہ خود اور اس کے بعد کے تمام فرمانروایانِ عثمانی خلیفہ کہلانے لگے۔

عثمان کی وفات کے بعد بھی فتوحات کا سلسلہ رکا نہیں بلکہ اس نے بازنطینی حکومت کو ختم کر کے اسلام کو یورپ میں فاتحانہ حیثیت داخل کرنے کی جو مہم شروع کی تھی۔ اس کے لائق جانشینوں نے اس کے بعد بھی اس کو برابر کامیابی کے ساتھ جاری رکھا (۷۲)۔ عثمان کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا اورخان تخت پر بیٹھا تو اس نے اندرونی انتظامات و اصلاحات کے علاوہ اپنی توجہ یورپ کی طرف بھی مرکوز رکھی۔ اس بنا پر موقع پاتے ہی اس نے گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔ گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اور مسیحی یورپ میں اعظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے دیانا کی دیواروں تک پھیل گئی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سلطان مراد اول تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے اسلاف کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انگورہ کے امیر علاؤالدین کے اکسانے پر آل عثمان کی طاقت کو کمزور کرنے کی غرض سے یورش کی تھی شکست فاش دی اور انگورہ پر قبضہ کر لیا اس کے بعد جزیرہ نمائے بلقان کی طرف توجہ کی اور فتح کر کے اس کو اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ مراد اول کے بعد اس کا بیٹا بایزید ایلدرم تخت نشین ہوا اس کے بعد اس نے بدنامی کا ایک داغ اپنے اوپر لگایا، اس نے اپنے بھائی یعقوب پاشا کو اس گمان پر قتل کرادیا کہ وہ تخت سلطانی حاصل کرنے کی آرزو رکھتا ہے لیکن اس سے الگ سلطان ایلدرم نے فتوحات کے سلسلے میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہیں وہ بلاشبہ اسلام کی تاریخ فتوحات کا ایک روشن باب ہیں۔ تیمور کو جب یہ خبر ملی کہ بایزید یلدرم کو یورپ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی ہیں اور قیصر روم عیسائی بادشاہ نے تیمور کو اس طرف توجہ دلائی کہ بایزید سے آپ کی سرحد متاثر ہوگی لہٰذا اس کو بچانے کی فکر کریں اور ہمیں بھی اس مصیبت سے چھٹکارا دلائیں۔ پھر تیمور نے ۸۰۳ھ میں آرمینیا کی طرف سے بایزیدی علاقوں پر حملہ کر دیا اور بالآخر تیمور نے بایزید کو شکست دے کر تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی تھیں۔ آزاد کر دیا اور ان کی سابقہ حکومتوں کو دوبارہ بحال کر کے ایشیائے کوچک سے دولت عثمانیہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

اگرچہ حکومت عثمانیہ، تیمور لنگ کے شدید حملوں سے اجڑ کر رہ گئی تھی مگر اس غم ناک معاملے کے بعد سلطان محمد اول بن بایزید اپنی حکومت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی اور جب اپنے بیٹے مراد ثانی کو سن ۸۲۴ھ میں جانشین بنایا اور اس نے تنظیم اور اصلاح کی سیاست کو جاری رکھا، یہاں تک کے حکومت کی مرکزیت اور قوت لوٹ آئی ۔ سلطان مراد ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔

ابتداء میں اسلاف قسطنطنیہ کے اطراف کے علاقے کو فتح کر چکے تھے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے سلطان محمد نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا اور ۸۵۷ھ میں اس نے قسطنطنیہ کو فتح کرلیا۔ اس دن سے اس کا لقب فاتح پڑ گیا۔ سلطان محمد فاتح نے اس کے بعد بھی اپنی فتوحات جاری رکھیں۔ سلطان محمد کے بعد اس کا بیٹا بایزید ثانی تخت نشین ہوا لیکن جلد ہی اس نے اپنے بیٹے سلیم کو سلطان بنا کر خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سلطان سلیم اول کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کو شکست دی بلکہ ممالیک مصریہ کو ختم کر کے مصر کو عثمانی سلطنت میں شامل کر دیا۔

عثمانی ترکوں نے ایک وسیع بادشاہت کی بنیاد ڈالی جو بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی جس کی حدود مغرب میں تخوم فینا سے مشرق میں جبال قوقاس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور بوسفور کے کناروں سے بحر احمر کے کناروں تک شام سے مصر تک اور مصر سے جزائر تک۔ عثمانی بادشاہت ساڑھے پانچ سو صدی سے زیادہ باقی رہی اور بالتحدید پندرہویں صدی کے نصف سے بیسویں صدی کے آغاز تک باقی رہی اور وہ سولہوں عیسویں میں اپنے عروج اور وسعت کی انتہا کو پہنچ چکی تھی اس نے اپنی قوت اور ہیبت کی سترھویں صدی کے آخر تک حفاظت کی۔ (۷۳) محترمہ خالدہ ادیب خانم کی کتاب Conflict of East & West in Turkey اور دولت عثمانیہ سے حوالے دیتے ہوئے سعید اکبر آبادی لکھتے ہیں: "سترہویں صدی میں اول سے آخر تک نا اہل سلطانوں کا ایک سلسلہ بندھا ہوا نظر آتا ہے ان میں جو عیش پرست نہیں تھے وہ پرلے .... درجہ کے ظالم و جابر تھے اور جو حرم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ انتہا سے زیادہ بد اطوار تھے، ان کی منظور نظر بیگمات سلطنت کے بڑے بڑے عہدے فروخت کرنے لگیں، ترکی زبان میں ایک کہاوت ہے " مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے"۔ حرم اور بادشاہوں کا یہ رنگ دیکھ کر عمال عثمانی بھی اسی رنگ میں رنگے جانے لگے... اس دور تنزل میں بہت کم سلطان ایسے ہوں گے جو طبعی موت سے مرے ہوں کیونکہ اس صدی میں فوجوں کی بغاوت اور فرماں رواؤں کی معزولی کا بازار گرم تھا، اس بناء پر وہ اکثر قتل کر دیئے جاتے تھے.... اور اس کے علاوہ ولی عہدی کا وہ خوف سلاطین عثمانی کے دل میں گھر کر گیا تھا کہ فاتح قسطنطنیہ بھی اس سے لرزاں نظر آتا ہے اور اس کے نتیجے میں قتل و غارت گری کا وہ سلسلہ چل نکلا کہ آج بھی امت مسلمہ کو اس پر ندامت ہے۔ مولانا سعید احمد صاب سلاطین عثمانی کے اس مکروہ فعل کو ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں چنانچہ سلطان بایزید ایلدرم نے اپنے برادر خورد یعقوب چلی کو جو شجاعت و دلیری میں اپنے بڑے بھائی سے کم نہ تھا۔ محض اس خوف سے کہ سلطنت کا نزاع برپا نہ ہو اور سلطان سلیم اول نے اپنے دو بھائیوں احمد اور کرکود کو قتل کرایا۔ دولتِ عثمانیہ کا نامور تاجدار اور تاریخ اسلام کا بلند مرتبت ہیرو سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی عظیم الشان فتح جس کی قبائے عظمت کا ایک تکمہ زریں ہے، اس نے بھی عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دودھ پیتے بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا۔

عین اس وقت جبکہ بچہ کی ماں سلطان کی خدمت میں تخت نشینی کا ہدیہء تہنیت پیش کر رہی تھی، حوض میں غرق کرا کر ہلاک کرا دیا۔ پھر محمد فاتح نے اپنے اس فعل نادم اور پشیمان ہونے کے بجائے بہ مصداق عذر گناہ بدتر از گناہ یہ بھی کیا کہ حکومت و سلطنت کے تحفظ کی خاطر بھائیوں کے قتل کو قانوناً جائز ہی قرار دیدیا جسے مورخین عام طور پر خونیں قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (۷۴)

عوام میں تعلیم کی بے حد کمی اور ان پر درباری علماء قدیم کا بے حد اثر تھا۔ ایسی حالت میں دستوری یا جمہوری حکومت کا تخیل بھی ترکی عوام کے سامنے نہ تھا۔ نظام حکومت کی تبدیلی تو بڑی چیز ہے جب سلیم ثالث (۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ) نے تعلیمی عسکری اور بعض دیگر اندرونی اصلاحات نافذ کرنا چاہی تو علماء فوج کے سرداروں نے اتنی مخالفت کی کہ اس کو تخت سے دست بردار ہو کر قتل ہونا پڑا۔

آل عثمان میں سلیم ثالث پہلا بادشاہ تھا جو مغربی خیالات سے متاثر ہوا۔ اور جس نے مغربی دستور حکومت اور طریقہ تعلیم کو اپنی حکومت میں رائج کرنا چاہا۔ سلطان محمود خاں (۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ) جتنا اچھا مسلمان تھا اتنا ہی مغربیت کا دل دادہ تھا۔ اس کا زیادہ وقت فوجی نظام اور اندرونی نظام سلطنت کی درستگی میں صرف ہوا۔ اس کے بعد سلطان عبدالمجید خاں (۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ) نے بھی مغربیت کی تقلید اپنے پیشرو سے زیادہ جاری رکھی اس نے اطراف حکومت میں نارمل اسکول یونیورسٹیاں قائم کیں۔ عبدالمجید خاں کے بعد سلطان عبدالعزیز خان (۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۲ھ) نے مغربیت کو ترکی میں مزید ترقی دی۔ اس نے مغربی ممالک کا خود بھی سفر کیا اور مغربی مدبرین کو اپنی حکومت میں بلا کر باہمی میل جول پیدا کیا۔ یہ بادشاہ اپنے اندر اسلامی جذبات بھی رکھتا تھا اس لیے اس نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی کافی کوشش کی لیکن اب ترکی قوم انحطاط کی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ فوج کی شورش کی وجہ سے اس نیک منش سلطان کو بھی تخت حکومت سے معزول ہونا پڑا۔

سلطان سلیم ثالث کے عہد سے لے کر اب تک علماء کی مخالفت کے باوجود مغربیت کافی زور پکڑ چکی تھی۔ بالخصوص شخصی حکومت کی خرابیاں مغربی ممالک کے میل جول سے مسلم عوام کے سامنے آگئی تھیں وہ سمجھنے لگے تھے کہ ان کے قومی زوال کا واحد سبب یہ ہے کہ حکومت کا پورا اقتدار ایک خاندان اور ایک شخص کی ذات میں مرکوز ہے جب وہ اثر کمزور ہو جاتا ہے تو فوج اور ارا کین سلطنت اسی اثر پر قبضہ کر کے استبداد اور ظلم کرتے ہیں۔ قوم کے عام افراد حکومت کی فلاح و بہبود میں کوئی ذمہ داری نہیں رکھتے۔ ان خیالات نے سلطان عبدالحمید خاں (۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۶ھ) کے عہد میں کافی زور پکڑا .... اس وقت خلافت کی حالت مصر کی خلافت سے بھی بدتر تھی۔ دنیائے اسلام میں اس ادارے کا اب تک احترام چلا آتا تھا اگرچہ خود خلیفہ اور شیخ الاسلام اتحادیوں کی غلامی قبول کر چکے تھے۔

۱۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن ادھر ۱۹۱۸ء میں مصطفےٰ کمال پاشا نے اناطولیہ میں اس خلافت کے خلاف علم بلند کر دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں حکومت نے ان کے خلاف ایک فوج روانہ کی مگر مصطفےٰ کمال پاشا کو پوری کامیابی ہوئی۔ ۲۲ء میں کمال پاشا نے یونانی فوج کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست فاش دی اور چند گھنٹوں میں یونانی فوج کو تباہ کر دیا۔ اب حکومت ترکی پر مصطفےٰ کمال کا باقاعدہ قبضہ ہو گیا جس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سلطنت اور سلطانیت دونوں کو ختم کر کے مغربی طرز پر ایک قومی جمہوری حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ جس کی رو سے حکومت کے تمام اختیارات "قومی مجلس عالیہ" کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ سلطان وحید الدین منصب حکومت سے معزول کر دیا گیا اس نے اتحادیوں کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی۔ مجلس عالیہ نے عبد المجید آفندی کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ لیکن خلیفہ کو حکومت کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ مجلس عالیہ کے نئے انتخابات ہوئے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ علماء اور قدامت پرستوں کی جماعت نے زبردست شکست کھائی اس نئی مجلس نے مارچ ۲۴ء میں زبردست اکثریت سے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح ایک سال کے اندر ترکی میں سلطنت، ملوکیت اور خلافت سب کا خاتمہ ہو گیا۔ (۷۵)

سلاطین ہند

غزنوی خاندان کے بعد ہندوستان میں غوری خاندان کی حکومت کا سلسلہ جاری ہوا سلطان شہاب الدین ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ۵۸۸ھ/۱۱۹۳ء میں دہلی اجمیر اور قنوج کے راجوں کو ذلت آمیز شکست دے کر گنگا کے کنارے سے لے کر پشاور تک اسلامی سلطنت قائم کر لی۔ شہاب الدین خود تو راجوں کو زیر کر کے ہندوستان میں نہ رہا لیکن اپنے ایک غلام قطب الدین کو اپنا نائب مقرر کیا۔ یہی وہ حکمران ہے جس کی قبر انارکلی سے متصل ایک گلی میں واقع ہے جو اس کی عظمت کا اظہار کر رہی ہے۔ یہ سلطنت سات سو برس تک قائم رہی اور تاریخ میں سلطنت غلاماں کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صرف اسلام کو ہی فخر حاصل ہے کہ مسلمان غلام بھی حکمران بنے۔ حکمران غلاماں میں سے سلطان شمس الدین التمش، سلطان ناصر الدین محمود سلطان بلبن مشہور ہو گزرے ہیں۔ بلبن کے بعد کیقباد تخت پر بیٹھا لیکن نااہلی کی وجہ سے تین برس کے بعد خلجی خاندان کے ایک امیر جلال الدین نے ۶۹۷ھ/۱۲۹۰ء میں سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ جلال الدین کے بعد اس کا بھتیجا علاء الدین خلجی حکمران بنا۔ بیس برس تک حکومت کی اس کے زمانہ میں سارا ہندوستان مسلمانوں کے زیر حکومت آ گیا۔ مسلم افواج نے بندھیا چل سے اتر کر دکن پر حملہ کیا۔ مقامی راجوں مہاراجوں کو زیر کرتے ہوئے راس کماری تک پہنچ گئی۔

علاء الدین کا دور حکومت ہندو یک سنہری دور ہے ہر طرف امن ہے خوش حالی ہے، انصاف کی حکمرانی ہے۔ علاء الدین کے بعد کوئی ایسا حکمران نہیں تھا۔ جو علاء الدین کے ورثہ کو جاری رکھتا۔ خسرو نامی حکمران بنا۔ اس ظلم و ستم کی وجہ سے پنجاب کے صوبہ دار غازی ملک نے دہلی پر چڑھائی کی۔ خسرو مارا گیا، غازی ملک غیاث الدین تغلق نے نام سے ۷۲۱ھ/ ۱۳۲۰ء میں بادشاہ بنا۔ اس طرح خلجی خاندان سے تعلق خاندان میں حکومت منتقل ہو گئی۔ تغلق کے بعد حکمران نااہل تھے۔ ایک وسیع حکومت کو قائم نہ رکھ سکے۔ آخر کار تغلق خاندان سے سید خاندان میں ۱۴۱۴ء میں مسلم حکومت منتقل ہو گئی۔ پنجاب کے صوبہ دار سید خضر کان نے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن دہلی کے ارد گرد اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ تمام صوبے دار اپنی اپنی جگہ خود مختار حکمران بن گئے۔ آخر کار ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی نے قبضہ کر لیا۔ سید خاندان سے حکومت لودھی خاندان میں منتقل ہو گئی۔ بہلول لودھی کے بعد اس کے بیٹے اسکندر لودھی نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا۔ باپ بیٹا دونوں باہمت اور مدبر حکمران تھے۔ انھوں نے اپنی سلطنت کو بڑھا کر بہار تک وسیع کر لیا۔ سکندر کے بعد ایک بھی لودھی خاندان کا ایسا حکمران نہ تھا جو بہلول لودھی کی میراث کو قائم رکھتا۔ سکندر کے بعد ابراہیم لودھی حکمران بنا۔ نااہل تھا۔ بابر کابل سے چل کر ہندوستان میں آیا بابر کے ساتھ صرف بارہ ہزار سپاہ تھی۔ ابراہیم کے ساتھ پانی پت کے میدان میں لڑائی ہوئی۔ ابراہیم لودھی کے ساتھ ایک لاکھ فوج تھی۔ بابر اس جگری اور حکمت عملی کے ساتھ لڑا ایک لاکھ فوج بارہ ہزار کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ابراہیم لودھی مارا گیا اور ہندوستان پر مغلیہ خاندان قائم ہو گئی۔ تقریباً تین سو برس تک حکومت کرتے رہے۔ بابر کے بعد ہمایوں حکمران بنا لیکن کچھ ہی دن بعد شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں شکست کھائی اور ایران بھاگ گیا۔ شیر شاہ سوری کے بعد ہمایوں پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ہندوستان کو فتح کیا۔ ہمایوں کے بعد اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب عالمگیر حکمران بنے۔ یہ حکمران باہمت، بہادر اور اصول حکمرانی سے باخبر تھے۔ سارے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ ہر سمت اسلامی حکمرانی کا پرچم لہرانے لگا۔ اورنگزیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد اس کا بیٹا معظم بہادر شاہ اوّل کے نام سے تخت نشین ہوا۔ پانچ برس برسر اقتدار رہا۔ ۱۷۱۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وزراء امراء فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں بادشاہوں کا نصب و عزل آ گیا۔ جسے چاہا موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے صوبے دار خود مختار بن بیٹھے۔ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا۔ مغلوں کی رہی سہی طاقت خاک میں ملا دی۔ نادر شاہ تو لوٹ مار کر واپس کابل چلا گیا لیکن ہندوستان میں ہر سو افراتفری مچی ہوئی تھی۔ مرہٹوں، راجپوتوں، جاٹوں اور سکھوں نے اپنی اپنی حکمرانیاں قائم کر لیں تھیں۔ مرہٹے زور پکڑ رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ شاہ کی ترغیب پر احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ سلطنت شاہ عالم کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کی روح مردہ ہو چکی تھی اس لیے مرہٹوں کا زور ٹوٹنے کے باوجود اسلامی سلطنت کو سنبھالا نہ دے سکے۔ ادھر ہندوستان میں تجارت کے روپ میں آنے والے انگریزوں کا اثر بڑھ رہا تھا۔

مسلمانوں کی اپنی غداری کی وجہ سے پہلے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا(۷۶)مسلم حکمرانوں کی عیاشی وکمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چالاکی وعیاری سے نومبر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم بادشاہ کو قلعہ معلیٰ کا مستقل مکین اور وظیفہ خوار بنا دیا۔ اس کا فرزند اور جانشین اکبر شاہ ثانی اپنے وظیفہ میں اضافہ نہ کرا سکا اور آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر جس نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا۔ شکست و نامرادی سے دوچار ہوا۔ شہزادے قتل ہوئے خود گرفتار ہوا، مقدمہ چلا، نومبر ۱۸۵۸ء میں جلاوطن ہو کر رنگون میں فوت ہوا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں (۷۷)

ریاستوں کے نوابوں کے ساتھ مقابلے میں اپنوں کی غداری کی وجہ سے انگریزوں کو فتح ہوتی رہی آخرکار ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا سورج غروب ہو گیا۔

حواشی وحوالہ جات (باب اوّل)

(۱) القرآن (۲۲:۲۶-۲۷)

(۲) ایضاً (۱۶:۱۲۰)

(۳) ایضاً (۲:۱۲۴)

(۴) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ سید: "تفہیم القرآن" مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۱ء، ج:۱، ص:۱۰۸

(۵) القرآن (۲:۱۲۸)

(۶) سواتی، عبدالحمید صوفی: "معالم العرفان فی دروس القرآن" مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ، ۲۰۰۹ء، ج:۳، ص:۴۵۳

(۷) ایضاً (محولہ بالا)، ج:۴، ص:۳۵۸

(۸) الخطیب العمری، امام ولی الدین محمد بن عبداللہ: "مشکوٰۃ"، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، باب: ثواب ھذہ الامۃ

(۹) ایضاً (محولہ بالا)

(۱۰) ابن کثیر، عمادالدین، حافظ: "تفسیر ابن کثیر" مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ج:۱، ص:۴۵۱-۴۵۰

(۱۱) البوصیری، الامام "البردۃ" مکتبۃ الآداب، القاھرۃ، ۱۹۹۹ء، ص:۵۴

(۱۲) محمد شفیع، مفتی: "معارف القرآن" ادارہ معارف، کراچی، ج:۱، ص:۲۰۶

(۱۳) القرآن (۲:۱۲۹)

(۱۴) ایضاً (۶۲:۲)

(۱۵) آزاد، ابوالکلام، مولانا: "قرآن کا قانون عروج وزوال" مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۱۷

(۱۶) القرآن (۲:۲۵۷)

(۱۷) کیرن آرم سٹرانگ: "مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال" نگارشات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۹

(۱۸) القرآن (۹۶:۱-۵)

(۱۹) شریقی، ابراھیم، ڈاکٹر: "تاریخ اسلام" مکتبہ الاسلام، کراچی، ص: ۴۲

(۲۰) منصور پوری، محمد سلیمان سلمان، قاضی: "رحمۃ للعالمینؐ" مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۶۵

(۲۱) ول ڈیورانٹ: "اسلامی تہذیب کی داستان" نگارشات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۲۷

(۲۲) کیرن آرم سٹرانگ: "مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال" نگارشات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۴۹

(۲۳) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۱، ص: ۵۴-۵۳

(۲۴) راؤ، راما کرشنا: "محمد ﷺ" منشورات، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۸

(۲۵) نعمانی، شبلی، علامہ: "سیرۃ النبیؐ" آرمی بک کلب، راولپنڈی، ۱۹۷۹ء، ج: ۱، ص: ۵۱۲

(۲۶) نعمانی، شبلی، علامہ: "سیرۃ النبیؐ" آرمی بک کلب، راولپنڈی، ۱۹۷۹ء، ج: ۱، ص: ۵۲۰

(۲۷) القرآن (۵:۳)

(28) Michael H Hart:"The 100"Clated Press,
New Yark,1987, P-33

(۲۹) جالندھری، حفیظ: "شاہنامہ اسلام" حفیظ جالندھری ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۰۵

(۳۰) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۱، ص: ۹۰

(۳۱) شریقی، ابراھیم، ڈاکٹر: "تاریخ اسلام" مکتبہ الاسلام، کراچی، ص: ۸۳-۸۰

(۳۲) اقبال، محمد، علامہ: "کلیات اقبال" نویدا ے شیخ، لاہور، ص: ۱۵۴

(۳۳) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۱، ص: ۹۴

(۳۴) ایضاً (محولہ بالا)، ج: ۱، ص: ۹۹-۹۸

(۳۵) شریقی، ابراھیم، ڈاکٹر: "تاریخ اسلام" مکتبہ الاسلام، کراچی، ص: ۹۲

(۳۶) حمید الدین، ڈاکٹر" تاریخ اسلام "فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۷۳

(۳۷) جعفری، رئیس احمد، سید: " تاریخ اسلام " اردو منزل، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص: ۱۳۰

(۳۸) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص: ۱۱۱-۱۱۰

(۳۹) ایضاً (محولہ بالا)، ج:۱، ص: ۱۳۱

(۴۰) الدہلوی، شاہ ولی اللہ: "حجۃ اللہ البالغہ" دارالاشاعت، کراچی، ص: ۶۰۷

(۴۱) جعفری، رئیس احمد، سید: " تاریخ اسلام " اردو منزل، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص: ۱۹۰

(۴۲) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۹۲-۱۹۱

(۴۳) کلیفورڈ ای بوسورتھ: "اسلامی سلطنتیں" نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۰

(۴۴) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص: ۱۷۳-۱۷۲

(۴۵) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۸۳-۱۸۲

(۴۶) جعفری، رئیس احمد، سید: " تاریخ اسلام " اردو منزل، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص: ۲۲۵-۲۲۳

(۴۷) ندوی، معین الدین شاہ: " تاریخ اسلام " علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ج:۳، ص: ۳۲

(۴۸) شریقی، ابراہیم، ڈاکٹر: " تاریخ اسلام " مکتبہ الاسلام، کراچی، ص: ۱۸۵-۱۸۴

(۴۹) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص: ۱۹۶-۱۹۵

(۵۰) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۹۷

(۵۱) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۲۰۲

(۵۲) حمید الدین، ڈاکٹر" تاریخ اسلام "فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۵۲۶

(۵۳) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص: ۲۰۶

(۵۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۲۰۹-۲۰۷

(۵۵) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۲۱۸-۲۱۶

(۵۶) حمید الدین، ڈاکٹر "تاریخ اسلام" فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص:۵۳۹

(۵۷) عباد اللہ، خواجہ: "خلافتِ اسلامیہ" مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص:۷۲-۷۱

(۵۸) میرٹھی، زین العابدین سجاد: "تاریخ ملت" ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ج:۳، ص:۴۲۶

(۵۹) امیر علی، سید: "تاریخ اسلام" محمد حنیف پرنٹرز، لاہور، ص:۲۵۶

(۶۰) اکبر آبادی، سعید احمد، مولانا: "مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۴۷ء، ص:۲۱۵-۲۱۴

(۶۱) فرشتہ، محمد قاسم، مترجم عبدالحئی: "تاریخ فرشتہ" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء، ج:۱، ص:۲۴۷

(۶۲) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص:۳۰۲-۳۰۱

(۶۳) اکبر آبادی، سعید احمد، مولانا: "مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۴۷ء، ص:۱۰۴

(۶۴) ندوی، معین الدین شاہ: "تاریخ اسلام" علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ج:۴، ص:۶۱۱

(۶۵) امیر علی، سید: "تاریخ اسلام" محمد حنیف پرنٹرز، لاہور، ص:۴۰۳-۴۰۲

(۶۶) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۵۵۷

67 Mazhar ul Haq "A Short History of Islam" Book Land Lahore, 1997, P-702

(۶۸) ابن خلدون، عبدالرحمن، علامہ: "تاریخ ابن خلدون" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۵، ص:۱۹۹

(۶۹) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۳۶۷-۳۶۶

(۷۰) ندوی، معین الدین شاہ: "تاریخ اسلام" علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ج:۴، ص:۶۵۸

(۷۱) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۱، ص:۳۷۱-۳۷۰

(۷۲) اکبر آبادی، سعید احمد، مولانا: "مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۴۷ء، ص:۱۱۶-۱۱۵

(۷۳) شریفی، ابراہیم، ڈاکٹر: "تاریخ اسلام" مکتبہ الاسلام، کراچی، ص:۳۶۴

(۷۴) اکبرآبادی، سعید احمد، مولانا: "مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۴۷ء، ص: ۱۴۲-۱۴۱

(۷۵) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۶۸-۱۶۴

(۷۶) چیمہ، غلام رسول: "اسلام کا سیاسی نظام" علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۵۱۶-۵۱۴

(۷۷) صدیقی، ثناءالحق: "زوال سلطنت مغلیہ" ادارہ دانش وحکمت، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۱

باب دوم

اُمّتِ مُسلمہ

کا عروج و زوال مفکرین و مجتہدین کی نظر میں

فصل اوّل : مسلم مفکرین و مصلحین کی نظر میں

فصل دوم : مفسرین و مجتہدین کی نظر میں

فصل سوم : نومسلم مفکرین کی نظر میں

باب دوم

اُمّتِ مُسلمہ کا عروج وزوال مفکرین و مجتہدین کی نظر میں

فصل اوّل

مسلم مفکرین و مصلحین کی نظر میں

امام غزالیؒ (۱۰۵۹ء - ۱۱۱۱ء)

امام غزالیؒ نیشا پور کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ان کی ذہانت کا عملی ثبوت یہ ہے کہ کم عمری ہی میں ان کے علم و فضل کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ دوسری صدی ہجری کے بعد امام غزالی کے زمانے تک تجدید دین کی کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی جس کا خاص طور سے ذکر کیا جائے۔ پانچویں صدی میں جب کہ امام غزالی نے عروج حاصل کیا سلطنت سلجوقیہ اپنے شباب پر تھی اور خلافت کی طاقت برائے نام تھی۔ عوام سے لے کر علماء تک درباری رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مدارس و مکاتب کی بنیادیں قائم کی جا رہی تھیں لیکن خود دین اسلام اسلامی حکومتوں میں غریب و بے وطن تھا۔ نظام اسلامی کی تجدید کا خیال تک مسلمانوں کے دلوں سے محو ہو چکا تھا۔ امام غزالی کی عملی زندگی کا آغاز مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی سے ہوا جہاں آپ نے علوم مروجہ کی درس و تدریس میں کافی شہرت حاصل کی۔ آپ نے فلسفہ و علم کلام میں وہ کمال پیدا کیا کہ تمام گذشتہ مسلم حکماء کی تصانیف آپ کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ آپ نے فلسفہ یونان کی کورانہ تقلید کو جائز نہیں رکھا بلکہ یونانی حکمت اور اس کی تقلید سے پیدا شدہ مضر اثرات کی بے حد مذمت کی۔ اس زمانے میں آپ سلاطین سلجوقیہ کے مقربین میں سے تھے اور سلاطین کی عنایات کی بے حد بارشیں آپ پر ہوتی تھیں۔

۴۷۸ھ میں یکا یک آپ کی حالت میں تبدیلی ہوئی آپ نے بغداد کو چھوڑ کر صحرا کی راہ لی۔ تمام اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ فاقہ کشی اور ریاضات کے ذریعہ بہت محنت شاقہ برداشت کی عرصہ دراز کے بعد ایک جگہ سکونت اختیار کی۔ لیکن تقرب شاہی سے آخر عمر تک پرہیز کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے اپنی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" لکھی۔ اور حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلامی اخلاق کی صحیح تعلیم پیش کی۔ اس عہد کی حکومت کے خلاف آپ نے علی الاعلان کہا کہ موجودہ حکومتوں کا پورا نظام غیر اسلامی اور ناجائز ہے۔ آپ کا سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اخلاق اسلامی کی تعلیمات کو مسلم عوام کے سامنے پیش کیا اور بیرونی اثرات کی مذمت کے ساتھ ہی مسلم حکمرانوں کے استبداد وجور کے خلاف آواز حق بلند کی۔ (۱) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین میں سب سے اہم فریضہ ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام کو بھیجا ہے۔ اگر اس فریضہ کو چھوڑ دیا جائے تو دین داری مضمحل ہو جائے گی اور معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہو جائے گا۔ گمراہی و جہالت عام ہو کر بگاڑ و فساد کا سبب بنے گا۔

امام غزالی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "احیاء العلوم" میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علماء کی عادت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں یہ تھی کہ بادشاہوں کے دبدبہ کی پرواہ کم کرتے تھے بلکہ اگر اللہ تعالیٰ انکو محفوظ رکھتا تھا تو اس کے فضل پر تکیہ کرتے تھے اور اگر شہادت روزی کرتا تھا تو اس کے حکم پر راضی تھے اور چونکہ انہوں نے اپنی نیت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کر لی تھی اس لئے ان کے کلام کی تاثیر دلوں میں ہوتی تھی کہ دل نرم ہو جاتے تھے اور سختی دور ہو جاتی تھی اور اب تو طمع نے علماء کی زبان روک دی ہے کہ وہ کچھ کہتے ہی نہیں اور اگر کہتے ہیں تو اس وجہ سے کہ ان کا قول موافق ان کے حال کے نہیں ہوتا اس سے کچھ فائدہ مرتب نہیں۔ اگر وہ سچے ہوتے اور علم کا حق محفوظ رکھتے تو فلاح پاتے کیونکہ رعیت کی ساری خرابی بادشاہوں کے خراب ہونے سے ہے اور بادشاہوں کی خرابی علماء کی خرابی سے ہے اور علماء کی خرابی مال و جاہ کی محبت سے ہے تو جس شخص پر دنیا کی محبت غالب ہوگی وہ رذیلوں اور ذلیلوں پر بھی حسبت (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) نہ کر سکے گا۔ (۲)

امام غزالیؒ اپنے دور کے علماء کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ علماء کی کمزوری و خرابی نے امت مسلمہ پر برے اثر ڈالے اور آج بھی حکمران اپنی سیاست کو چمکانے اور عیوب کو چھپانے کے لئے علمائے سوء کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون: (۱۳۳۲ء - ۱۴۰۶ء)

ابو زید ولی الدین عبد الرحمن ابن خلدون کے نام سے مشہور ہیں ۷۳۲ھ میں تونس میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۰ سال میں

اپنی تعلیم مکمل کر کے اساتذہ سے اجازت یعنی سند حاصل کر لی۔ اس کے بعد ابن خلدون نے کئی ممالک کا سفر کیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ ابن خلدون ہر چیز سے پہلے ایک سیاست دان، حکیم اور ذہین شخص تھا۔ (۳)

علامہ ابن خلدون نے تاریخ اور اپنے تجزیے کو اتنے بہترین انداز میں پیش کیا کہ آج تک اس کا نام زندہ ہے۔ ابن خلدون نے ۱۴۰۶ء میں ۷۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

قوموں کے عروج و زوال اور تاریخ کی مختلف کروٹوں کے اسباب کے بارے میں ابنِ خلدون نے سب سے پہلے ایک غلط فہمی کی تردید کی ہے۔ وہ غلط فہمی یہ تھی کہ قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ان کے افعال اور اعمال کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ دیوی دیوتا اور فوق الفطرت قوتیں قوموں کو بناتی ہیں یا بگاڑتی ہیں۔ ابنِ خلدون کا سب سے پہلا کارنامہ تو ہے کہ اس نے اہلِ فکر اور مورخین کو توہم پرستی سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور قومی مسائل کو عقل کی روشنی میں سمجھنے اور حل کرنے کی ترغیب دی۔ ابنِ خلدون نے قطعی طور پر تسلیم کیا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال پر بعض اوقات کچھ ایسی قوتیں بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں جو انسان کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ قدرت کا عام قانون یہی ہے کہ قومیں اپنی قسمت خود بناتی ہیں اور وہ اپنے عروج و زوال کی خود ذمہ دار ہوتی ہیں۔ قوموں کے عروج کے اسباب میں ابنِ خلدون نے سب سے زیادہ اہمیت جس جذبے کو دی ہے اسے وہ "عصبیت" کہتا ہے۔ ابنِ خلدون نے لفظ "عصبیت" کو نئے معنی دیے ہیں۔ ابنِ خلدون کی تحریروں میں "عصبیت" سے وہ قوت مراد ہے جو کسی گروہ یا قوم میں محبت، اخوت اور یکجہتی کے شدید احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ جب افراد مل کر ایک گروہ بن جاتے ہیں یا گروہ قبیلے بن جاتے ہیں، قبیلے قوم بن جاتے ہیں تو ان میں آپس میں ایک دوسرے کی بقا اور ترقی کے لیے ایک شدید قسم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس جذبے کا برقرار رہنا قوم کی بقا اور ترقی کے لیے اشد ضروری ہے۔ چنانچہ ابنِ خلدون نے قوموں کے عروج و زوال کے مباحث میں "عصبیت" کو بہت اہمیت دی ہے۔ ابنِ خلدون کی رائے میں جس طرح انسان پر شباب آتا ہے اور اس کے بعد ضعیفی، اسی طرح قومیں بھی اسی قسم کی منازل سے گزرتی ہیں۔ البتہ قوموں کے عمر رسیدہ اور کمزور ہونے کے کچھ معاشی اسباب ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل اسباب خاص طور پر اہم ہیں:

اول: عیش و عشرت کے مشاغل میں ضرورت سے زیادہ اضافہ، دوم: "عصبیت" میں کمی،

سوم: معاشی بداعمالی (۴)

جب قوم میں "عصبیت" ختم ہو جاتی ہے تو کوئی طاقتور قوم اس پر حملہ کر دیتی ہے۔ حملہ آور قوم کی "عصبیت" بہت شدید ہوتی ہے اور وہ مفتوح قوم پر غالب آ کر اسے بھی اپنی عصبیت میں شامل کر لیتی ہے اور اس طرح ایک قوم کا زوال اور دوسری کا عروج شروع ہو جاتا ہے۔

زوال سلطنت اور ضعف مملکت کے چند اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ ابنِ خلدون نے بہت اہم نکات کی نشاندہی کی ہے۔ اول شخصی حکومت سلطنت کو کمزور کرتی ہے اس لیے کہ جب تک جدت اور رعب و دبدبہ قوم اور عصبیت میں مشترک رہتا ہے قوم کی مجاہدانہ سعی و کوشش کا قدم ملکی ترقی کے لیے آگے بڑھتا رہتا ہے اور سب کی کوشش غیروں اور بیگانوں پر تغلب حاصل کرنے اور اپنے ملک کی حفاظت کی طرف مصروف رہتی ہے۔ لیکن جب قوم میں شخص واحد (سلطان) تمام عزو شرف پر حاوی ہو کر عصبیت قومی کو توڑتا ہے اور اُسے آزادی و اختیار سے محروم کر کے عطیات و انعام میں غیروں کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ تو قوم بھی جنگ و جہاد میں سستی کرنے لگتی ہے .... آخر یہی بات ضعف قوت اور زوال شوکت کا باعث ہو جاتی ہے۔ اور ملک والوں کی شجاعت و جرأت کے زوال اور عصبیت کے برباد ہو جانے کی وجہ سے سلطنت تنزل اختیار کرتی ہے۔

دوسری وجہ ضعف سلطنت کی یہ ہے کہ حصول ملک و افراط دولت کے بعد قوم و ملک پر تکلف و تعیش اور ناز و نعمت کا اثر پڑتا ہے، لوگوں کی ضرورتیں بڑھتی ہیں، آمدنی سے خرچ زیادہ ہو جاتا ہے اس لیے مفلس و نادار ہلاک ہوتے ہیں۔ اور تکلف پسند لوگ اپنی آمدنی کو اسراف بے جا اور بے مقصد امور میں اڑاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ برباد کن اطوار ترقی کرتے رہتے ہیں..... اس کے علاوہ تکلف و عشرت پسندی نفوس انسانی میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کر کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں اس لیے وہ تمام نیک عادتیں جو حصول ملک و قوم سلطنت کے اسباب اور علامتیں ہیں، زائل ہو جاتی ہیں۔ اور ملک عادات قبیحہ میں گرفتار ہو کر آپ اپنی پستی و خاتمہ سلطنت کی دلیل بنتا ہے۔ اسباب زوال مہیا ہو جاتے ہیں اور حالت بگڑنے لگتی ہے اور مرض ضعف کچھ ایسا زور پکڑتا ہے کہ سلطنت کا خاتمہ ہی کر دیتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ملک و سلطنت کے حاصل کرنے کے بعد قوم کا آرام پسند ہونا فطری بات ہے۔ پس جہاں قوم نے جد و جہد اور محنت و مشقت کو چھوڑ کر آرام و سکون پسند و اختیار کیا۔ عام اخلاق و عادات کی طرح یہ باتیں بھی عادات ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اور آنے والی نسلیں عیش و عشرت، راحت و آرام، سکون و اطمینان کے گہواروں میں پرورش پاتی ہیں...... اس لیے سلطنت کی حمایت و حفاظت میں کمی اور نقصان آتا ہے، ہیبت و رعب جاتا رہتا ہے، شوکت مٹ جاتی ہے۔

اور آخر انہی باتوں سے سلطنت کی جڑیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں اور اُس پر زوال و وبال آنے لگتا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا ہے قوم فاتح کے اخلاق بدلتے رہتے ہیں۔ تہذیب و تمدن و آرام پسندی، راحت و سکون رنگینی صحبت کا رنگ طبیعت پر روز بروز چڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بدویت و جفاکشی کو بالکل چھوڑ کر بندہ عیش و عشرت کے بن جاتے ہیں۔ (۵)

قوموں کے زوال کے اسباب کے بارے میں ابنِ خلدون نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ سلطنت کے انحطاطی دور میں شاہی دربار میں ایک عہدہ قائم کر دیا جاتا ہے جسے حاجب یا دربان کہتے ہیں۔ شروع شروع میں تو یہ عہدہ بظاہر بے ضرر ہوتا ہے، یعنی حاجب یا دربان کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ بلا وجہ اور بے ضرورت کسی کو بادشاہ تک نہ آنے دے اور بادشاہ کی حفاظت کی جا سکے اور امور سلطنت میں بادشاہ کی مصروفیتوں میں خلل نہ پڑے، لیکن جوں ہی سلطنت کا نظام غلط ہاتھوں میں جاتا ہے یا خود بادشاہ کوتاہ اندیشی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بادشاہ سے اس کی رعایا کو دور رکھنے کی کوششیں کی جاتی ہیں اور اس کے لیے حاجب اور دربان کے عہدے قائم کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابنِ خلدون نے مسلمان سلطنتوں، یعنی بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتوں، کی مثالیں دی ہیں اور بیان کیا ہے کہ اس دور میں حاجب کے فرائض، اختیارات اور دائرۂ عمل میں اضافہ ہوتا گیا اور حاجبین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ دولتِ عباسیہ کے دور میں ایک سے زیادہ حاجب مقرر ہوئے۔ (٦)

امام شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۳ء)

شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی ۱۷۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ برِ کوچک پاکستان و ہند میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو بہت سے لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ زوال کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا۔ ان لوگوں میں عہد مغلیہ کے مشہور عالم اور مصنف شاہ ولی اللہ تا ۱۷۶۳ء کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مجدّد الف ثانی اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا شاہ ولی اللہ نے اس کام کی رفتار اور تیز کر دی۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ مجدد الف ثانی چونکہ مسلمانوں کے عہد عروج میں ہوئے تھے، اس لیے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے پھیل گئی تھیں، لیکن شاہ ولی اللہ چونکہ ایک ایسے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بھی غور کیا اور اس کے علاج کے طریقے بھی بتائے۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی کے انتقال کے تقریباً اسی سال بعد دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی چار سال کے تھے کہ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہو گیا اس کے چند سال بعد مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو گئی۔

سارے ملک میں بدامنی پھیل گئی اور مرہٹے ملک کے بہت بڑے حصّہ پر قابض ہونے کے بعد دہلی پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔

مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت خراب تھی، بلکہ وہ اخلاقی حیثیت سے بھی زوال کی طرف جارہے تھے۔ آرام طلبی، عیش وعشرت، دولت سے محبت، خودغرضی، بے ایمانی اور اسی قسم کی دوسری خرابیاں ان میں عام ہوگئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف وتالیف اور اصلاح کا کام اسی نازک زمانہ میں شروع کیا۔ ۱۱۷۶ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ (۷)

یہ حقیقت ہے کہ جب اللہ کے بندے اللہ کی بندگی کے بجائے طاغوت کے حکم پر اپنے نفس کو لے کر چلتے ہیں تو ایک مہلت کے بعد اس کو پکڑ لیا جاتا ہے لہٰذا نعمت خداوندی پر شکر کے بجائے سرکشی، قوم وملت کو سرنگوں کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اکثر ملک ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں شیطان کی بندگی کا غلبہ ہوتا ہے اور وہاں کے لوگ بہائم کے سے نفوس رکھتے ہیں لیکن خاص مدت تک جزائے عمل کو ان سے موقوف رکھتے ہیں خداتعالیٰ فرماتا ہے۔

کسی گاؤں میں ہم نے نبی نہیں بھیجا کہ ہم نے خوشی اور نقصان میں ان کی پکڑ نہ کی ہو۔ تاکہ وہ نیازمند ہوجائیں پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی سے بدل دی یہاں تک کہ وہ اور انہوں نے کہا کہ ہمارے باپ دادوں کو تکلیف پہنچتی تھی تب ہم نے دفعۃً ان کو پکڑ لیا بے خبری میں اور اگر گاؤں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقوٰی اختیار کر لیتے تو ہم آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ان کے اعمال کی وجہ سے ہم نے ان کی پکڑ کی اور یہ حال ہے کہ دنیا میں جزاوسزا کا حال آقا کا سا ہے جو دارو گیر کے متعلق خوب طرح فارغ نہ ہوا اور جب قیامت کا دن آوے گا تو وہ پورے فراغ کے ساتھ اس کو پورا کرے گا۔ (۸)

شاہ ولی اللہ جانتے تھے کہ سب سے اہم ذمہ داری علماء کی ہے مگر معاملہ یہ ہوگیا ہے کہ علماء اپنی ذمہ داری امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بجائے بادشاہ وقت کے تقرب اور جاہ ومنصب کے طلبگار ہوتے جارہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ دین کو پھیلانے کے جذبہ سے عاری صرف اپنے اوپر اہل علم کی چھاپ لگا کر سلاطین سے اعزاز ومرتبہ حاصل کرنے کا شوق ان کو اپنے اصل مقصد سے بیگانہ کیے ہوئے ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

اے عالمانِ دین ومفتیانِ شرعِ متین، جان لو کہ جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع وآلات کی ہے مثلاً صرف ونحو وغیرہ ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو۔

نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔ تم نے اپنے حالات اور طرزِ عمل سے لوگوں کو یہ باور کرایا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہوگئی ہے حالانکہ ابھی بڑے بڑے علاقے علماء سے خالی پڑے ہیں اور جہاں علماء ہیں وہاں بھی دینی شعائر کا غلبہ نہیں ہے۔(۹)

تفہیمات الٰہیہ جلد دوم میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور گروہوں کو بھی عام خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیے، تم پر تنگ دلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہوگئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزہ بن گیا ہے........ اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہوگیا ہے....... تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لیے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں....... نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کرلو گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی رکھو گے حتٰی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گئے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔ (۱۰)

جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء - ۱۸۹۷ء)

جمال الدین افغانی ۱۸۳۹ء میں اسعد آباد، کابل میں پیدا ہوئے، اٹھارہ سال کی عمر تک تمام علوم دینی کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم بھی حاصل کی۔ برعظیم پاک و ہند کی سیاست میں حصہ لینے کے حوالے سے بھی ان کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کیونکہ انہوں نے اور علامہ اقبال نے مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند کی فکری اور اصلاحی رہنمائی کی۔ وہ عالمی اتحاد اسلامی کے داعی اور مبلغ تھے۔ افغانستان میں انہیں امیر دوست محمد خان نے ۱۸۶۹ء میں ایک وزیر کا منصب دے دیا تھا۔ لیکن انگریزوں کی سازش سے جب افغانستان میں بغاوت ہوئی تو وہ برعظیم میں آ گئے اور پھر قاہرہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے جامعہ ازہر کے علماء شیوخ سے ملاقاتیں کیں اور کئی خطبے دیئے۔ ۱۸۷۱ء میں وہ استنبول ترکی چلے گئے۔ ترکی کے لوگوں نے ان کا دل کھول کر استقبال کیا۔ یہاں پر انہوں نے احمدیہ مسجد میں متعدد خطبات دیئے۔ اور ان کی اتحادِ عالمی کی تحریک کے باعث مسلمانانِ عالم میں ایک تحریک پیدا ہوئی۔

ان کی تحاریک پر انگریزوں نے بھی نظر رکھی تھی۔ اس لیے انہیں کئی طرح کی مخالفتوں اور انگریز دشمنیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ اپنے مشہور شاگرد محمد عبدہٗ کے پاس پیرس چلے گئے۔ یہاں پر انہوں نے قلم سے اپنے اذکار و خیالات کا اظہار شروع کیا۔ عربی زبان کا ایک پرچہ "عروۃ الوثقیٰ" شائع کیا، اور اس کے ذریعے وحدت اسلامی کے حق میں انہوں نے بے شمار مضامین لکھے۔ اس جد و جہد نے مسلمانوں میں کئی اسلامی تحریکوں کا آغاز کر دیا۔ وہ اتحادِ عالم اسلامی کے ایک ممتاز حامی اور موئید تھے۔

موجودہ دنیائے اسلام میں جو کچھ آزادی اور زندگی کے آثار آج پائے جاتے ہیں ان میں سے زیادہ تر جمال الدین افغانی کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری میں تمام اسلامی دنیا مغربی استعمار کے ہاتھوں غلام ہوتی جارہی تھی خود خلیفہ اسلام انگریزی مفاد کے خلاف ایک قدم نہ اٹھا سکتا۔ ایک طرف مغربی طاقتیں اپنی حکمت عملی اور جدید طرز سیاست کی بنا پر پورے مشرق پر چھائے چلی جارہی تھیں۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے رہنما قدامت پرستی اور تقلید کورانہ کے اسیر تھے۔ علامہ جمال الدین کی دوربین نگاہوں نے مغرب اور مشرق کی کشمکش کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور تمام زوال و انحطاط کے اسباب کو شہنشاہیت کی لعنت پر محمول کیا۔ آپ کی ذہانت و ذکاوت کا یہ حال تھا کہ ترکی اور روسی زبانیں آپ نے چند ماہ میں سیکھ لی تھیں۔ فرانسیسی زبان میں آپ کو بے حد قدرت تھی جس کا اعتراف ڈاکٹر ریناں جیسے عالم نے بھی کیا۔ علوم قدیم وجدید دونوں میں آپ کو برابر دسترس حاصل تھی، خطابت میں آپ کو وہ کمال تھا کہ ہر سننے والا اپنے اندر فوراً ایک انقلاب محسوس کرتا تھا۔ (۱۱)

علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں ان کی سعی وجد و جہد پر اس طرح اظہار کیا ہے

سید السادات مولانا جمال

زندہ از گفتار او سنگ و سفال (۱۲)

جمال الدین افغانی نے تمام اسلامی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کو اپنا نصب العین بناتے ہوئے ہر ملک میں کافی وقت صرف کیا اور وہاں ملوکیت کے خلاف نفرت اور احیاء ملت اور اتحاد امت کی دعوت دیتے رہے۔

سلطان عبدالحمید خان کی دعوت پر ۱۸۹۲ء میں استنبول پہنچے اور وہی ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو انتقال کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ چونکہ جمال الدین افغانی استبدادی نظام کے خلاف تھے لہٰذا ترکی میں سلطان عبدالحمید خان سے نبھاہ نہ ہوسکا تو آخر کار سلطان نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔

جمال الدین افغانی اپنی استطاعت کے مطابق جتنی کوششیں کر سکتے تھے کرتے رہے۔ اپنی تقریری و عملی کوششوں سے امت کے زوال کی نشاندہی بھی کرتے اور اسکے دور کرنے کے لیے آخر وقت تک سرگرداں رہے۔ مختلف عنوانات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

اے سرمایہء رجال! اے بہادروں کے اخلاف، اے جوانمردوں کی اولاد! کیا زمانہ تم سے پلٹ گیا؟ کیا تلافی کا وقت گذر گیا اور کیا عالم یاس آ گیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ خدا نہ کرے کہ زمانہ تم سے امید منقطع کرے۔ ادرنہ سے پشاور تک اسلامی حکومتیں ہیں۔ جغرافیائی حدود کے اتصال اور قرآن مجید نے انہیں عقیدۂ واحد پر متحد کر رکھا ہے۔ ان کی تعداد پچاس کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔ یہ شجاعت و بسالت کے لحاظ سے دلیرانِ جہاں میں ممتاز ہیں۔ کیا ان سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ یہ اپنی مساعی اور مختلف اقدامات میں دوسری اقوام کی مانند اتحاد کر لیں؟ یہ لوگ اگر اتفاق و اتحاد کر لیتے تو کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان کے دین کی اساس اتحاد پر ہے۔ کیا ان کے حواس کام نہیں کرتے کہ یہ اس بات کا احساس کریں کہ ایک کی احتیاجات دوسرے سے وابستہ ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایسا نہیں جو خدا کے حکم "مومن بھائی بھائی ہیں"۔ کے مطابق اپنے بھائی کا بھی خیال رکھے؟ پس اگر یہ ایک مضبوط دیوار بن جائیں تو ان طوفانوں کا دفاعی مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان پر ہر طرف سے رُخ کیے ہوئے ہیں۔

خدا کا وعدہ سچا ہے کہ وہ مخلص اہل ایمان کو غالب اور معزز رکھے گا.... تاریخ اسلام کو سامنے رکھ لیں کہ مٹھی بھر اہل ایمان مخالفین کے جم غفیر کو پسپا کرتے رہے ہیں۔ آج ہم کروڑوں ہو کر بے بس کیوں ہیں؟ اخلاص فی العمل اور وحدت کا فقدان ہے۔ عزت و وقار رفاہ، امن و سلامتی اور ذہنی سکون ایسی اقوام کو ملتا ہے جن میں سعی پیہم کا جذبہ اور نورِ عقل کی فراہم کردہ بصیرت موجود ہو۔ مقاصد کی بلندی اور ان تک پہنچنے کی تڑپ جامہء کامیابی کا تانا بانا ہے.... آج جس مقصد عظمٰی کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، وہ مسلمانوں کو متحد اور ان کو اپنی آزادی اور دفاع کی خاطر آمادہ و مجہز کرنا ہے..... نفاق و افتراق کے مبلغ، دنیا و آخرت پر ترجیح دینے والے عقیدہ کو عمل سے متجزی رکھنے اور دوسروں کے دکھوں کا احساس نہ کرنے والے کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے معنوی وجود کا مثبت ثبوت نہیں دے سکتے..... انگریز افغانستان میں فوجی کاروائی کرتے رہے اور افغانیوں کے دینی بھائی اہل بلوچستان اپنے گھروں میں چین سے بیٹھے رہے۔ ان کی رگِ حمیت نہ پھڑکی اور وہ افغانوں کی حمایت میں ایک کلمہ نہ کہہ سکے۔ ادھر ایرانیوں پر انگریزوں کے مظالم کے دوران افغانیوں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی.... حال ہی میں انگریز استعمار پسندوں کی شہ پر مصر میں کشتوں کے پشتے لگ گئے اور ملتِ اسلامیہ نے اپنے بھائیوں کے دکھ درد کی کوئی پروانہ کی۔ یہ عقیدہ و عمل کا کتنا بین تباین تضاد ہے!

دین کے پرچم تلے سروری حاصل کرنا اور دین کو بالائے طاق رکھ کر دنیوی عروج پر فائز ہونا دو مختلف صورتیں ہیں۔ اسلام ہر قسم کی علمی وفنی ترقی کا بے حد مؤید ہے۔ مسلمانوں نے دین پر عمل کرنے کے دور میں زیادہ ترقی کی مگر مسیحیوں نے اس سے رستگاری پا کر عروج پایا اور اسی سے دونوں ادیان کا فرق واضح ہے۔ جادۂ اعتدال پر چلنے والے اور اپنے حقوق کی خاطر متحداً سعی کرنے والے کبھی ناکام نہیں رہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے کسی خطے سے متعلق ہو، اس کی زبان، قومیت، نسل اور رنگ جو کچھ بھی ہو اسلام لانے کی بناء پر وہ عالمگیر اسلامی برادری کا رکن بن جاتا ہے۔ اسلامی عصبیت کے ماسوا، اس کی ساری عصبیتیں دب جاتی ہیں۔ مغربی استعمارگروں کی کوشش یہی رہتی ہے کہ مسلمانوں کو اس عصبیت سے محروم کر دیں۔ وہ خود بے شمار لایعنی عصبیتوں کا شکار ہیں مگر ہمیں دینی عصبیت وحمیت کے جذبے سے خالی دیکھنا چاہتے ہیں.... اسلام پر ایمان لانے والے جس قدر اپنے عقیدہ وعمل میں مخلص ہو، اسی قدر وہ وطن، قبیلہ اور نسل وغیرہ کے مصنوعی اور 'تعارفی' بندھنوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ایمان باللہ کے توحیدی تقاضے یہ ہیں کہ مسلمان فروعی اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک عالمگیر رشتۂ اتحاد میں سب منسلک ہو جائیں اور ہماری ناچیز مساعی کا بڑا ہدف یہی امر ہے۔ (۱۳)

امت مسلمہ کی بے حسی نے طاغوتی قوتوں کو سر پر چڑھ کر بولنے کا موقع دیا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فرداں ہیں۔

امیر البیان علامہ شکیب ارسلان: (۱۸۶۹ء - ۱۹۴۶ء)

علامہ شکیب ارسلان ۱۸۶۹ء کو لبنان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بیروت کے مدرسہ دارالحکمت میں تعلیم پائی۔ امیر شکیب ارسلان ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۶ء تک زیادہ تر سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں رہے جہاں انہوں نے اپنا مرکز قائم کر لیا تھا۔ چونکہ جمعیت اقوام کا مرکز بھی اسی شہر میں تھا اس لیے وہ یہاں سے اسلامی دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ جنیوا سے وہ (La Nation Arabe) کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک رسالہ نکالتے تھے جو عربوں کی آزادی اور اسلامی دنیا کے مسلمانوں کے حقوق کا پرزور علمبردار تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب فرانسیسیوں نے مراکش کے قبائل پر فرانسیسی قانون فوجداری کے اطلاق کا فیصلہ کیا تو امیر شکیب ارسلان نے پوری اسلامی دنیا میں اس کے خلاف اور اسلامی قانون کے حق میں پرزور مہم چلائی۔ (۱۴)

امیر شکیب ارسلان نہ صرف عربوں کی آزادی کے بلکہ ساری اسلامی دنیا کے مسائل سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔

وہ اتحادِ اسلامی کے زبردست علمبردار تھے اور اسلام کو عرب قومیت پر ترجیح دیتے تھے۔ اور۔ وفات سے کچھ قبل بیروت آگئے تھے اور وہیں ۱۹۴۶ء میں انتقال کرگئے۔

علامہ شکیب ارسلان یہ جانتے تھے کہ عصر حاضر کے کیا تقاضے ہیں اور مسلمانوں میں ایک طبقہ کا یہ حال ہے کہ اسلام کے نام پر عصر حاضر کے تقاضوں سے منہ موڑ کر اسلام کی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف ملحدانہ نظریہ مکمل اسلامی تعلیمات سے متنفر ہے اور وہ اسلام کو مکمل طور پر جڑ سے اکھاڑ کر مغرب کا دلدادہ بنانا چاہتا ہے۔

اسلام کے تنزل کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تنزل کی دو وجوہات یہ ہیں:

ایک تعصب اور تنگ نظری اور دوسرے مادہ پرستی اور الحاد۔ میری رائے ہے کہ جس طرح ملحد لوگ جو پرانے رسوم و عقائد کی بیخ کنی چاہتے ہیں، اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح متعصب اور تنگ نظر لوگ بھی جو پرانی لکیر کو پیٹنا چاہتے ہیں اور کسی بھی مفید اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر جدید بات کا اختیار کرنا خواہ وہ کتنی بھی مفید ہو، موجب کفر ہے، اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انہی متعصب اور ملحد لوگوں نے اسلام کو بدنام کیا ہوا ہے۔ مادہ پرست اور الحاد پرور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں اور مشرقیوں کو فرنگیوں کے ساتھ اس طرح ملا دینا چاہتے ہیں کہ اس ملاپ کے بعد مسلمانوں کا اپنا کوئی قومی امتیاز باقی نہ رہ جائے اور وہ فرنگی تمدن میں جزو کیمیاوی کی طرح تحلیل ہوکر رہ جائیں اور فرنگیت کے سوا ان کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہ سکے۔ یہ کوشش ان کی طرف سے عمل میں آرہی ہے جو یورپین تہذیب سے شکست کھانے کے بعد معترف ہیں کہ ان کے بزرگ اور وہ خود، پست اور ذلیل ہیں۔ وہ ذلت سے نکلنے کے لیے اپنے حسب ونسب، تہذیب اور رسوم سے صاف طور پر انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانون فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قوم اپنے خاص رسوم، لباس، آداب، عقائد، کھانے، پینے اور رہنے سہنے کے طریقے پر قائم رہے اور اپنے ماحول کے مطابق قدرتی زندگی بسر کرے۔ (۱۵)

علامہ نے اقوام یورپ کی زندگی اور آزادی کا راز بتاتے ہوئے ایک حوالہ جاپان کا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یورپی نامہ نگار نے کہا کہ:

"جاپان کے سیاسی انقلاب میں مذہب کا اثر موجود ہے"۔ حالانکہ اہل جاپان کا مذہب حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے، بجز اس کے کہ باپ دادا کے چھوڑے ہوئے رسوم اور عادات کی پیروی کی جائے اس کے باوجود آج کل کے جاپانی جونئی تہذیب کے تمام ساز وسامان سے آراستہ ہیں۔

نہ تو اپنے ماضی کو بھولتے ہیں اور نہ اپنی قومیت کو ترک کر کے اہل مغرب کی آواز کو سنتے ہیں وہ مغربیوں سے صرف وہی چیزیں لیتے ہیں جن کی امداد سے وہ اہل مغرب سے جنگ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوسکیں۔(۱۶)

مسلمانوں کے سوا دنیا کی تمام قومیں اپنی قومیت، دین، رسم و رواج، عادات و اخلاق اور تمام قدیم موروثی باتوں کی حفاظت پر کمر بستہ ہیں۔لیکن مسلمانوں کا حال دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے۔انہیں جب کبھی کوئی مخلص مسلمان قرآن کریم کی طرف بلاتا ہے یا اسلامی عقائد، رسم و رواج، عربی زبان اور مشرقی زندگی پر قائم رہنے کے لیے کہتا ہے تو نئی روشنی کے مسلمان ان کے خلاف آوازیں اٹھاتے ہیں اور متعصب قرار دے کر یہ ارشاد فرمانے لگتے ہیں۔ "تم کس طرح ترقی کر سکتے ہو، جبکہ اس نئے زمانے میں پرانے زمانہ کی باتوں پر عمل کرنے کے درپے ہو؟"۔

ہمیں لوگوں کی عقل پر رونا آتا ہے۔وہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں نے ترقی کی ہے، وہ آگے بڑھ گئی ہیں، وہ آسمان پر اڑی جا رہی ہیں اور انہی ترقی یافتہ قوموں میں سے عیسائی آج تک انجیل اور گرجا پر، یہودی اپنی توریت اور تلمود پر اور جاپانی اپنے پت اور مقدس چاول پر قائم ہیں۔لیکن یہ مغرب زدہ مسلمان جو غلام اور پس ماندہ ہیں، یہی کہے جا رہے ہیں کہ ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے، جب تک ہم اپنے قرآن، اپنے عقیدہ، قومی رسم و رواج، کھانے پہننے کے طریقوں کو نہ چھوڑ دیں اور اپنی قومی تاریخ سے علیحدہ نہ ہو جائیں۔یہ عقلمندی ہے یا پاگل پن ہے؟..... ہمارے نزدیک تنگ خیال لوگوں نے اسلام کو جو نقصانات پہنچائے، وہ ملحدوں کے نقصانات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں، بدنیتی سے نہیں بلکہ جہالت سے کرتے ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تنگ خیال قدامت پسندوں نے اسلام کے دشمنوں کا راستہ صاف کر دیا ہے اور انہیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام پر یہ الزام لگائیں کہ اسلامی تعلیم ترقی کے منافی ہے۔پھر اسی تنگ خیال جماعت نے مسلمانوں کو دنیا سے الگ کر کے اسلام کو محض آخرت کا دین بنا دیا ہے....... حالانکہ خدا کی شریعت نہیں چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔(۱۷)

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔اس کے چند سال بعد ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے جہاں انگلستان اور جرمنی میں انہوں نے قانون اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔اور میونخ یونیورسٹی سے "فلسفہ عجم" نامی کتاب لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔۱۹۰۸ء میں وہ پنجاب واپس آگئے۔

اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر اور مفکر تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار نظم اور نثر دونوں میں کیا۔ وہ انگریزی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے اور تینوں زبانوں میں انہوں نے لکھا۔ ان کا پیغام اسلام کا پیغام تھا جس کی وجہ سے اقبال کو شاعر اسلام کہا جاتا ہے۔ انہوں نے سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں کی طرح معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کیا اور اس بات پر زور دیا کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی نجات صرف اسلام کے پیغام میں مضمر ہے۔ اقبال نے دفاعی انداز ترک کر کے خود مغربی تہذیب اور مغربی افکار پر جن کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے سخت تنقید کی۔ انہوں نے کہا کہ دین اور سیاست کی علیحدگی کا تصور قطعی غیر اسلامی ہے اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ہے۔ انہوں نے وطنیت، قوم پرستی اور نسل پرستی کی شدت سے مخالفت کی۔ انہوں نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے کمزور پہلو بتائے اور کہا کہ صحیح انصاف صرف اسلام کے عدل اجتماعی کے تصور کے تحت مل سکتا ہے۔ برصغیر کی سیاست میں اقبال نے متحدہ قومیت کے نظریہ پر تنقید کی اور کہا کہ مسلمان ایک مستقبل قوم ہیں وہ کسی دوسری قومیت میں ضم نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے ملوکیت یعنی بادشاہت کے نظام کو اور آمریت کو اسلامی تعلیم کے خلاف بتایا اور کہا کہ حقیقی جمہوریت اسلامی نظام کے تحت ہی قائم ہو سکتی ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کا جو نظام قائم ہوا وہ اسلام کی روح کے خلاف تھا۔ (۱۸) ملت اسلامیہ کے اس محسن و مفکر کا انتقال اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوا۔

علامہ اقبالؒ کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب آپ علوم جدید وقدیم کے حصول کے بعد بھی یونانی رنگ میں رنگنے کے بجائے قرآنی افکار میں سوچتے اور اصلاح کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہ جانتے تھے کہ قرآن وسنت ہی ہماری اساس ہے اور اسی میں ہماری کامیابی مضمر ہے۔ قرآن کے فرمان مشاہدے یعنی غور وفکر اور جستجوئے حق کے بارے میں فرماتے ہیں:

مشاہدے پر قرآن نے بار بار زور دیا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعے معلومات حاصل کر سکے اور اپنی فلاح کے مراحل طے کر سکے۔ علامہ قبال تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں فرماتے ہیں۔ سقراط کی توجہ صرف عالم انسانی پر تھی۔ اس کے نزدیک انسان کے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ نباتات اور حشرات، یا ستاروں کی دنیا۔ مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات، جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحی الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر وتبدل کا مشاہدہ کیا جائے، نیز دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا ہم اس کی بنا پر صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔

برعکس اس کے قرآن مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور عنداللہ اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔(۱۹) مسلمانوں کی عظمت اسی میں تھی کہ انہوں نے غور و فکر سے علوم میں مہارت حاصل کی اور جدید علوم کی بنیاد ڈالی۔

اور اسی غور و فکر اور تجزیاتی مشاہدے کی قرآن نے ترغیب دی جسے مسلمانوں نے اختیار کیا تو وہ عروج فی منزلیں طے کرتے چلے گئے اور دنیا کو وہ ترقی دی جو فقید المثال ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک نے فطرت کے مشاہدے میں غور فکر کی ترغیب دلائی تو اس لیے کہ ہم اس حقیقت کا شعور پیدا کریں جس کی عالم فطرت کو اس نے ایک آیت ٹھہرایا ہے لیکن یہاں توجہ طلب امر قرآن مجید کی وہ اختیاری روش ہے جس سے مسلمانوں کے اندر عالم واقعیت کا احترام پیدا ہوا اور جس کی بدولت آگے چل کے انہوں نے علوم جدیدہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر یہ امر کہ اختیار اور مشاہدے کی اس روح کو اس زمانے میں بیدار کیا گیا جو ذات الہیہ کی جستجو میں مرئی کو بے حقیقت سمجھتے ہوئے سرے سے نظر انداز کر چکا تھا، کوئی معمولی واقعہ نہیں۔(۲۰)

مگر جب مسلمانوں نے تقلید کا سہارا لیا اور ایسے جمود کا شکار ہو گئے کہ "..... جس میں مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ تصوف کی طرف کھنچنے لگے اور بالآخر اسی میں جذب ہو کر رہ گئے۔ اسلامی ریاست کی باگ ڈور اب متوسط درجے کے افراد، یا بے علم عوام کے ہاتھوں میں تھی تا آنکہ ایسا کوئی باہمت اور الوالعزم انسان باقی نہ رہا جو ان کی رہنمائی کرتا۔ لہٰذا انہیں اپنی عافیت اسی میں نظر آئی کہ مذاہب فقہ کی اندھا دھند تقلید کرتے چلے جائیں۔

اس پر قیامت یہ ہوئی کہ تیرہویں صدی کا وسطی زمانہ آیا تو اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز بغداد تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ یہ ایسی شدید ضرب تھی کہ اس عہد کے جن مؤرخوں نے تاتاری حملوں کی تاریخ لکھی ہے وہ بغداد کی تباہی کا حال بیان کرتے ہیں تو اس سے اسلام کے مستقبل کے بارے میں بڑی مایوسی ٹپکتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکر اپنی ساری کوششیں اس بات پر مرتکز کر دیتے کہ مسلمانوں کی حیات ملی ایک یک رنگ اور یکساں صورت اختیار کر لے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان میں مزید انتشار پیدا نہیں ہوگا۔ انہوں نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فقہائے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی اس کو جوں کا توں برقرار اور ہر قسم کی بدعات سے پاک رکھا۔ وہ چاہتے تھے جیسے بھی ممکن ہو اسلام کی ہیئت اجتماعیہ محفوظ رہے اور یہ وہ بات ہے جس میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی تھے۔

یہ اس لیے کہ قوائے انحطاط کا سد باب نظم و ربط ہی سے ہوتا ہے، لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علماء نہیں سمجھتے کہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے، بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، قدرت اور صلاحیت کیا۔ یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے اجتماعی افکار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے، لیکن اپنی حقیقی روح کھو بیٹھتا ہے۔ اندریں صورت اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گزشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں، یا اس کا احیا خود ساختہ ذرائع سے کریں۔ زمانہ ءحال کے ایک مصنف نے کیا خوب کہا ہے "تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو، ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی"۔ لہٰذا قوائے انحطاط کے سد باب کا اگر کوئی ذریعہ فی الواقع مؤثر ہے تو یہ کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کی پرورش ہوتی رہے جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں، کیونکہ ایسے ہی افراد ہیں جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں جن کی بدولت اس امر کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول سرے سے ناقابل تغیر و تبدل نہیں۔ اس میں اصلاح اور نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ (۲۱)

تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ قوموں کی زندگی اور طاقت و توانائی ہمیشہ ان کے ذوق انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب مشرق کی قوموں نے جہد مسلسل سے گریز کیا تو سیاسی اور معاشی اعتبار سے قابل رحم ہو گئیں۔ اور اسی طرح جب اقوام مغرب نے اپنے ذوق تحقیق اور جستجو کو آگے بڑھایا تو وہ کائنات اور آفاق کی قوتوں پر مسلسل حکمران ہو کر انسانی عظمت کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہیں اور یہ سب کچھ ان کے جہد مسلسل اور جذبہ ہی کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اسے درد و سوز آرزومندی اور ذوق انقلاب سے تعبیر کیا ہے کہ:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب! (۲۲)

امام حسن البناء شہیدؒ: (۱۹۰۶ء - ۱۹۴۹ء)

حسن البنا بن احمد بن عبدالرحمٰن مصر میں مشہور تنظیم اخوان المسلمین کے بانی، ایک سچے محب وطن، حریت پسند اور دین دار شخص تھے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں محمودیہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد وہ قاہرہ کے تعلیمی مرکز "دارالعلوم" میں بھی پڑھتے رہے اور پھر جامعہ الازہر سے بھی فارغ التحصیل ہوئے۔

قرآن مجید حسن البنا نے اپنے والد ہی کی نگرانی میں حفظ کیا تھا۔ انہوں نے ٹیچر ٹریننگ سکول سے تین سال کا کورس مکمل کر کے ضلعی بورڈ میں فریضہ معلمی سنبھال لیا تھا۔ اس کے بعد وہ اسماعیلیہ میں مدرس مقرر ہو گئے تھے۔ اسماعیلیہ ہی میں انہوں نے دعوت وتبلیغ کے لئے ایسا طریقہ اور اسلوب اختیار کرنے کے لئے غور وخوض کیا کہ جو ہر حال میں نتیجہ خیز ضرور ثابت ہو۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسجدوں، دیگر معاشرتی مقامات اور قہوہ خانوں میں اپنی تبلیغ ودعوت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے جلد بعد انہوں نے ۱۹۲۸ء میں "اخوان المسلمون" کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پانچ ہی برسوں میں اس تنظیم میں ان کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ انہوں نے ہر دوسری ملازمت کو چھوڑ دیا تھا۔ (۲۳)

حسن البنا اسلام کو پیغام عالمگیر اور مکمل نظام زندگی کے طور پر عملاً نافذ العمل کرنے کے خواہاں تھے۔ اخوان المسلمون کی تنظیم کے ذریعہ انہوں نے اپنے اسی نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کا کام مصر کے طول وعرض میں شروع کر دیا۔ حسن البنا نے اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ پچاس سال سے مصر میں غیر اسلامی آئین آزمائے جا رہے ہیں اور وہ سخت ناکام ہوئے ہیں لہٰذا اب اسلامی شریعت کا تجربہ کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مصر کے موجودہ دستور اور قانون کے ماخذ کتاب وسنت نہیں بلکہ یورپی ممالک کے دستور اور قوانین ہیں جو اسلام سے متصادم ہیں..... دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک اخوان کی دعوت مشرق کے بیشتر عرب ملکوں میں جڑ پکڑ چکی تھی لیکن اخوان کا سب سے مضبوط مرکز مصر ہی تھا۔ جنگ کے بعد اخوان نے عوامی پیمانے پر سیاسی مسائل میں حصہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں فلسطین سے برطانیہ کے انخلاء کے بعد جہاد فلسطین میں عملی حصہ لیا۔ اس سے اخوان کی مقبولیت میں بے انتہا اضافہ ہوا، اور دو سال کے اندر اندر اخوان کے ارکان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ہمدردوں کی تعداد اس سے دوگنی تھی۔ اخوان کی روز افزوں مقبولیت سے اگر ایک طرف شاہ فاروق خطرہ محسوس کرنے لگے تو دوسری طرف برطانیہ نے مصر پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ اخوان پر پابندی لگائی جائے چنانچہ ۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مصری حکومت نے اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور کئی ہزار نوجوان کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تین ہفتے بعد وزیر اعظم نقراشی پاشا کو ایک نوجوان نے قتل کر دیا۔ حسن البنا کو آخر تک گرفتار نہیں کیا گیا اور ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کی ایک شب کو اس عظیم اخوان رہنما کو ایک سازش کے تحت رات کی تاریکی میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ (۲۴)

اسلام اور مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب وہ بڑے دل خراش حوادث سے دوچار ہوئے، ان پر بہت شدید مصائب ٹوٹے۔

اسلام دشمن قوتیں اسلام کی شمع بجھانے پر تل گئیں اور اس کے شان دار اثرات کو زائل کرنے کی سعی شروع کر دی۔اس کے بیٹوں (ماننے والوں) کو گمراہ کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے۔اس کی حدود اور قوانین کو معطل کیا، اس کے لشکر کو کمزور بنا دیا۔اس کی تعلیمات اور احکام کو کبھی اضافہ، کبھی کمی اور کبھی من مانی تعبیر کے ذریعے بے اثر بنانے کی کوشش کی۔اسلام کی سیاسی قوت اور اسلامی خلافت کے زوال اور اسلامی لشکر کی سستی، بزدلی اور کمزوری نے ان دشمنان اسلام کو مزید تقویت بہم پہنچائی۔یہاں تک کہ عالم اسلام کا خاصا بڑا حصہ اہل کفر کے قبضے میں چلا گیا اور مسلمانوں کو طاغوتی سامراج کے زیر سایہ ذلت و رسوائی کے برے دن دیکھنے پڑے۔

یہ اس ناگفتہ بہ حالت اور شکست خوردہ امت کا ایک ٹھوس تجزیہ ہے، جس کے مطابق عالمِ اسلام کے خلاف ان تین محاذوں پر معرکہ برپا تھا:

اندرونی محاذ: عالم اسلام میں علماء کی بے بسی، عوام کی جہالت و نادانی اور مسلمانوں کی صفوں میں کمزوری اور اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو ذلت و رسوائی سے دوچار کرنے کے لیے یہ محاذ کھولا گیا۔

بیرونی محاذ: یہ محاذ اسلام دشمن عناصر کی جانب سے دین اسلام کو کھوٹا ثابت کرنے، اس کے پیرو کاروں کو گمراہ کرنے، عالم اسلام پر قبضہ جمانے اور اس کے ذخائر اور معادن کو چرانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

معنوی محاذ: یہ محاذ ملت کفر کی طرف سے اس لیے قائم ہوا کہ اس کے ذریعے اسلام کی سیاسی قوت کو زائل کیا جائے۔خلفائے راشدین سے ورثے میں ملے ان تمام اثاثوں یہاں تک کہ ان کی آخری دستاویزات تک کو ضائع کر دیا جائے، اسلام کی بچی کھچی فوجی قوت کو تہس نہس کر دیا جائے اور عثمانی خلافت (جس کو 'مرد بیمار کے نام' سے یاد کیا جاتا تھا) کے ترکے کو تقسیم کیا جائے اور بالآخر بحیثیت ملّت، مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔(۲۵)

امام حسن البناء نے نہ صرف زوال کی نشاندہی کی بلکہ اپنی جوانی اسی تگ ودو میں لگا دی کہ امت مسلمہ اپنی حیثیت کو پہچان جائے اور اس ذمہ داری کی طرف لوٹ آئے جسے سرانجام دے کر ہی عروج وفلاح حاصل کی جا سکتی ہے۔اخوان کے ذریعے انہوں نے وہ کام کرنے کا عزم کیا اور ان کی ایسی تربیت کی جو ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج کے لیے ایک واضح لائحہ عمل کی شکل میں یہ نسخہ تجویز کیا:

سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کا صحیح اور درست تصور پیش کریں، ایسا تصور جس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو، جس میں کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہو۔

یہ ہماری فکر اور ہمارے لائحہ عمل کا نظری پہلو ہے۔ اسلام کو صحیح طرح سمجھنے کے بعد ہمارا دوسرا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں سے پرزور مطالبہ کریں کہ اب اس اسلام کو عملی جامہ پہنائیں اور عملی زندگی میں اس کو نافذ کریں۔ یہ ہماری فکر اور ہمارے لائحہ عمل کا عملی پہلو ہے۔ اس پوری تحریک اور اس کے لائحہ عمل میں اللہ کی لاریب اور محکم کتاب، حضور نبی کریم ﷺ کی ثابت شدہ احادیث، سلف صالحین کا کردار اور ان کی سیرت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ہماری ساری جدوجہد سے ہمارا مقصود صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول، اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اور تمام انسانوں کے لیے راہ نمائی اور ہدایت کا سامان کرنا ہے۔(۲۶)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴ء - ۱۹۹۹ء)

ولادت ۶ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ، ۱۹۱۴ء بمقام رائے بریلی، اتر پردیش میں ہوئی۔ تعلیم کا آغاز والدہ محترمہ نے قرآن مجید سے کیا۔ ۱۹۲۳ء میں والد صاحب حکیم سید عبدالحئی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ خلیل عرب سے باقاعدہ عربی تعلیم کا آغاز کیا....... ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان انگریزی زبان سیکھنے پر بھی توجہ رہی، جس سے اسلامی موضوعات اور عربی تہذیب و تاریخ وغیرہ پر انگریزی کتابوں سے بھی براہ راست استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا.... جولائی ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس بنائے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں دینی و دعوتی مراکز سے واقفیت کے لیے ایک سفر کیا۔ جس میں شیخ عبدالقادر رائے پوری، اور مصلح کبیر مولانا محمد الیاس گاندھلوی سے تعارف حاصل ہوا، اور پھر ان سے مستقل ربط و تعلق رہا.... انجمن تعلیمات اسلام کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ایک انجمن قائم کی۔ جس میں قرآن کریم اور حدیث نبوی کے دروس کا سلسلہ جاری کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی حسنی صاحب کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں تحریک پیام انسانیت کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۹ء میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کی۔(۲۷)

اردو میں سب سے پہلی تصنیف ۱۹۳۸ء میں بعنوان ''سیرت سید احمد شہید'' شائع ہوئی۔ آپ کی مشہور تصنیفات میں عربی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اردو میں اسکا ترجمہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش و تاریخ دعوت و عزیمت ہیں۔

عربی اردو میں تین سو سے زائد کتابوں کے عظیم الشان مصنف جو نہ صرف امت کا درد رکھتے تھے بلکہ عملاً امت کے عروج کے لئے کوشاں رہے۔ ۲۲ رمضان المبارک ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ مسلمانوں کے اندر سے ایمانی طاقت کی کمی کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کے زوال کے اہم سبب کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عالمِ اسلام پر ایک طویل دور ایسا گزرا ہے کہ اس کو معنوی طاقت کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا، اور نہ اس کو اس کی حفاظت کی فکر تھی، نہ وہ اس کو غذا پہنچانے کی طرف متوجہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سوتے خشک ہوتے چلے گئے، اور تیزی سے اس میں انحطاط واقع ہوا اسی عرصہ میں عالمِ اسلامی کو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں ایسے معرکے پیش آئے جن میں اس کو ایمان ویقین، صبر وتحمل اور ثبات واستقامت کی ضرورت بشدّت محسوس ہوئی اور جوان صفات کے بغیر جیتے نہیں جاسکتے تھے، جب اسلامی طاقتوں کو دھکا لگا اور انھوں نے اس معنوی طاقت کا سہارا لینا چاہا جس کی جگہ مسلمانوں کے دل تھے تو ان کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ یہ طاقت عرصہ ہوا گم ہو چکی ہے، اور دل کی انگیٹھیاں سرد ہو چکی ہیں، اس وقت عالمِ اسلامی کو یہ محسوس ہوا کہ اس نے اس روحانی طاقت کی ناقدری کر کے اور اس سے غفلت برت کر اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے، اس وقت اُس نے اپنے ذخیرہ کا جائزہ لیا تو اس کو کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو اس خلا کو پُر کر سکے اور اس نقصان کی تلافی کر سکے۔

اسی عرصہ میں عالم اسلامی کو ایسے معرکے بھی پیش آئے جن میں اسلام کی عزت وحرمت کا سوال تھا، اس کو خیال تھا کہ تمام عالم کے مسلمانوں میں قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ اسلام کی طرف سے مدافعت، مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور دینی جوش وحمیت میں از خود رفتہ ہو جائیں گے، اور تمام اسلامی ممالک میں آگ سی لگ جائے گی، لیکن عالم اسلام پر ان واقعات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، زندگی کے کام بدستور ہوتے رہے، کہیں کہیں سے کچھ آواز بلند ہوئی اور خاموش ہو گئی، اور پھر دنیا اپنے کام میں لگ گئی، اس وقت عالمِ اسلام کے مُفکّرین اور اہلِ نظر کو معلوم ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی احساس کمزور پڑ چکا ہے، اور ایمان کا شعلہ اگر پورے طور پر بجھا نہیں تو بہت دب گیا ہے، اس وقت دوسروں کو بھی عالم اسلام کی یہ کمزوری معلوم ہوئی اور اندرونی انحطاط اور اضمحلال کا احساس ہوا، اور اس کا وہ رُعب جاتا رہا جو اس کی مجاہدانہ تاریخ پڑھ پڑھ کے دل ودماغ پر پڑتا ہے۔ آج عالم اسلامی کے قائدین ومفکرین اور اس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش کریں، جذبہء دینی کو پھر متحرک کریں، اور پہلی اسلامی دعوت کے اُصول وطریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ ورسول اور اخرت کے عقیدہ کی پوری طاقت کے ساتھ دوبارہ تبلیغ وتلقین کریں، اس کے لئے وہ سب طریقے استعمال کریں، جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کئے تھے، نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصرِ جدید نے پیدا کر دی ہیں۔ (۲۸)

ڈاکٹر علی شریعتی: (۱۹۳۳ء - ۱۹۷۷ء)

ڈاکٹر علی شریعتی ۱۹۳۳ء میں مشہد (ایران) کے نواحی علاقہ میزنیاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مشہد میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس گئے اور سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایران جدید کی فکری تاریخ میں ڈاکٹر علی شریعتی کا نام ایران کی فکری تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے بہت متاثر ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے دوسری شیعی اصطلاحات کے مروجہ مفہوم پر نکتہ چینی کی ہے۔ مثلاً اہل بیت کی قدر و منزلت صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ پیغمبر اسلام کے اہل بیت ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ اہل بیت نبوی قرآن وسنت کی اتباع کا کامل نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی کے خیال میں عصمت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں کو معاشرہ کی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا ہے ان کے کردار میں کوئی کمزوری نہیں ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے ایرانی نوجوانوں میں اس حقیقت کا شعور بیدار کیا کہ وہ عالمی امت مسلمہ سے علیحدہ کوئی تشخص نہیں رکھتے بلکہ اس کا ایک جزو ہیں۔ اس کے علاوہ علی شریعتی نے نئی نسل کو احساس دلایا کہ اسلام ایک متحرک اور جامع ضابطہ حیات ہے اور اس کو کلیائی نظام کے حصار میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ (۲۹)

ڈاکٹر علی شریعتی کے لیکچر نوجوان نسل میں جب تحرک پیدا کرنے لگے تو اس پر حکومت نے تنگ آ کر ڈاکٹر علی شریعتی کو جلا وطن کر دیا اور وہ برطانیہ میں جلاوطنی کی حالت میں ۱۹۷۷ء میں انتقال کر گئے۔

ایک خیال یہ ہے کہ ان کو ایرانی حکومت نے زہر دلوا دیا تھا جو ان کے موت کا سبب بنا۔ اسی بناء پر سرخ شریعت کے مترجم علی اکبر شاہ لکھتے ہیں کہ اس پابندی وسلاسل کی وجہ سے جسکا وہ سامنا کر رہے تھے چنانچہ آپ نے رسول اللہ کی سنت کو سامنے رکھتے ہوئے ہجرت کا فیصلہ کیا اور آپ انگلینڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابھی تین ہی ہفتے گزرے تھے کہ شاہ کے ایجنٹوں نے آپ کو ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو شہید کر دیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی امت مسلمہ کا حقیقی درک رکھنے والے تھے۔ ان کے مطابق دین سے ہمارا تعلق رسمی رہ گیا ہے جو ہمارے زوال کا سبب بنا بلکہ آج بھی ہمارے زوال سے نکلنے میں رکاوٹ ہے۔

امت مسلمہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں بات یہ ہے کہ ہم نے دین کو محض قصہ ماضی سمجھ لیا ہے اور حال سے اس کا رشتہ توڑ لیا ہے۔ ہم محض ماضی کے چند واقعات کی یاد منا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور ان واقعات میں جو درسِ عمل اور پیغام انقلاب ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ہم نے مذہب کو واقعات وحوادث کا مجموعہ بنا دیا ہے ایسے واقعات وحوادث جو صرف ماضی سے متعلق ہیں اور جو ہمارے موجودہ حالات کو بدلنے کے لیے کوئی تحریک فراہم نہیں کرتے۔

اس سے بھی بڑھ کر سنگین اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے ماضی کی یاد کو حال کو فراموش کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے ہمارا مذہب ہمیں موجودہ حالات سے بیگانہ بنا کر ہماری تمام توجہ ماضی کے ان واقعات کی طرف منعطف کر دیتا ہے جو صدیوں قبل ایک اجنبی اور بیگانہ سرزمین پر رونما ہوئے ہیں۔ ہم اپنے دور میں ہونے والے ظلم وستم سے غافل ہیں۔ ہم اجتماعی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے۔ ہمارا معاشرہ غلامی کے طوق میں جکڑا ہوا ہے لیکن ہم اپنی گردن میں اس طوق کی سختی اور ایذا محسوس نہیں کرتے ہمارا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ ہم ماضی کے واقعات پر غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وہ غلط انداز نظر ہے جس کی وجہ سے ہم نے اپنے مذہب کو جو لوگوں کو شعور آگہی کا پیغام دیتا ہے ان میں ذمہ داری اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے، جو امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد وشہادت، ایثار وانفاق اور قیام عدل وتردید ظلم سے عبارت ہے ایک ایسے مجموعہء رسوم میں تبدیل کر لیا ہے جس کے معنی گریہ وبکا نالہ وشیون، توسل وتقیہ، بے معنی انتظار، بے اصولی شفاعت اور بے مقصد تعریف وتحسین اور طعن ونفرین بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارے آئمہ کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ دوسری دنیا میں ہماری دستگیری کریں ہمیں عذاب جہنم سے بچائیں، ہمارے گناہوں کو بخشوائیں اور ہماری شفاعت کریں ہم ان آئمہ ہدایت سے اپنی دنیا اور دنیاوی زندگی کی اصلاح کے لیے کوئی سبق نہیں لیتے نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے عوام کمزوری، درماندگی اور بیچارگی کا شکار ہیں اور اسی کو اپنی تقدیر سمجھ کر مطمئن ہیں وہ غفلت کا شکار ہیں۔ اگر ہماری قوم ذلت اور مسکنت کا شکار ہے تو اس میں قصور کس کا ہے پوری شدت اور سنگینی کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ہر باشعور شخص جس نے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ گہری فکر ونظر اور منطقی تجزیہ کے ذریعہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے وہ رفتہ رفتہ چند بدیہی اور متعارف حقیقتوں تک پہنچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین یعنی اسلام تاریخ کا سب سے آخری مذہب اور سب سے زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ مکتب فکر ہے اور محمدؐ، قرآن عترت اصحاب وتاریخ اسلام ایک باعزت، باشعور، متمدن، مہذب، متحرک، پرشوکت اور ہر لحاظ سے ترقی پذیر زندگی کا سبق دیتے ہیں اس دین کا عقیدہ توحید انسان کی اجتماعی وحدت کی اساس ہے اور رسالت کا مقصد اجتماعی زندگی کو عدل کی بنیاد پر قائم کر کے ایک ایسی امت کی تشکیل کرنا ہے، جس کا ہر فرد جذبہء شہادت سے سرشار ہو۔ (۳۰)

ڈاکٹر یوسف القرضاوی (۱۹۲۶ء پ)

ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء کو مصر میں پیدا ہوئے۔ نو برس کے عمر میں حفظ مکمل کر لیا۔ یوسف القرضاوی اخوان المسلمون کے بانی امام حسن البنا کے عقیدت مند تھے۔ اخوان المسلمون کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر انھیں پہلی بار ۱۹۴۹ میں جیل بھی جانا پڑا۔

بعد ازاں وہ مصری وزارت مذہبی امور میں کام کرتے رہے ۔ پھر وہ قطر چلے گئے جہاں مختلف یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔اسی طرح وہ الجزائر کی یونیورسٹیوں میں مختلف ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

وہ محض فکری رہنما نہیں ہیں بلکہ فکر کے ساتھ عمل کے میدان کے بھی شاہ سوار ہیں۔وہ لگن اور مشن کے ساتھ زمانے کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی سعی کو جاری رکھتے ہوئے مثلِ چراغ راہ روشنی بکھیر رہے ہیں۔ ڈاکٹر قرضاوی مدرسہ حسن البناء کے ہونہار سپوت، عالم اسلام کے مایہ ناز رہنما اور دور جدید میں اسلام کے علمی ورثے کے سچے امین ہیں۔درجنوں کتابوں کے مصنف، سینکڑوں مقالات کے مؤلف اور ہزاروں معرکہ آراء تاریخی خطابات کے خطیب، زندگی کی اکہتر بہاریں مکمل کر چکے ہیں۔مصر کی مردم خیز سرزمین کا یہ قابل فخر سپوت جلاوطنی میں زندگی گزارنے کے باوجود پوری امت مسلمہ کی آنکھوں کا تارا ہے۔(۳۱)

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی شعلہ نوا خطیب ہیں اور اس کے ساتھ وہ مدلل انداز اور منطقی منہج کے مطابق تحریروں کو پرمغز ،مؤثر اور جذبات سے مالا مال کر دیتے ہیں۔مسلمان جن کی بنیاد اسلام ہے جب کہ مسائل سے دوچار امت مسلمہ کا اصل مسئلہ اسلام سے دوری ہے۔

تمام شواہد اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان اس وقت سیاسی استبداد و آمریت، معاشی و اقتصادی عدم استحکام، اجتماعی ظلم و ناانصافی، ثقافتی و تعلیمی انحطاط، اخلاقی بے راہ روی، معاشرتی پسماندگی، ملی انتشار اور صہیونی قوتوں سے شکست خوردگی جیسی جن مشکلات سے دوچار ہیں، ان سے نجات کی صرف ایک ہی راہ ہے کہ وہ پورے طور پر اصل اسلام کی طرف لوٹ آئیں۔گلوبلائزیشن اور خلا میں دور تک رسائی حاصل کر لینے کے اس دور میں پوری انسانیت کو بھی مادیت، اخلاقی انحطاط اور گراوٹ، زر پرستی اور اخلاقی و معاشرتی زوال اور ٹوٹتے ہوئے خاندانی نظام کی پریشان کن صورتحال سے صرف اسی صورت میں نجات مل سکتی ہے جب خود مسلمان اسلام کی طرف لوٹیں۔مسلمانوں کے اسلام کی طرف رجوع کرنے میں رکاوٹیں وہ عالمی طاقتیں ڈال رہی ہیں جو اسلام کے پیغام، اس کی تہذیب اور امت مسلمہ کے ساتھ دشمنی رکھتی ہیں۔ان میں سے بعض طاقتیں تو وہ ہیں جن کا اسلام کے ساتھ سخت بغض و عناد پوری طرح عیاں ہے۔ان کی پوری کوشش ہے کہ اسلام کا بول بالا نہ ہو اور امت مسلمہ کسی قسم کی طاقت اور غلبہ حاصل نہ کر سکے۔بعض دوسری طاقتیں اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہیں اور سوویت یونین کی صورت میں "سرخ خطرہ" کے ڈھے جانے اور چین کی صورت میں "زرد خطرہ" سے قریب ہو جانے کے بعد اب اسے "سبز خطرہ" کا نام دے کر واویلہ کر رہی ہیں۔(۳۲)

فصل دوم

مفسرین و مجتہدین کی نظر میں

مولانا ابوالکلام آزاد: (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء)

ان کا تاریخی نام فیروز بخت احمد تھا لیکن کنیت ابوالکلام آزاد تھی۔ والد کا نام خیرالدین قادری ہے۔ والد کے مریدوں کی تعداد ہزاروں بتائی جاتی ہے۔ وہ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد اور قرآن مجید کی تعلیم اپنی خالہ سے پائی۔ آٹھ دس برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ ہندوستان میں آ گئے تھے..... ان کی مادری زبان عربی تھی اور اردو زبان والد کی جانب سے موروثی ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عربی اور اردو دونوں زبانوں کے تبحر عالم ثابت ہوئے۔ ہر طرح کی تحصیل علم کے بعد انہوں نے ہندوستان کے احوال کے مطابق پیشہ صحافت اپنانے کو ترجیح دی ابتدائی شہرت کے بعد ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار "الہلال" جاری کیا۔ اس اخبار نے جلد ہی پورے ملک میں اپنا ایک اہم مقام بنا لیا تھا، پڑھنے والے اس اخبار کا ہمہ وقت انتظار کرتے تھے۔ الہلال نے بے باک صحافت میں اہم خدمات انجام دیں لیکن ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت نے اس پرچے کو بند کر دیا۔ اس سے ایک سال بعد مولانا نے ہفتہ وار "البلاغ" جاری کیا۔ یہ ایک خالص دینی اور مذہبی پرچہ تھا۔ لیکن یہ رسالہ بھی جلد ہی بند ہو گیا۔ اسی اثناء میں مولانا نے ملک کی عملی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا، ان پر حکومت وقت نے بھی نظر رکھی۔ اسی دور میں آل انڈیا نیشنل کانگریس میں شرکت کر لی اور اس کے ساتھ ہی فرنگی پابندیوں اور نظر بندیوں کا شکار ہونے لگے..... وہ ایک بڑے صحافی، شعلہ بیاں مقرر، دلپذیر خطیب، سچے مسلمان، روشن خیال مفسر اور شارح قرآن اور عظیم عالم و فاضل تھے۔ (۳۳)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا وہ وقت کے مجاہد جلیل تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مسلم امہ کی بنیاد شریعت کے علم و عمل کو قرار دیتے ہیں اور جب کوئی قوم یا ملت اپنی بنیادوں کو کھوکھلا کر دے تو اس کا گرنا لازمی امر ہے۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کا سبب بتانے کے ساتھ ساتھ وہ رہنمائی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انہیں بتلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں، وہی خیر الامم ہیں وہی خیر البریہ ہیں وہی شہداعلی الناس ہیں وہی شھداء اللہ فی الارض، ان کے عروج و سعادت کی علت صرف یہ تھی کہ قرآن حکیم اور سنتِ رسول کو انھوں نے اپنا دستور بنالیا تھا۔ قرآن حکیم کی نسبت صاحب قرآن کا اعلان تھا۔

ان اللہ یرفع بھذاالکتاب اقواما و یضع بہ اخرین :اللہ تعالیٰ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اٹھائے گا اور یہی ہے جسکو ترک کر کے قومیں گریں گی اور ہلاک ہونگی اور روایت حضرت علیؓ عنہ ترمذی وابونعیم والطبرانی فی الکبیر میں فرمایا: و ھو الفصل لیس بالھذل من ترکہ من جبار قصمد اللہ و من ابتغی العدی فی غیرہ اضلہ اللہ الی ان قال من قال بہ صدق و من عمل بہ اجر، ومن حکم بہ عد، و من دعا الیہ ھدی الی صراط المستقیم پس جب مسلمانوں نے قرآن و سنت کا علم و عمل ترک کر دیا، تو اقبال و عروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی۔ یہ مسلم اور حقائق تاریخی میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا سب سے بہتر و ارفع زمانہ وہی تھا، جب بجز کتاب و سنت کے عمل کے اور کوئی تعلیم ان کی رہنمانہ تھی، یعنی عہد صحابہ کرام و خلفاء راشدین اولـــــــنک اصحاب محمد ابر ھذہ الامۃ قلوبا و اعمقھا علما و اقلھا تکلفا ، قوم اختار ھم اللہ لصحبتہ نیہ و اقامتہ دینہ فاعرفو الھم حقھم تمسکو بھدیھم فانھم کانو اعلی الھدی المستقیم (قالہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ)اور تنزل و فساد کا عہد اسی وقت سے شروع ہوا جب کہ اقوام ماضیہ مغضوبہ کے علوم و اعمال بشکل علوم دخلیہ و اعمال بدعیہ ان میں رائج ہوئے۔ ایک ہی علت کے دو مختلف نتائج نہیں نکل سکتے پس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروج رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، تو اس کی صرف ایک ہی راہ ہے۔ اس کے علاوہ اور جس قدر راہیں بھی کھلی ہوں گی، گمراہی و فساد کی ہونگی۔ یعنی علم و عمل شریعت کا احیاء اور ترک و ہجر شریعت کا انسداد اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعت اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے۔ اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی اور اس کا وعدہ ہے یظھرہ علی الدین کلہ یقیناً اس وعدہ کا ظہور ابھی نہیں ہوا پس ضرور ہے کہ وعدۂ الٰہی ظاہر ہو اور مستقبل کے لیے اگر کوئی راہ فوز و فتح ہوسکتی ہے تو وہ صرف دعوتِ شریعت اور احیائے عمل بالقرآن ہی ہے۔ (۳۴)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ: (۱۹۷۶ء - ۱۸۹۶ء)

مفتی محمد شفیع صاحب کی ولادت دیوبند میں ہوئی آپ مولانا محمد یٰسین مدرس درجہ فارسی کے فرزندِ ارجمند تھے، تمام علومِ اسلامیہ کی تعلیم اور تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی اور اسی مدرسہ میں مدرس، نائب مفتی اور پھر مفتی اعظم مقرر ہوئے، تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصہ لیا، پاکستان میں مستقل مقیم ہو کر ایک عظیم دارالعلوم کراچی کی بنیاد ڈالی اور پاکستان کے مفتی اعظم قرار دیئے گئے، تفسیر اور علمِ تفسیر پر چند رسائل کے علاوہ تفسیر "معارف القرآن" تحریر فرمائی جو آٹھ جلدوں میں مطبوعہ ہے، آپ کی وفات ۹ شوال ۱۳۹۶ھ کو کراچی میں ہوئی۔ (۳۵)

مفتی محمد شفیع صاحب مسلم امہ کے اندر سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نکل جانے کو تباہی کا سبب بتاتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک برائی کا قلع قمع کرنے کی کوشش جاری نہ رہے اور نیکی کی ترغیب کا عمل متواتر نہ ہو تو انسان کے اندر چاہے جتنا بھی نیکی کرنے کا اور برائی سے بچنے کا عنصر موجود ہو دوسروں کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا دراصل بے حسی کا سبب ہے اور یہی بے حسی آہستہ آہستہ سارے نظام میں فساد برپا کر دیتی ہے۔

جس جگہ بات سننے اور ماننے کا احتمال غالب ہو وہاں مشائخ و علماء پر بلکہ ہر مسلمان پر جس کو اس کام کا جرم و گناہ ہونا معلوم ہو فرض ہے، کہ گناہ کو روکنے اور منع کرنے میں مقدور بھر کوشش کرے، کواہ ہاتھ سے یا زبان سے، یا کم از کم اپنے دل کی نفرت اور اعراض سے، اور جس جگہ غالب گمان یہ ہو کہ اس کی بات نہ سُنی جائے گی، یا یہ کہ اس کے خلاف دشمنی بھڑک اٹھے گی، تو ایسی حالت میں منع کرنا اور روکنا فرض تو نہیں رہتا، مگر افضل و اعلیٰ بہر حال ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق یہ تفصیلات صحیح احادیث سے مستفاد ہیں، خود نیک عمل اختیار کرنے اور بُرے اعمال سے بچنے کے ساتھ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف ہدایت اور بُرائی سے روکنے کا فریضہ عام مسلمانوں پر اور بالخصوص علماء و مشائخ پر ڈال کر اسلام نے دنیا میں امن و اطمینان پیدا کرنے کا ایک ایسا زریں اصول بنا دیا ہے کہ اس پر عمل ہونے لگے تو پوری قوم بہت آسانی کے ساتھ تمام برائیوں سے پاک ہو سکتی ہے۔

اسلام کے قرونِ اُولیٰ میں اور قرونِ مابعد میں بھی جب تک اس پر عمل ہوتا رہا مسلمانوں کی پوری قوم علم و عمل، اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سر بلند اور ممتاز رہی، اور جب سے مسلمانوں نے اس فریضہ کو نظر انداز کر دیا، اور جرائم کی روک تھام کو صرف حکومت اور اس کی پولیس کا فرض سمجھ کر خود اس سے علیحدہ ہو بیٹھے تو اس کا نتیجہ وہی ہوا جو آج ہر جگہ سامنے ہے۔ (۳۶)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: (۱۹۰۳ء - ۱۹۷۹ء)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۲۵ ستمبر مطابق ۳ رجب ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء کو ہندوستان کے شہر اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے تھے۔ بائیس سال کی عمر میں روزنامہ الجمعیت، دہلی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے جو جمعیۃ علمائے ہند کا ترجمان تھا۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد (دکن) سے ماہنامہ ترجمان القرآن جاری کیا جواب تک جاری ہے۔ اس کے ذریعہ انہوں نے روایتی طریقے سے ہٹ کر اسلام کا انقلابی تصور پیش کیا اور تحریک احیائے اسلام کی بنیاد ڈالی۔ جب وہ اس رسالے کے ذریعہ اپنے خیالات کی وضاحت کر چکے تو ۱۹۴۱ء، ۱۳۶۰ھ میں انہوں نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اسلامی آئین کی تیاری، اسلامی نظام کے قیام اور آمریت کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کی..... انہوں نے ساری عمر اپنے اصولوں کو ترک کر کے مفاہمت نہیں کی اور ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ چار مرتبہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک مرتبہ ان کو مارشل لاء کے تحت سزائے موت کا حکم بھی سنایا گیا لیکن وہ اپنے مقررہ راستے سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ ہم ان کو بلاخوف تردید پاکستان کی سیاست کا مرد بزرگ اور نظریہ پاکستان کا عظیم ترین علمبردار کہہ سکتے ہیں..... فروری ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب کی شاہ فیصل فاؤنڈیشن نے ساری دنیا کے مسلمان دانشوروں سے مشورے کے بعد مولانا مودودی کو ان کی اسلامی خدمات پر شاہ فیصل ایوارڈ دیا جو نوبل انعام کی طرز پر اسلامی دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اعزاز ہے اور جس کا ملنا اسلامی دنیا کی طرف سے مولانا مودودی کی خدمات کا اعتراف ہے۔ مولانا مودودی کا ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو جبکہ وہ علاج کے لیے اپنے بیٹے کے پاس امریکہ گئے ہوئے تھے انتقال ہو گیا۔ لاہور میں ان کا جلوس جنازہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ مولانا مودودیؒ صرف ایک عظیم سیاست دان ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر اور مصنف بھی تھے۔ (۳۷) مولانا مودودیؒ نے نہ صرف اپنے افکار کو اپنی تحریروں کے ذریعے قلمبند کیا بلکہ عملی طور پر اپنے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ مولانا نے چھ جلدوں پر مشتمل قرآن مجید کی تفسیر "تفہیم القرآن" لکھی۔

مولانا مودودیؒ نے کسی بھی قوم کے زوال کے اس سوت کی طرف نشاندہی کی ہے جو جمود سے ہوتا ہوا انحطاط کی طرف جاتا ہے اور بالآخر یکے بعد دیگرے وہ عوامل کارفرما ہو کر اس قوم کی حیثیت کو ختم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی قوم سوچنا، تحقیق کرنا، معلومات جمع کرنا اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا چھوڑ دے تو وہ جمود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جمود کا نتیجہ آخرکار انحطاط ہوتا ہے اور انحطاط کا نتیجہ آخرکار اس پر کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے۔

پھر جب کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے تو لامحالہ وہ محض سیاسی اور معاشی حیثیت ہی سے غالب نہیں ہوتی، بلکہ سب سے بڑھ کر اس کا غلبہ فکری حیثیت سے ہوتا ہے، یعنی اس کی تہذیب مغلوب قوم کی تہذیب پر غالب آ جاتی ہے۔ اب اس کے بعد دوسرا مرحلہ اس مغلوب قوم کا یہ شروع ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیتی ہے، دوسروں کی تحقیقات کا پس خوردہ کھانا شروع کر دیتی ہے۔ تحقیقات دوسرے کرتے ہیں، ان کو جمع دوسرے لوگ کرتے ہیں، ان کو مرتب کر کے ایک فلسفۂ حیات دوسرے لوگ بناتے ہیں، ایک نظامِ فکر و عمل دوسرے لوگ تیار کرتے ہیں اور یہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور ان کی ہر چیز کو قبول کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ عمل جتنا جتنا بڑھتا جائے گا اور جتنا جتنا تکمیل تک پہنچتا جائے گا، اس مغلوب قوم کی انفرادیت ختم ہوتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ یہ فنا بھی ہو سکتی ہے اور قومیں فنا ہوتی رہی ہیں۔ ایسی قومیں دنیا میں گزری ہیں جو اس طرح سے مٹیں کہ اب ان کی تہذیب صرف تاریخ کا سرمایہ ہے اور دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ (۳۸)

مولانا مودودیؒ تحقیق کی حامل امت کا ابتدائیہ بیان کرتے ہوئے عروج کا ذکر کرتے ہیں اور پھر تحقیق سے روگردانی ہی کو زوال کا اہم سبب بتاتے ہیں۔

اسلامی تحریک جب دنیا میں اٹھی تھی، اس وقت مسلمانوں نے دوسری قوموں پر محض سیاسی یا فوجی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان ہی اس وقت ایسے تھے جو تحقیقات کا کام کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ ان معلومات کو اپنے نقطۂ نظر، اپنے طرزِ فکر اور اپنے عقیدے کے مطابق مرتب کیا۔ چنانچہ ایک ایسی غالب تہذیب اس کی بدولت وجود میں آئی جس کے رنگ میں دنیا رنگتی چلی گئی...... مسلمانوں کے اس علمی کام کا اثر یہ ہوا کہ صدیوں تک دنیا یہ سمجھتی رہی کہ اگر کوئی تہذیب ہے تو مسلمانوں کی ہے، تمدّن ہے تو مسلمانوں کا ہے۔ غیر مسلم جو مسلمانوں کے خلاف تعصب بھی رکھتے تھے، وہ بھی تقلید انہی کی کرتے تھے۔ اپنے دور میں دنیا میں مسلمانوں نے شرک کی جڑ کاٹ دی تھی۔ انہوں نے توحید کو اس قوت کے ساتھ پھیلایا اور توحید کی اساس پر ایک نظامِ فکر اس قوت کے ساتھ مرتب کیا کہ مشرکین کے لیے یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ شرک ہی حق ہے..... اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس میں مسلمانوں نے نئی تحقیقات کا کام قریب قریب ترک کر دیا۔ جو کچھ علوم محققینِ سلف سے ملے تھے، انہی کو پڑھتے پڑھاتے رہے۔ انہی کے اوپر حاشیے چڑھاتے رہے۔ حاشیے در حاشیے لکھتے چلے گئے، لیکن نئی تحقیقات اور علوم و فنون میں آگے بڑھنے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا۔ دوسری طرف اسی زمانہ میں اہلِ مغرب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تحقیقاتِ علمی شروع کی۔

انہوں نے نئی نئی معلومات جمع کرنی شروع کیں۔ انہوں نے ان کو مرتب کر کے نئے فلسفے اور نئے نظام ہائے فکر و علم کی تشکیل شروع کر دی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف مسلمان رفتہ رفتہ جمود میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف اس علمی تحریک کی بدولت مغرب کی طاقت روز بروز بڑھنی شروع ہو گئی۔ آپ اپنی تاریخ کو اٹھا کر دیکھیے، اٹھارھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مسلمان اور اہلِ مغرب کے درمیان اتنا نمایاں فرق ہو گیا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہو گئے اور مغربی قومیں ان پر غالب آنی شروع ہو گئیں۔ دو تین سو برس جمود میں لگے اور اس جمود کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہو گئے اور مغربی قومیں غالب آنے لگیں۔ اٹھارہویں صدی سے مسلمانوں پر مغربی قوموں کی یورشیں اور ان کی فتوحات خود اس بات پر شاہد ہیں کہ علمی تحقیقات چھوڑ دینے اور جمود اختیار کرنے کے نتائج ہم نے کیا بھگتے اور انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کے کیا فوائد حاصل کیے۔ (۳۹)

سید قطب شہیدؒ (۱۹۰۶ء - ۱۹۶۶ء)

صاحب تفسیر فی ظلال القرآن سید قطب شہید کا نام سید ہے۔ سید قطب کے والد حاجی ابراہیم قطب تھے۔ سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ضلع اسیوط کے موشا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ سید کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ انہوں نے بچپن میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ قاہرہ کے ثانوی مدرسے "تجہیز یہ دار العلوم" سے فراغت حاصل کرتے ہی ۱۹۲۹ء میں دار العلوم قاہرہ میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی اے کرنے کے بعد ذہانت کی وجہ سے اسی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔

۱۹۴۵ء میں مصر کی الاخوان المسلمون سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء میں اخوان المسلمون کے بانی امام حسن البناء شہید کر دیے گئے تو سید قطب ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے فکری لائحہ عمل کو پروان چڑھایا۔ جمال عبدالناصر کا دور اخوان کے لیے دورِ ابتلا تھا۔ اخوان رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ ان گرفتار شدگان میں سید قطب بھی تھے۔ وہ مصر کی مختلف جیلوں میں رہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو مصر کی "عوامی عدالت" (محکمۃ الشعب) کی طرف سے سید قطب کو ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی.... ۱۵ سالہ قید بامشقت کا ابھی ایک سال گزرا تھا کہ جمال عبدالناصر کی طرف سے ایک نمائندہ سید قطب کے پاس جیل خانے بھیجا گیا۔ اس نے سید قطب کو یہ پیش کش کی کہ "اگر آپ چند سطریں معافی نامہ کی لکھ دیں جنہیں اخبارات میں شائع کیا جا سکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا"۔ اس پیش کش کے جواب میں اس مردِ مومن نے جو جواب دیا اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا:

"مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے۔ خدا کی قسم، اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دے سکتے ہوں تو میں تب بھی کہنے کے لیے تیار نہ ہوں گا، اور میں اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو۔ (۴۰) اگر چہ ۱۹۶۴ء میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے ضمن میں سید قطب کو بھی رہا کر دیا گیا تھا مگر ایک سال بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

۲۵ اگست ۱۹۶۶ء کو حکومت کا تختہ پلٹنے کے الزام میں سید قطب اور ان کے ساتھیوں پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا۔ ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل پیروی کرنے والا نہیں تھا۔ باہر کے لوگوں نے پیروی کرنی چاہی تو ان کو اجازت نہیں ملی۔ بالآخر ۲۵ اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب کو حکومت کا تختہ پلٹنے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔ سید قطب تقریباً بائیس کتابوں کے مصنف تھے ان میں العدالۃ الاجتماعیہ ان کی سب سے مشہور کتاب ہے.... دوسری اہم کتاب "السلام العالمی والاسلام" (عالمی امن اور اسلام ہے)..... سید قطب کی تیسری اہم کتاب "معالم فی الطریق" ہے۔ انھوں نے اس میں عربی قوم پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ "اسلامی تہذیب کبھی بھی محض عربی تہذیب یا قومی تہذیب نہ تھی وہ ہمیشہ اسلامی اور نظریاتی تہذیب تھی"۔ سید قطب کو اسی کتاب کی وجہ سے سزائے موت ملی۔ (۴۱) سید صاحب کے نزدیک قرآن ہی مرکز ہدایت ہے اور اسی نے عرب کی سر زمین میں انقلاب پیدا کیا تھا اور آج بھی امت کی بقاء و عروج اسی سر چشمہ ہدایت سے وابستہ ہونے میں منحصر ہے۔

صرف قرآن حکیم ہی وہ واحد سر چشمہ تھا جس سے صحابہ کرام سیراب ہوتے تھے، یہی وہ سانچہ تھا جس میں وہ اپنی زندگیوں کو ڈھال لیتے تھے، اسی سے وہ اکتساب فیض کرتے تھے۔ صرف قرآن پر ان کا اکتفاء کر لینا اس وجہ سے نہ تھا کہ اس وقت دنیا میں کسی اور تہذیب وتمدن اور ثقافت کے آثار موجود نہ تھے، علمی تحقیقات اور سائنسی کمالات کا وجود ناپید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر گوناگوں شکلوں میں موجود تھے۔ مثلاً رومی تہذیب موجود تھی، رومی علم وحکمت اور رومی قانون ونظام کا ڈنکا بج رہا تھا جو آج یورپ کی تہذیب کی بنیاد ہے یا کم از کم موجودہ یورپ اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یونانی تہذیب کا ترکہ بھی منطق وفلسفہ اور ادب وفن کے رنگ میں موجود تھا جو آج تک مغرب کے فکر ونظر کا مرجع ہے، عجمی تہذیب وتمدن، عجم کا آرٹ، اس کی شاعری، اس کا روایتی ادب اور اس کے عقائد اور نظامہائے حکومت کا غلغلہ تھا۔ اور بھی کئی تہذیبیں جزیرۃ العرب کے قریب یا دور پائی جاتی تھیں، مثلاً ہندی تہذیب اور چینی تہذیب...... لہٰذا ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ صحابہ کرام -- پہلی اسلامی نسل -- کا صرف کتاب الٰہی پر اکتفاء کرنا اور فہم دین کی خاطر کسی اور چشمہ سے رجوع نہ کرنا فکر ونظر کے جمود اور تہذیب وتمدن سے بیگانگی کی وجہ سے نہ تھا۔

بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے اور طے کردہ طریق کار کی بنا پر تھا...... دراصل رسول اللہ ﷺ ایک ایسی لاثانی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جس کا دل ودماغ نہایت پاکیزہ اور مطہر ہو، جس کا احساس وشعور انتہائی صاف وشفاف ہو اور جس کی تعمیر میں قرآن کے طریقہ ء تربیت وتعلیم کے سوا کسی دوسرے طریقہ کو دخل نہ ہو۔ یہ نسل یا جمعیت تاریخ میں لاثانی اور یکتا تنظیم سمجھی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے دین کے فہم اور تربیت کا اکتساب صرف ایک ہی ماخذ سے کیا۔ مگر بعد کے ادوار میں یہ صورت پیش آئی کہ اس چشمے کے اندر اور بھی متعدد چشموں کی آمیزش ہوگئی۔ بعد کی نسلوں نے جس چشمہ سے اخذ واکتساب کیا اس کا حال یہ تھا کہ اس میں یونانی فلسفہ ومنطق، قدیم عجمی قصے کہانیاں، اسرائیلیات، مسیحی الہیات اور دوسرے مذاہب اور تمدنوں کے بچے کھچے آثار مخلوط ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم کی تعبیرات پر ان تمام چیزوں کا عکس پڑا، علم الکلام ان سے متاثر ہوا، فقہ اور اصول فقہ ان کے دخل سے نہ بچ سکے۔ نسل اوّلین کے بعد جتنی نسلیں اٹھیں وہ اسی مخلوط چشمے سے اکتساب واستفادہ کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ ءکرام جیسی کامل وخالص ہیئت اجتماعیہ دوبارہ منصہء ظہور پر نہ آسکی۔ اور ہم یہ بات کسی شک وشبہ کے بغیر کہتے ہیں کہ بعد کی نسلوں اور اسلام کی پہلی یکتا وممتاز جمعیت میں جو نمایاں اختلاف نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ بعد میں اسلام کے اوّلین منبع رشد وہدایت میں ان مختلف ماخذ اور گونا گوں چشموں کا اختلاط ہو گیا۔ (۴۲)

اور اسی اختلاط نے مسلمانوں سے راہ ہدایت آہستہ آہستہ معدوم کر دی۔ سید قطب مسلم امہ کو دوبارہ قیادت کا اہل اس وقت دیکھتے ہیں جب امت مسلمہ اپنے اصل وجود کو بحال کر لے۔ امت مسلمہ کا "وجود" کئی صدیوں سے معدوم ہو چکا ہے کیونکہ امّتِ مسلمہ کسی ملک کا نام نہیں ہے جہاں اسلام بستا رہا ہے، اور نہ کسی "قوم" سے عبارت ہے جس کے آباؤ اجداد تاریخ کے کسی دور میں اسلامی نظام کے سائے میں زندگی گزارتے رہے ہیں بلکہ یہ اس انسانی جماعت کا نام ہے جس کے طور طریق، افکار ونظریات، قوانین وضوابط، اقدار اور معیار ردّ وقبول سب کے سوتے اسلامی نظام کے منبع سے پھوٹتے ہیں۔ ان اوصاف و امتیازات کی حامل اُمّتِ مسلمہ اسی لمحہ سے نہاں خانہ ءعدم کی نذر ہو چکی ہے جس لمحہ روئے زمین پر شریعتِ الٰہی کے تحت حکمرانی و جہانبانی کا فریضہ معطّل ہوا ہے۔ لیکن اگر اسلام کو دوبارہ وہ کردار ادا کرنا ہے جس کے لیے آج انسانیت چشم براہ ہے تو ناگزیر ہے کہ پہلے امّتِ مسلمہ کے اصل وجود کو بحال کیا جائے، اور اس امّتِ مسلمہ کو از سرِ نو زندہ کیا جائے جس پر کئی نسلوں کو ملبہ پڑا ہوا ہے، جو غلط نظریات کے انباروں میں دبی پڑی ہے، جو خود ساختہ اقدار وروایات کے اندر مدفون ہے اور جو ان باطل قوانین ودساتیر کے ڈھیروں میں پنہاں ہے جن کا اسلام اور اسلام کے طریقہ ءحیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود اب تک اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ اس کا وجود قائم ودائم ہے اور نام نہاد "عالم اسلامی" اس کا مسکن ہے! (۴۳)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (۱۹۱۸ء - ۱۹۹۸ء)

کرم شاہ الازہری، پیر محمد ایک عالم دین وہ کئی حوالوں سے امت مسلمہ میں جانے جاتے ہیں مثلاً عالم دین، مفسر، سیرت نگار، مصنف اور مدرس کے طور پر ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ والد محترم پیر محمد شاہ بھی ایک عامل اور تحریک پاکستان کے شہسواروں میں سے تھے۔ پیر کرم شاہ نے ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر حاصل کی اور پھر دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ سے فیض حاصل کرتے رہے۔ حدیث کی تعلیم انہوں نے مولانا سید محمد نعیم الدین کی صحبت میں حاصل کی۔ دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا اور پھر قدیم اسلامی درسگاہ جامعہ الازہر مصر میں چلے گئے۔ وہاں تین سال تک پڑھائی کر کے جامعہ کی اعلیٰ سندات حاصل کیں۔ وطن واپس آ کر انہوں نے دار العلوم محمدیہ رضویہ بھیرہ شریف میں درس و تدریس کا سلسلہ سنبھالا اور پھر انہوں نے نشر و اشاعت اور تصنیف و تالیف کا باضابطہ طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک مشہور دینی اور روحانی پرچہ ضیائے حرم جاری کیا۔ پیر کرم شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب "ضیاء النبی" اور تفسیر قرآن مجید "ضیاء القرآن" بھی ترتیب دے کر زیور طباعت سے آراستہ کی۔ یہ دونوں تصانیف اپنے اپنے موضوع پر بیسویں صدی کی اہم اور وقیع تصانیف ہیں جو دراصل صدیوں اور سنین کی حد بندیوں سے اپنی فیض رسانیوں کے باعث ماورا ہیں۔ سلسلہ تصوف اور رشد و ہدایت میں وہ خواجہ ضیاء الدین سیالوی اور خواجہ قمر الدین سیالوی سے فیض یافتہ تھے۔ وہ کئی برسوں تک قومی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے اور شریعت کونسل کے جسٹس عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔ (۴۴)

اللہ پر ایمان لانے کے بعد استقامت ہی دراصل کامیابی کی کنجی ہے۔ حقیقت میں اسلام کو ان لوگوں نے ہی سرخرو و سر بلند کیا ہے جو دعویٰ حق میں سچے تھے۔

حق گوئی و بے باکی ہی قوموں کو سر بلند رکھتی ہے۔ اور جب حق کو بلند کرنے والے ہی مسلکوں اور گروہوں کی بنیاد پر زبان کھولتے ہوں اور جب جزئیات کی بنیاد پر صحیح اور غلط کا الزام لگانے کا عمل جاری ہو جائے تو اس ملت سے رعب و دبدبہ اٹھا لیا جاتا ہے اور وہ قوم اپنے بحث و مباحث میں غرق رہتی ہے اور طاغوتی طاقتیں ان کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

یہ دین قیم جس نے عالم بشریت کی تقدیر بدل دی اس کی تبلیغ و اشاعت ایک اہم ترین فریضہ ہے۔ اگر اس ملت میں ایسے افراد نہ ہوں جو اس پیغام رحمت کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں تو یہ عالمگیر پیغام ہدایت چند ملکوں میں محدود ہو کر رہ جائے گا اور یہ اس پیغام سے بھی ناانصافی ہوگی اور ان قوموں پر بھی ظلم ہوگا جو گھپ اندھیروں میں بھٹک رہی ہیں۔

جن کی زندگی کی تاریک رات کسی روشن چراغ کو ترس رہی ہے۔ نیز وہ قوم اور ملک جن نے اس دین کو قبول کرلیا ہے اس کے آئینہء دل پر غفلت کی گرد پڑسکتی ہے۔ ان کی گرمیء عمل بھی سستی کا شکار ہوسکتی ہے ارد گرد کے گمراہ کن تاثرات سے بھی وہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسی ہستیاں نہ ہوں جن کا کام ہی اسلام کے حکیمانہ انداز سے لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا، انکی گرمیء عمل کو برقرار رکھنا اور خارجی واجنبی تاثرات وتحریکات سے ان کے دل ودماغ کو محفوظ رکھنا ہوتو بہت سی گمراہیاں خود اس قوم میں راہ پاسکتی ہیں جو جو اس دین کی علمبردار ہے۔ یہ دونوں کام یعنی ملتِ اسلامیہ کو شاہراہ اسلام پر ثابت قدم رکھنا اور غیر مسلم اقوام تک یہ پیغام رُشد وہدایت پہنچانا جتنے اہم اور ضروری ہیں اتنے ہی مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ اس لیے ایک ایسی جماعت تیار کرنا ملت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ جس کا علم وعمل ظاہر وباطن، سیرت وکردار، رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مظہر کامل ہو۔ ان میں علوم اسلامیہ میں مہارت نامہ کے ساتھ ساتھ سیرت کی پاکیزگی، کردار کی پختگی اور ظاہر وباطن کی یکسانی پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے جس بڑی سے بڑی مالی قربانی، ایمانی فراست، قلبی بصیرت اور روحانی تربیت کی ضرورت ہے وہ پوری ہونی چاہیے۔ اگر ملت اپنے اس اہم ترین فریضہ کو ادا نہ کرے گی وہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں اپنی اس کوتاہی کے لیے جوابدہ ہوگی۔ تاریخ شاہد ہے جب تک ایسے افراد تیار ہوتے رہے گلشن اسلام میں فصل بہار رہی۔ جب تک مدارس اسلامیہ غزالی، رازی، سعدی اور بیضاوی اور خانقاہیں رومی، ہجویری، اجمیری زکریا ملتانی، شیخ سرہندی رضی اللہ عنہم وعن مشائخہم وخلفائہم ایسی فخر روزگار ہستیاں تیار کرتی رہیں کفر کے ظلمت کدے اسلام کے نور سے روشن ہوتے رہے۔ حق کی قوت باطل کے قلعوں کو مسخر کرتی رہی۔ لیکن اب؟ رویم ہبیں حالم مپرس۔ میرا چہرہ دیکھ لو۔ اس پر میری حرماں نصیبیوں کی داستان کا ہر حرف کندہ ہے۔ میرا حال پوچھو نہیں یہ اتنا درد انگیز ہے کہ نہ مجھ میں بیان کرنے کی ہمت اور نہ تم میں سننے کی تاب۔ یہود ونصاریٰ نے اپنے دین کے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا تھا اور فروعی وجزوی مسائل کو انہوں نے اتنی اہمیت دے رکھی تھی کہ انہیں کی وجہ سے کفر کے فتوے لگائے جاتے اور ملت کی وحدت کو اس طرح انتہائی بے دردی سے پارہ پارہ کردیا جاتا۔ آج ہم بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک کعبہ رکھنے والی قوم نے اپنے آپ کو بے شمار فرقوں میں بانٹ رکھا ہے اور علماء سوء نے ان کے درمیان نفرت و عداوت کی اتنی بلندی دیوار کھڑی کردی ہے کہ اب ان کے آپس میں مل بیٹھنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس عذاب عظیم کا مشاہدہ ہم اپنی آنکھوں سے کررہے ہیں۔ الحاد ودہریت کے طوفانوں نے ہمارے بنیادی عقائد کے قلعوں میں شگاف ڈال دیئے ہیں اخلاقی انحطاط اور اباحیت نے ہمارے معاشرہ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

اشتراکیت و شیوعیت کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ان اسلام دشمن تحریکوں کے مہلک اثرات کا بھی ہمیں بخوبی علم ہے لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بے حسی اور بے بسی نے ہماری تعمیری صلاحیتوں کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ ہمیں اپنے گروہی نظریات اور مفادات اتنے عزیز ہیں کہ ہم اسلام کے بنیادی عقائد اور اصولی نظریات کا چمن اجڑتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ یہی عذاب عظیم ہے۔ کسی قوم کے لیے بے حسی اور بے بسی سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہوسکتا۔

قومیں اپنے زوال و انحطاط کے دور میں انہیں بے بنیاد خیالات سے اپنی نجات کی آس لگائے رہتی ہیں اور عمل صالح سے آنکھیں بند کر لیتی ہیں کاش ہم بھی اپنی حالت پر غور کریں اور احکام شرعی سے کھلی بغاوت کے باوجود اپنی نجات کے جو سنہرے سپنے دیکھ رہے ہیں ان سے چونکیں۔

اگر ہم اپنے اسلاف کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرتے تو ان کی مادی اور روحانی برکات سے خود بھی مالا مال ہوتے اور دوسری گم کردہ راہ قوموں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوتے۔ ہم وارثان اسلام اور مدعیان شریعت کی محرومیوں اور حال زار کو دیکھ کر دوسری قومیں اسلام کو دور ہی سے سات سلام کر دیتی ہیں۔ (۴۵)

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی: (۱۹۱۷ء - ۲۰۰۸ء)

آپ جناب نور احمد خان کے فرزند اور حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر کے چھوٹے بھائی ہیں، ۱۹۱۷ء میں "چیڑاں ڈھکی" داخلی کڑمنگ بالا، تحصیل مانسہرہ ہزارہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تا انتہائی تعلیم اپنے بڑے بھائی کے ساتھ حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۶۱ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ طبیہ کالج حیدر آباد دکن سے علم طب میں میں سند حاصل کر کے واپس آئے تو گوجرانوالہ میں قیام کرتے ہوئے کچھ عرصہ کامیاب مطب بھی کیا۔ اس کے بعد تدریس کے عمل کو ترجیح دی۔

ابتدائی دور میں آپ سیاسی طور پر جماعت احرار سے منسلک تھے، تقریباً ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک آپ نے اس جماعت میں کام کیا، اس کے بعد آپ جمعیت علماء ہند کے ساتھ ہو گئے، ایک کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ گوجرانوالہ شہر میں جمعیت علماء ہند کے صدر حضرت قاضی نور محمد صاحب نور اللہ مرقدہ تھے، اور حضرت مفتی عبدالواحد صاحب نور اللہ مرقدہ ناظم تھے، آپ نے گوجرانوالہ میں جمعیت العلماء ہند کے پلیٹ فارم سے کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ آپ نے ۶ اپریل ۲۰۰۸ء کو گوجرانوالہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۴۶)

قدرت نے بحیثیت مسلمان نہ صرف دل و دماغ کی صلاحیتیں دی ہیں بلکہ وہ راہ ہدایت اور سر چشمہء ہدایت بھی دی ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے مدمقابل ٹھہر نہیں سکتی مگر جب مسلمانوں نے اپنے طرز کو چھوڑ کر اغیار کے ظاہری چکا چوند میں کھونا شروع ہوئے تو ان کے دست نگر بن گئے۔

صاحب تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی صاحب مسلمانوں کے زوال کے حوالہ سے جلد چہارم میں فرماتے ہیں:

اس وقت دنیا میں پچاس کے قریب اسلامی حکومتیں ہیں مگر کوئی بھی اپنی رائے میں آزاد نہیں ہے۔ سب غیر مسلموں کے دستِ نگر ہیں۔ تمام اہم امور انہی کے مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ جب سے خلافتِ ترکی کا خاتمہ ہوا ہے مسلمانوں کا وقار ختم ہو گیا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنے خطبہ میں لکھا ہے کہ مصر کا ایک انگریز اپنے ملازم سے کہ رہا تھا۔ کہ ہم تمھارے خلیفہ سے بہت خائف ہیں۔ جب کوئی شکایت خلیفہ کے سامنے پیش ہوتی ہے وہ اُس کے تدارک کی فوراً کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے کفار کو ہزیمت اٹھانا پڑتی ہے۔ اگر خلافت کی طاقت نہ ہوتی، تو ہم مسلمانوں کو بہت ذلیل کرتے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب خلافتِ اسلامیہ بالکل کمزور ہو چکی تھی۔ اور جب یہ اپنے عروج پر تھی، تو کسی کو مُسلمانوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اب حالات بالکل بدل چکے ہیں اور مُسلمان ہر جگہ غیر مسلموں کے تختہء مشق بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب مُسلمان اپنے مشن کو ترک کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب دنیا میں اُن کو عزت کا کوئی مقام حاصل نہیں۔ اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی بجائے اغیار کے مشوروں کے سہارے پر چل رہے ہیں، کوئی معاملہ ہو، سیاسیات ہوں یا اقتصادیات، زراعت ہو یا تجارت ہر چیز میں غیر مسلم دخیل ہیں، حتٰی کہ تہذیب اور فیشن بھی اُنہی کا اپنا لیا گیا ہے، وقار تو اُن قوموں کو ہوتا ہے، جو اپنے نظریے پر قائم ہوں۔ مسلمان جب تک اپنے مشن پر قائم رہے انہیں دنیا میں عزت و وقار حاصل تھا۔ مگر اب ہم نے غیروں سے مشورے طلب کر کے خود اُن کو اپنا راز داں بنالیا ہے۔ وہ ہمیں اچھا مشورہ کیسے دے سکتے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ ہماری ٹانگ کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ غیر اقوام کے ساتھ دلی دوستی قائم نہیں کرنی چاہیے۔ (۴۷)

اِس وقت دنیا میں مسلمان جس تنزل کا شکار ہیں اسکی اسی ۸۰ فیصد وجہ کفار کی مداخلت ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے قوانین، سیاست، تجارت، تعلیم، ٹیکس وغیرہ میں دخیل ہیں۔

غیر مسلم کافر ہوں یا مشرک، یہودی ہوں یا نصرانی، کمیونسٹ ہوں یا دہریے وہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدابیر کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی آج زبوں حالی یہ ہے کہ اُن کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے۔ رسوخ عقیدہ مفقود ہے۔ قرآن پر غور و تدبر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حضور ﷺ کی تعلیمات سے دلچسپی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا دین اور اخلاق دونوں بگڑ چکے ہیں۔ کفار ہمارے تمام معاملات میں دخیل ہیں۔ ترکی کے معاملات میں امریکہ دخل اندازی کر رہا ہے۔ عرب اُس کے مشورہ کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتے، ترقی پذیر ممالک میں ایڈوائزر وہاں سے آتے ہیں۔ لہٰذا مُسلمان ترقی کی بجائے تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ اللہ نے اس لیے خبردار کیا ہے کہ اگر اُن کی بات مانو گے تو وہ تمہیں دوبارہ کفر کی طرف لے جائیں گے عیسائی مشنریاں اس پر مستزاد ہیں۔ مسلمان ممالک میں خاص طور پر کام کر رہی ہیں۔ تیس تیس سال تک کام کرنے کے بعد رپورٹ دیتی ہیں کہ اگر چہ مسلمانوں کو عیسائی تو نہیں بنایا جا سکا۔ مگر اُن کے نظریات اس قدر بگاڑ دیے گئے ہیں۔ کہ وہ مسلمان بھی باقی نہیں رہے۔ (۴۸)

فصل سوم

نومسلم مفکرین کی نظر میں

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء- ۱۹۴۴ء)

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ خود نوشت حالات میں وہ بتاتے ہیں کہ میں عموماً سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔... میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ (۴۹) ۱۸۸۴ء میں وہ کتاب "تحفتہ الہند" اور "تقویت الایمان" پڑھنے کے بعد اسلام کی جانب مائل ہوئے اور پھر تحفتہ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام عبید اللہ رکھ لیا۔ جلد ہی مشرف بہ اسلام ہو کر انہوں نے ارکین اسلام کی پابندی شروع کر دی۔ پہلے چونڈی شریف کے حافظ محمد صدیق سے سبق حاصل کیا۔ اور پھر دیوبند دارالعلوم میں داخلہ لے لیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے اکتساب فیض کیا۔ عربی زبان میں دسترس حاصل کی اور پھر تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کر کے سندھ میں آ گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ۱۹۰۱ء میں گوٹھ پیر جھنڈ میں ادارالارشاد قائم کیا، تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا اور پھر دیوبند چلے گئے۔ دیوبند میں ان کی خدمات مثالی رہیں۔ ۱۹۱۵ء میں جب برعظیم میں ہجرت تحریک زوروں پر تھی تو آزادی وطن کی خاطر افغانستان ہجرت کر کے چلے گئے۔ لیکن استاد محترم محمود حسن سے رابطہ رکھا۔ افغانستان سے وہ چند مہینوں بعد وہ ترکی چلے گئے اور وہاں ۱۹۲۴ء میں تحریک ولی اللٰہی کے تیسرے دور کا آغاز کیا۔ وہیں سے آزادی ہند کا منشور استنبول سے شائع کیا۔ پھر ترکی کے بعد حجاز اور بعد میں وہ مکہ مکرمہ میں رہے۔ مولانا محمود حسن کی تحریک آزادی میں بالخصوص تحریک ریشمی رومال میں انہوں نے اہم اور مثالی کردار ادا کیا۔ وہ عمر بھر مسلمانوں کی آزادی اور حقوق کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ (۵۰) ہندوستان میں مولانا نے اپنی اس سعی مخلصہ اور کشمکش انقلاب کے لیے طبعی عمر گذار دی اور بالآخر ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو اس فانی جہاں سے کوچ کر گئے۔ "قرآن کی محبت دل میں جا گزیں کرو اُسے اپنے فکر و عمل کی اساس بناؤ۔ اور پھر زندگی کے مسائل کو سوچو، سمجھو اور ان کو سلجھاؤ۔ ہوا یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے پہلے تو قرآن کی جلدیں باندھیں پھر اسے غلافوں میں لپیٹا۔ ہم ان غلافوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں۔

ہم ان جلدوں کو پھاڑ دیں گے تا کہ قرآن جیسا وہ ہے لوگوں کے پاس پہنچے، اپنی اصلی شکل میں، بالکل واشگاف اور بے نقاب، لوگ اسے پڑھیں اور اپنی زندگی میں اُسے مشعلِ راہ بنائیں"۔(۵۱)

تمہارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے گردوپیش کو دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ اگر کبھی دیکھتے ہیں تو بس، کتابی نظر سے، وہ زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اس لئے جن علوم کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ان علوم میں اس بناء پر نہ تو خود میں کوئی زندگی کی رمق باقی ہے اور نہ وہ علوم پڑھانے اور پڑھنے والوں میں زندگی کی حرارت وتڑپ پیدا کر سکتے ہیں۔(۵۲)

محمد مارمیڈیوک پکتھال: (۱۸۷۵ء - ۱۹۳۶ء)

محمد مارمیڈیوک پکتھال کے والدِ گرامی ریورنڈسی۔جی پکتھال چلسفورڈ کے ریکٹر تھے۔ والدہ میری امیر البحر ڈی۔ ایچ اوبرائن کی بیٹی تھیں۔ ابتدائی تعلیم ہیرو میں حاصل کی۔ یورپ میں فرنچ، جرمن، اطالوی اور ہسپانوی زبانیں سیکھیں۔ ترکی میں عربی اور ترکی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ ایام جوانی میں انہیں بالخصوص ترکی، شام اور مصر کی سیاحت، ان میں طویل قیام اور مسلمانوں سے گہرے تعلقات پیدا کرنے کے متعدد مواقع میسر آئے۔ اس طویل صحبت کی بناء پر مسلمانوں سے انہیں ایک دلی لگاؤ اور ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کی ہم نشینی اور دوستی نے ان میں اسلام سے دلچسپی پیدا کی، عربی خوب جانتے تھے۔ قرآن کریم کا مطالعہ فرمایا۔ اور ۱۹۱۹ء میں لندن میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلامی معلومات کا یہ عالم تھا کہ اعلانِ اسلام کے ساتھ ہی جامع ووکنگ میں امامت اور خطبہ ءجمعہ کے فرائض کچھ عرصے کے لئے ان سے متعلق ہوئے، اعلان سے قبل بھی وہ ان معدودے چند انگریزوں میں سے تھے جو عالمگیر جنگ اوّل کے اختتام پر ترکوں سے مصنفانہ صلح کے لئے کوشاں رہے۔ تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں ہندوستان پہنچے، بمبئی کے مشہور قومی اخبار بمبئی کرانیکل کے فرائض ادارت ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء تک انجام دیتے رہے اور اس طرح اپنی تمام صلاحیتوں کو ہندوستان میں قومی خدمت کے لئے وقف کیے رکھا تھا..... قیامِ حیدر آباد میں انہوں نے "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا اور دیکھتے دیکھتے اسے اوّل درجہ کے جرائد کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس کے پڑھنے اور اس کے لئے لکھنے والوں کا وسیع حلقہ ءایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے قرآنِ کریم کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ وہ پہلے نومسلم انگریز تھے جنہیں یہ توفیق و سعادت میسر آئی.... حیدر آباد سے سبکدوش ہوئے تو انگلستان میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی۔ انگلستان میں ہی مئی ۱۹۳۶ء میں جنت کو سدھارے۔(۵۳)

ڈاکٹر پکتھال امت کی اس خرابی کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلم امہ عمل سے خالی اور بے روح ہو چکی ہے۔ لہٰذا صرف لسانی دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسلام میں مسلم و غیر مسلم کے لئے علیحدہ علیحدہ قانون و معیار نہیں۔ اللہ کی سلطنت کسی جانب دارانہ سلوک کی حامی نہیں۔ خدا کا قانون سب کے لئے یکساں ہے، ایسے مسلمانوں سے جن کی زبانیں تو قانونِ الٰہی کے اقرار سے خشک ہوئی جا رہی ہوں۔ لیکن جن کا دامن دولتِ عمل سے خالی ہو وہ غیر مسلم زیادہ خوش نصیب ہیں۔ جنہیں قانون اسلامی کو پوری پوری عملی متابعت کی سعادت میسر آئے: ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وا ما بانفسھم ط معیار، معتقدات کا محض اقرار و تکرار ہی نہیں بلکہ ان پر عمل ہے۔ اس دنیا اور آخرت دونوں میں انسان اپنے عمل سے ہی جانچا جاتا ہے۔ (۵۴)

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:

انسانی عمل وارتباط کے کسی شعبے میں اسلام کا معیار عہدِ حاضر کے بلند ترین معیارات سے لگا کھاتا ہے۔ لیکن اے وائے محرومی خود مسلمان کا اپنا عمل اس بلند معیار کے لئے وجہ ندامت بن رہا ہے..... اب انہیں صاف صاف دکھائی دے رہا ہے کہ ان کی درماندگی کا سبب احکامِ شریعت سے سرتابی کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ احکامِ اسلام سے انحراف کرنے والوں پر واضح ہو چکا ہے کہ ان کی زبوں حالی ان اور ان جیسے اور بہت سے سادہ و پر مغز احکام سے سرتابی کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو آج صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اقوام مغرب کی معاشی کامرانی شریعتِ اسلامیہ کے ان احکام کی متابعت کا صلہ ہے جو مادی ترقی اور معاشی مرفہ الحالی کے ضامن ہیں۔ اور جنہیں مسلمانوں نے اپنی حماقت سے اپنے دورِ زوال میں پس پشت ڈال دیا تھا۔ (۵۵)

علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) (۱۹۰۰ء - ۱۹۹۲ء)

علامہ محمد اسد ۱۹۰۰ء میں ایک یہودی عالم کے گھر پیدا ہوئے۔ پیدائشی نام لیوپولڈ ویس تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ایک مشہور جرمن جریدے فرینکفرٹر زائیٹونگ (Frankfurtur Zeitung) کے نمائندے کے طور پر شرق اوسط آئے اور مختلف عرب ممالک میں تعینات رہے۔ اس دوران میں وہ شمالی افریقہ سے لے کر سطح مرتفع پامیر (وسط ایشیا) تک عالم اسلام گھومے پھرے اور پھر اپنی تقریباً تمام عمر یہیں گزار دی۔ عالم اسلام کے سماجی نظام کے مطالعے سے انہیں اسلامی تعلیمات میں دلچسپی پیدا ہوئی اور غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "مسلمانوں کے سماجی و ثقافتی زوال کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات پر ان کی روح کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دیا ہے"۔

۱۹۲۵ء میں وہ افغانستان کے پہاڑوں کی سیر و سیاحت کر رہے تھے جب افغانی صوبائی گورنر نے اسلام سے ان کا شغف دیکھا تو ان سے کہا: "تم مسلمان ہو مگر تم جانتے نہیں"۔ وہ اس پر چونکے اور پھر اگلے سال یورپ واپس گئے تو انہیں محسوس ہوا کہ "اسلام کے بارے میں میرے رویے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ میں اسلام قبول کرلوں"۔ چنانچہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلامی نام محمد اسد اختیار کرلیا..... قیام پاکستان کے بعد علامہ محمد اسد مغربی پنجاب کے ڈائریکٹر اسلامی تعمیر نو کے منصب پر فائز رہے۔ پھر انہوں نے پاکستان کی وزارت خارجہ میں بطور ڈائریکٹر کام کیا۔ وہ پاکستان کے اسلامی آئین کی تیاری کا کام کرنے والی کمیٹی کے رکن بھی تھے اور بعد میں انہوں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے متبادل مندوب کے فرائض بھی انجام دیے۔ مشہور مسلم سکالر محمد مارماڈیوک پکتھال کی وفات کے کئی سال بعد وہ ماہنامہ "اسلامک کلچر" کے مدیر رہے۔ آخری عمر میں وہ طنجہ (مراکش) اور ساحل اسپین پر جبرالٹر (جبل الطارق) میں مقیم رہے۔ جو تین صدیوں سے برطانیہ کے تسلط میں ہے۔ ان کا ترجمہ و تفسیر قرآن The Message of The Quran کے نام سے ۱۹۸۰ء میں دار الاندلس، جبرالٹر سے شائع ہوا۔ انہوں نے بخاری شریف کے کچھ حصے کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ علامہ محمد اسد نے فروری ۱۹۹۲ء جبرالٹر میں رحلت فرمائی۔(۵۶)

علامہ اسد نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مسلمانوں کو قریب سے اور تحقیقی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے میں گزارا تھا۔ وہ اسلام کو سچا مذہب سمجھتے تھے اور مسلم امہ سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حق بات کہنے سے نہیں چوکتے اور مسلم امہ کے عروج کے خواہشمند تھے وہ کہتے ہیں کہ مسلم دنیا میں آج جو المناک انتشار پھیلا ہوا ہے اسکو دور کرنے کے لیے اس کتاب (Islam at the Cross Road) اس امید پر پیش کر رہا ہوں کہ اس سے آج کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔

علامہ اسد مسلمانوں کے اندر پیدا ہو جانے والی دنیاوی شان و شوکت اور اس کے حصول میں غیروں کی نقالی کو زوال کا سبب گردانتے ہیں۔ اور مختلف امثال سے امت کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

امت مسلمہ کے زوال پر وہ اس طرح رقمطراز ہیں مسلم دنیا میں مغرب کی نقالی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ مغربی خیالات اور تصورات کو اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس طرح وہ بتدریج ماضی سے اپنا رشتہ کاٹتی چلی جا رہی ہے، نہ صرف اپنی ثقافتی جڑیں بلکہ روحانی جڑیں بھی کاٹ رہی ہے۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جو بہت توانا تھا مگر اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے درخت آہستہ آہستہ گرتا چلا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی غذا سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے پتے جھڑ چکے ہیں، اس کی شاخیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب صرف تنا رہ گیا ہے جس کے گرنے کا خطرہ ہے۔

عالم اسلام اس وقت رو بہ زوال ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عملی مذہب کو محض ظاہری رسوم و رواج کا مذہب بنا دیا گیا ہے اور اس کی روح نکال کر اسے بے جان کر دیا گیا ہے۔ اس کے احیاء کا صحیح طریقہ مغرب کی نقالی نہیں ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ مسلمان ذہنی اور عقلی تحریک کے لیے جس کی انہیں آج شدید ضرورت ہے، کس طرف دیکھیں؟

جواب بڑا آسان ہے۔ درحقیقت جواب سوال ہی میں مضمر ہے۔ اس کا جواب اسلام ہے جس کے متعلق میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ یہ صرف عقیدہ نہیں بلکہ انفرادی اور سماجی زندگی کا لائحہ عمل ہے۔ بیرونی ثقافت اس کو ہڑپ کر کے ختم کر سکتی ہے کیونکہ اس ثقافت کی اخلاقی بنیادیں بالکل مختلف ہیں۔ اس کا احیاء اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس کو اپنی ذاتی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اختیار کریں۔

نئے خیالات اور متضاد رویوں کے زیر اثر جو موجودہ دور کی خصوصیت ہے، اسلام کھوکھلی صورت میں قائم رہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس پر صدیوں سے طاری طلسمی نیند کو توڑ دیا جائے تو یہ زندہ ہو سکتا ہے ورنہ مر جائے گا۔ مسلمانوں کا حال اس وقت اس مسافر کا سا ہے جو دوراہے پر پہنچ چکا ہے۔ وہ وہیں کھڑا رہ سکتا ہے لیکن اس کے معنی فاقہ کشی کی موت ہوں گے۔ وہ اس راستہ کا انتخاب کر سکتا ہے جس پر سنگ میل لگا ہو ہے: "مغرب کی طرف" لیکن اس صورت میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ماضی سے رشتہ کاٹنا ہوگا۔ یا پھر وہ دوسرا راستہ اختیار کر سکتا ہے جس کا سنگ میل کہتا ہے: "اسلام کی حقیقت کی طرف"۔ یہ راستہ صرف ان لوگوں کا ہے جو اپنے ماضی پر اور اس کو ایک جاندار مستقبل میں تبدیل کرنے کے امکانات پر یقین رکھتے ہیں۔ (۵۷)

نومسلم مریم جمیلہ (سابق مارگریٹ مارکس، نیویارک) (۱۹۳۴ء پ)

مریم جمیلہ (پیدائشی نام: مارگریٹ مارکس) معروف مصنفہ، صحافی، شاعرہ اور مضمون نگار ہیں جو ۲۳ مئی ۱۹۳۴ء کو نیو یارک کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئی۔ جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن سے شائع ہونے والے مسلم ڈائجسٹ کے لیے تحاریر لکھنے کے بعد انہوں نے ۲۴ مئی ۱۹۶۱ء کو اسلام قبول کر لیا۔ جمیلہ اسلام کے حوالے سے دو درجن سے زائد کتب کی مصنفہ ہیں۔ وہ پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھیں۔ اس لیے اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان میں سکونت اختیار کی۔ ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ مسلم ڈائجسٹ میں سید مودودی کا چھپنے والا مضمون حیات بعد الموت تھا جس کے بعد انہوں نے ۵ دسمبر ۱۹۶۰ء کو سید ابوالاعلیٰ مودودی سے بذریعہ خط پہلا رابطہ کیا۔ مودودی اور جمیلہ کے درمیان خط و کتابت کا یہ سلسلہ ۱۹۶۲ء تک جاری رہا۔ ان خطوط کا موضوع اسلام اور مغرب ہوتا تھا۔

وہ محمد پکتھال کے ترجمہ قرآن اور محمد اسد کی یہودیت چھوڑ کر اسلام کی کہانی سے بے حد متاثر تھیں۔ ۱۹۶۲ء میں وہ لاہور پہنچیں جہاں انہوں نے مودودی اور ان کے اہل خانہ سے ملاقات کی۔ بعد ازاں انہوں نے پاکستان میں ہی محمد یوسف خان نامی شخص سے شادی کی اور لاہور میں رہائش اختیار کی۔

قبول اسلام کے حوالہ سے وہ لکھتی ہیں:

چنانچہ اسلام اور اسلامی افکار و تصورات کے ساتھ میری روز افزوں ہم خیالی کو دیکھ کر میرے واقف کار یہودی غضب ناک ہو گئے۔ ان کے نزدیک میں نے اُن سے سخت دغا کی تھی۔ وہ مجھے بے غیرت قرار دیتے اور کہتے کہ میرا یہودیت سے انکار اپنی آبائی میراث اور یہودی قوم سے شدید نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مجھے متنبہ کرتے کہ میں نے مسلمان ہونے کی کوشش کی تو اہلِ اسلام مجھے کبھی دل سے قبول نہیں کریں گے۔ یہ خدشات کلیتاً بے بنیاد ثابت ہوئے۔ آج تک کسی مسلمان نے مجھ پر یہودی النسل ہونے کی بنا پر انگشت نمائی نہیں کی۔ جب میں مشرف باسلام ہوئی تو مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے میرا خیر مقدم کیا اور اس طرح پیش آئے گویا میں انہی میں کی ایک فرد تھی...... میں نے اسلام اپنے اجداد کی میراث اور اپنی قوم سے نفرت کی بنا پر قبول نہیں کیا۔ میری اس خواہش کے پیچھے استرداد سے زیادہ تکمیل کا جذبہ کارفرما تھا۔ میرے لیے اس کا مطلب ایک جاں بلب اور محدود مذہب کو چھوڑ کر ایک ایسے متحرک اور انقلابی مذہب کا اپنانا تھا، جو عالمگیر اقتدار اعلیٰ سے کم تر کسی چیز پر قناعت نہیں کرتا۔ (۵۸)

مریم جمیلہ مسلم امہ کے زوال کی نشاندہی کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کرتی ہیں کہ جب دوسری قومیں کی نقالی کی جاتی ہے تو گویا ذہنی طور پر اس کو اپنے سے بہتر تسلیم کر لیا جاتا ہے مسلمانوں نے اپنی زندگی سے جب عملاً شریعت کو دیس نکالا دیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مزید پستی کی طرف چلے گئے۔ لہٰذا یہ دیکھنا چاہیئے کہ اگر ہم واقعی مسلمان ہیں اور اپنے دین کی سالمیت کو عزیز رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی دینی و تہذیبی انفرادیت کو پُوری قوّت کے ساتھ برقرار رکھیں اور اُس پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دیں۔ تہذیب جدید کا نظریہء الحاد، اس کی مادّہ پرستی اور اُس کے قوانین اور اداروں کو، جو ان تمام چیزوں کے لیے سخت تباہ کن ہیں جنہیں ہم عزیز رکھتے ہیں، نہ صرف مسترد کر دیں بلکہ اسلامی نظامِ حیات کی تعمیری اور مثبت اقدار پر مسلسل زور دیں اور انہیں اپنی زندگی میں عملاً نافذ کریں۔

امریکہ اور یورپ والے جب یہ دیکھ رہے ہوں کہ وہ ملک جہاں مسلمان صدیوں سے بھاری اکثریت میں چلے آتے ہیں۔

مغربی تہذیب وثقافت کو اپنانے اور اپنی اسلامی میراث کو تج دینے کے لیے نہایت بے چین ہیں، تو ایسی صورت میں اُن سے یہ توقع کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے، کیا سراسر غیر منطقی بات نہیں ہے؟ جس حق کے لیے مسلمان خود عملاً کوئی جذبہء احترام ظاہر نہیں کرتے غیر مسلم اُسے مقدس گردان کر کیوں کر اپنا سکتے ہیں؟ کیا یہ بات مضحکہ خیز اور صریح منافقت نہیں ہے کہ ہم یورپ اور امریکہ کے غیر مسلموں کو تو اسلام کا سیاسی نظام اپنانے کی دعوت دیں اُس کی حسنات کے گُن گائیں اور یہ وعظ کریں کہ اسلام ایک مکمل اقتصادی نظام ہے اور اپنے دامن میں تمام معاشرتی مسائل کا حل رکھتا ہے، لیکن عالمِ اسلام کے کسی گوشے میں ایسے معاشرے کا عملاً وجود تک نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر مضرت رساں بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم سر پھرے قوم پرست آمروں کے سائے میں برائے نام سیاسی آزادی، فنی اور صنعتی ترقی، لادینی تعلیمی اداروں کے فروغ وعروج، عورتوں کو رائے دہی کے حق، سعودی عرب میں غلامی کی تنسیخ اور مکہ و مدینہ کے مقدس شہروں میں فلکِ بوس عمارتوں کی تعمیر کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ خلط ملط کر دیں۔ یہ باتیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا "بیداری" کا مظہر نہیں ہیں بلکہ ان سے تو مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب ونظریات کے بڑھتے ہوئے غلبے کا پتہ چلتا ہے۔ جب تک ہم خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے دین کو نافذ کرنے کی حقیقی، زندہ اور عملی مثال پیش نہیں کرتے غیر مسلم دنیا پر کسی قسم کا فیصلہ کن دینی اور اخلاقی اثر ڈالنے کی توقع یکسر عبث ہے۔ (۵۹)

صحیح اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کے مخالف بغلیں بجا بجا کر کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے معدوم ہو چکی ہے۔ اس کا تخلیقی دور ماضی کی تاریخ بن چکا ہے۔ اس کے دامن میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ مسلمان ممالک نے مغربی تہذیب کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے جس طرح شکست کھائی اس کے ایک ایک مرحلے کی داستان یہ لوگ بغلیں بجا بجا کر بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی زندگی کا انتشار اور مسلمانوں کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینے میں مکمل کامیابی ناگزیر ہے۔ مزید برآں وہ بڑے وثوق سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عمل کو کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ مفروضہ یہ ہے کہ جدید تہذیب ناقابلِ تسخیر ہے۔ ان پامال اور فرسودہ جملوں نے مسلمانوں کی نوخیز پود کو پست ہمت کرنے میں جو کامیاب کردار ادا کیا ہے ہمارے دشمنوں کا بڑے سے بڑا ماہرانہ پراپگنڈا بھی نہیں کر سکا۔ اگرچہ مغربی تہذیب کے ناقابل تسخیر ہونے کا پراپگنڈا بڑے زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ نسلی نفرت، طبقاتی کش مکش، لاقانونیت کی وبا، تخریبی مقاصد کے لیے سائنسی کارناموں کا بے جا استعمال، خاندان کا بے جا اضمحلال، ناجائز جنسی تعلقات کا عالمی شوق اور انتہائی واہیات تعیشات پر قدرتی اور انسانی سرمایے کا بے اندازہ ضیاع اس تہذیب کی چند انتہائی جراحت پذیر کمزوریاں ہیں۔

ماضی میں تمام دوسری تہذیبیں جن باتوں سے ہلاکت کے گھاٹ اتریں وہی موجودہ تہذیب کو بھی یقیناً تباہ کر کے رہیں گی۔ مخالفین کے مقابلے میں ہمارے پاس گراں بہا اثاثہ یہ ہے کہ حقیقی اسلامی زندگی اس قسم کی تمام بدعنوانیوں سے بالکل پاک اور منزّہ ہے۔ مغربی تہذیب لوگوں کو اس لیے ناقابل تسخیر نظر آتی ہے کہ کوئی دوسری تہذیب مدّ مقابل نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کوئی مؤثر حریف میدان میں آ گیا تو جدید تہذیب کی بوسیدگی اور سڑاند کھل کر سامنے آ جائے گی۔ (٦٠)

حواشی وحوالہ جات (باب دوم)

(۱) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۷۷-۲۷۶

(۲) غزالی، ابو حامد محمد: "احیاء العلوم" مقبول اکیڈمی، لاہور، ج:۲، ص: ۳۸۰

(۳) طہٰ حسین، ڈاکٹر: "ابن خلدون" دار الشعور، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۸

(۴) افتخار حسین، آغا، ڈاکٹر: "قوموں کے شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ" مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۷۰-۱۶۹

(۵) ابن خلدون، عبدالرحمٰن، علامہ: "مقدمہ ابن خلدون" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۶۸

(۶) افتخار حسین، آغا، ڈاکٹر: "قوموں کے شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ" مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۷۳-۱۷۲

(۷) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۲، ص: ۳۹۶

(۸) الدہلوی، شاہ ولی اللہ: "حجۃ اللہ البالغہ" دار الاشاعت، کراچی، ص: ۶۱

(۹) گیلانی، اسد، سید: "امت مسلمہ سے خطاب" ادارترجمان القرآن، لاہور، ص: ۱۸-۱۷

(۱۰) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۲۱-۲۰

(۱۱) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۸۹-۲۸۸

(۱۲) اقبال، علامہ: "جاوید نامہ" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص: ۶۵

(۱۳) چغتائی، محمد اکرام: "جمال الدین افغانی اتحاد عالم اسلامی کا نقیب"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۶۴۴-۶۴۳

(۱۴) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۳، ص: ۳۸۸

(۱۵) شکیب ارسلان، علامہ: "اسباب زوال امت" دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص: ۵۲

(۱۶) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۵۶

(۱۷) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۶۱-۶۰

(۱۸) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۳، ص: ۹۱-۹۰

(۱۹) اقبال، علامہ: "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص: ۵

(۲۰) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۲۱

(۲۱) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۲۳۳-۲۳۲

(۲۲) اقبال، علامہ: "کلیات اقبال" نویدائے شیخ، لاہور، ص: ۳۴۴

(۲۳) چراغ، محمد علی: "انسائیکلوپیڈیا مسلم شخصیات" نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۲۲

(۲۴) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۴، ص: ۱۰۲-۱۰۱

(۲۵) ابو جرۃ عبداللہ "حسن البناء کی حکمت عملی"، ماہنامہ ترجمان القرآن اشاعت خاص، لاہور، مدیر: پروفیسر خورشید احمد، مئی ۲۰۰۷ء، ج: ۱۳۴، ص: ۳۰۵-۳۰۴

(۲۶) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۳۰۶

(۲۷) ندوی، عمیر الحسینی، "مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی ایک اجمالی خاکہ"، المرتضی للمکتبات، دہلی ص: ۶-۵

(۲۸) ندوی، ابوالحسن علی، سید: "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص: ۳۳۳-۳۳۲

(۲۹) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۳، ص:۲۵۳
(۳۰) شریعتی، علی ڈاکٹر، مترجم پروفیسر سردار نقوی: "فاطمہ فاطمہ است" ادارہ احیاء التراث اسلامی، ایران، ۱۹۹۳ء، ص:۳۸-۳۶
(۳۱) القرضاوی، یوسف ڈاکٹر: "اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۱۱-۱۰
(۳۲) القرضاوی، یوسف، مترجم عبدالحئی ابڑو: "ایک دینی اجتماع کے نام ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا پیغام"، ماہنامہ دعوۃ اسلام آباد، مدیر: ڈاکٹر انیس احمد، شمارہ ۱۲، مئی ۱۹۹۹ء ص:۳۰
(۳۳) چراغ، محمد علی: "انسائیکلوپیڈیا مسلم شخصیات" نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۸۱-۸۰
(۳۴) آزاد، ابوالکلام، مولانا: "خطبات آزاد" بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۱۰۳-۱۰۲
(۳۵) الحسینی، محمد زاہد: "تذکرۃ المفسرین" دارالارشاد، اٹک، ۱۴۰۱ھ، ص:۲۰۹
(۳۶) محمد شفیع، مفتی: "معارف القرآن" ادارہ معارف، کراچی، ۱۹۸۷ء، ج:۳، ص:۱۸۷
(۳۷) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۳، ص:۱۶۶-۱۶۵
(۳۸) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید: "قوموں کے عروج وزوال پر علمی تحقیقات کے اثرات" ادارہ ترجمان القران، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۵۷-۵۶
(۳۹) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۶۰-۵۸
(۴۰) حامدی، خلیل احمد: "جادہ ومنزل" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۲۷
(۴۱) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۴، ص:۱۱۹
(۴۲) قطب، سید شہید: "معالم فی الطریق" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۸۴-۸۲
(۴۳) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۷۱-۷۰
(۴۴) چراغ، محمد علی: "انسائیکلوپیڈیا مسلم شخصیات" نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۵۱۴
(۴۵) الازہری، کرم شاہ، پیر: "ضیاء القرآن" ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ج:۱، ص:۲۶۱-۲۶۰

(۴۶) کلیم،عبدالدیان،ڈاکٹر:"سرحد کے علماء کی سیاسی خدمات" مکتبہ دروس القرآن،گوجرانوالہ،
ص:۱۶۵-۱۶۴

(۴۷) سواتی،عبدالحمید:"معالم العرفان فی دروس القرآن" مکتبہ دروس القرآن،گوجرانوالہ،۲۰۰۹ء،ج:۴،
ص:۳۹۱-۳۹۰

(۴۸) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۴۶۰-۴۵۹

(۴۹) غلام مصطفیٰ خان،ڈاکٹر:"مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگذشت کابل"ادارہ برائے تحقیق تاریخ و
ثقافت،اسلام آباد،۱۹۸۰ء،ص:۵

(۵۰) چراغ،محمد علی:"انسائیکلو پیڈیا مسلم شخصیات" نذیر سنز پبلشرز،لاہور،۲۰۰۵ء،ص:۴۳۸-۴۳۷

(۵۱) آزاد،عبدالخالق:"خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھیؒ" دارالتحقیق والاشاعت،لاہور،۲۰۰۲ء،
ص:۵۲

(۵۲) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۲۳۶

(۵۳) پکتھال،محمد مارمیڈیوک:"تہذیب اسلامی" احسن برادرز،لاہور،۱۹۶۵ء،ص:۱۰-۹

(۵۴) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۴۱

(۵۵) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۲۳۴-۲۳۳

(۵۶) محمد اسد،علامہ:"ملت اسلامیہ دوراہے پر" دارالسلام،لاہور،۲۰۰۴ء،ص:۱۱-۱۰

(۵۷) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۸۲-۸۱

(۵۸) مریم جمیلہ:"اسلام ایک نظریہ-ایک تحریک" محمد یوسف خان،لاہور،۱۹۷۸ء،ص:۲۸-۲۷

(۵۹) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۳۸۴-۳۸۳

(۶۰) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۳۸۸-۳۸۷

باب سوم

اُمّتِ مُسلمہ کے زوال کے محرکات

باب سوم

امت مسلمہ کے زوال کے محرکات

فصل اول

شریعت الٰہی سے دوری

وہ وحی جسے اللہ تعالیٰ نے شریعت کی صورت میں انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے وضع فرمایا ہے دراصل ایک ہمہ گیر شریعت ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ کائنات اوراس میں موجودات کے مرکزی قانون سے مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر شریعت الٰہی کا اتباع انسانی زندگی، انسانی ثقافت، انسانی معاشرے، انسانی جماعت، گروہ وامت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ شریعت الٰہی کا اتباع دراصل اس بات کا متقاضی ہے کہ حیات انسانی اور حیات کائنات کے درمیان اور اس قانون کے درمیان جو انسانی فطرت اور کائنات میں کارفرما ہے کامل ارتباط ہو۔ اسی ضرورت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کائنات کے مرکزی قانون کے درمیان اور حیات انسانی کی تنظیم کرنے والی شریعت کے درمیان بھی پوری مطابقت ہو۔ نیز شریعت الٰہی کے اتباع ہی سے انسان کماحقہٗ اللہ کی بندگی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ جس طرح یہ کائنات صرف اللہ کی بندگی کر رہی ہے اور کوئی انسان اپنے لیئے اسکی بندگی کا مدعی نہیں ہے۔ اسی طرح جو ذات اس پوری کائنات کے اقتدار کی مالک ہے۔ صرف اسی ذات کو انسانی زندگی پر بھی اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔

امت مسلمہ کے زوال کا سب سے اہم پہلو شریعت الٰہی سے دوری ہے۔ جب مسلمانوں نے قرآن وسنت کو بالائے طاق رکھا اور خواہش نفس اور طاغوتی قوتوں اور لادین عناصر کے قوانین پر عمل کرنے لگے تو تنزلی کا شکار ہوئے۔

قرآن میں فرمایا گیا!

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعاً وَّ كَرْهاً وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَo (۱)

ترجمہ: "اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ زمین وآسمان کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کی تابع فرمان ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔

دوسری جگہ قرآن میں فرمایا گیا:

اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ،(۲)

ترجمہ: "اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔"

سورۃ النجم میں فرمایا گیا:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰىo اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰىo فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى o (۳)

ترجمہ: "یہ لوگ بس اٹکل اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اسکے باوجود کہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے؟ سوآخرت اور دنیا میں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔"

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماًo (۴)

ترجمہ: "نہیں اے محمد ﷺ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔"

مسلمانوں کی علمی اور مادی ترقی کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ سوال قدرتی طور پر ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بے نظیر ترقی حاصل کرنے والی قوم یکا یک علمی انحطاط میں کیوں مبتلا ہو گئی؟ تاریخ کا مواد اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ مسلمانوں میں یونانی فکر کا اثر و نفوذ ان کے انحطاط کا سبب بنا۔ مسلمان حکماء نے یونانی حکماء کے لٹریچر کو جب اپنی زبان میں منتقل کیا تو اس سے سائنس میں علمی ترقی کا دروازہ کھلا کیونکہ انہیں مادی مسائل کا علم ہوا اور ان مسائل کو انہوں نے تحقیق اور مطالعہ کا موضوع بنایا۔ یہاں تک کہ سائنس میں بے مثال تحقیقی کارنامے سرانجام دیئے مگر دینی عقائد میں گمراہی اور الحاد رونما ہونے لگا۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ مسلمان حکماء یونانی فلسفہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے دینی عقائد کی بھی یونانی فلسفے کی روشنی میں تاویلیں اور تعبیریں کرنی شروع کر دیں۔ صفات باری تعالیٰ کی حقیقت، دیدار الٰہی کی حقیقت، جبر و اختیار، جنت و دوزخ وحی و نبوت، معجزات و ملائکہ کی حقیقت، ان سب باتوں کی یونانی فلسفے کی روشنی میں تاویلیں اور تعبیریں کی جانے لگیں۔ جبکہ علمائے سلف کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ان باتوں کو قرآن کریم کی آیات منصوصہ (صریح آیات) کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور ان مسائل میں صرف اس حد تک تجسس رکھتے تھے جتنا کچھ قرآن کریم میں بتایا گیا ہوتا۔ اس حد سے زیادہ وہ ان مسائل کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وجہ اس کی بہت واضح تھی۔ ان چیزوں کو آنکھوں سے کسی نے کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے تنہا عقل کے زور پر ان کی حقیقتوں کو سمجھنا ممکن نہ تھا۔ مگر یونانی حکماء سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ نے ان میں سے بعض موضوعات مثلاً صفات الٰہی کی حقیقت وغیرہ کو اپنے مباحث کا موضوع بنایا تھا۔ لہٰذا فلسفہ پسندی کے شوق میں مسلمانوں میں سے بھی بعض حکماء نے اس شغل کو اختیار کر لیا اور ایسا کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ یونانی فلسفہ تنہا عقل کے زور پر خداشناسی یعنی خدا کے وجود کے اقرار تک بھی بمشکل پہنچے تھے۔ اس صورت میں تنہا عقل کے زور پر ان مسائل کی حقیقت کو سمجھنا کتنا مشکل کام ہے؟ وہ فلسفہ پسندی کے شوق میں ان موضوعات نارسا کے میدان میں اتر پڑے جس کا نقصان یہ ہوا کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دیگر مسلمانوں میں بھی گمراہی پیدا کی۔ (۵)

ایک حدیث میں نبی مہربان ﷺ نے فرمایا:

و عن عبد الله ابن مسعود قال خط لنا رسول الله ﷺ خطا ثم قال هذا سبيل الله ثم خط خطوطا عن يمينه و عن شماله و قال هذه سبل على كل سبيل منها شيطان يدعوا اليه و قرا و ا ن هذا صراطى مستقيما فاتبعوه الاية (٦)

ترجمہ: "عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے (سمجھانے) کے لیے ایک (سیدھا) خط کھینچا پھر فرمایا یہ راہ اللہ کی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس (سیدھے) خط کے دائیں اور بائیں چند (ترچھے) خط کھینچے، اور فرمایا یہ راہیں ہیں۔ ان میں سے ہر راہ پر شیطان ہے پکارتا ہے اس راہ کی طرف پھر آپ ﷺ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی و ان هذا صراطى مستقيما فاتبعوه ج ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله ط ذالكم و صكم به لعلكم تتقون (الانعام) اور یہ کہ یہی ہے ،راہ سیدھی میری، پس چلو اسی پر، اور مت چلو اور راہوں پر، کہ (یہ راہیں) تم کو اللہ کی راہ سے (بھٹکا کر) تتر بتر کردیں گی۔ یہ بات (نصیحت) کی ہے کہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تم کو ساتھ اسکے تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔

قرآن وسنت (شریعت) ہی وہ سانچہ تھا جس سے اس امت کے داعی اعظم ﷺ نے اپنے ماننے والوں کی تربیت کی تھی۔ حالانکہ اسوقت رومی ، یونانی اور عجمی تہذیب وتمدن اور عقائد کے علاوہ اور بھی کئی تہذیبیں جزیرۃ العرب کے قرب وبعد میں تھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ کا صرف شریعت الٰہی پر اکتفا کرتے ہوئے کسی اور کی طرف مائل نہ ہونا کسی جمود، بیگانگی وغفلت کی وجہ سے نہیں بلکہ حقیقی فلاح کے لیے وحی الٰہی اور صاحب وحی ﷺ کے حکم کی روشنی میں سفر کرکے کامیابی وعروج کی منزلیں طے کرتے رہنا تھا۔

وعن جابر عن النبی ﷺ حین اتاہ عمر فقال انا نسمع احادیث من یہود تعجبنا افتری ان نکتب بعضھا فقال امتھوکون انتم کما تھوکت الیہود و النصاری لقد جئتکم بھا بیضآء نقیة و لو کان موسی حیا ما وسعہ الا اتباعی۔(۷)

ترجمہ: "حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جبکہ ان کے پاس حضرت عمرؓ آئے پس کہا ہم یہودیوں سے حدیثیں سنتے ہیں ہم کو وہ اچھی لگتی ہیں پس آپ کا کیا خیال ہے ہم ان میں سے بعض لکھ لیں۔ فرمایا! کیا تم حیران ہو جس طرح یہود و نصاریٰ حیران ہیں۔ میں تمھارے پاس روشن صاف شریعت لے کر آیا ہوں اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری ہی اتباع کرتے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر (۸)

مسلمان اور کفار میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ اس بنیاد پر ہے کہ وہ وحی ربانی جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا وہ مسلمان اسے راہ ہدایت مانتے ہیں جبکہ بقول کفار:

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ٥ (۹)

ترجمہ: "یہ ہے ہی کیا مگر پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔"

بظاہر یہ بات معمولی لگتی ہے مگر مسلم و کافر کا ایک واضح فرق یہاں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ قصے و واقعات جن کا ذکر قرآن نے بار بار کیا ہے مسلمانوں کے لیے باعث عبرت و نصیحت اور کفار کے نزدیک وہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تو قولی معاملہ ہے مگر معاملہ جب یہ ہوا کہ وہی مسلم امہ جس کا یہ ایمان تھا کہ یہ سارے واقعات و قصص ہمارے لیے ایک تنبیہ ہے، جب عملی میدان میں اس تنبیہ کو کہانیاں سمجھنے لگے تو اسفل سافلین ہو گئے۔

خالق کائنات نے اپنے کلام میں گذشتہ اقوام کی تباہی و تنزلی کو جا بجا بیان کر کے دراصل امت مسلمہ کو تنبیہ کی ہے کہ اگر اسی روش پر چلو گے تو وہی انجام ہو گا جو پچھلوں کا ہوا۔ سنت الٰہی کے مطابق صراط مغضوب اختیار کرنے کی وجہ سے ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی گئی ہے اور یہ پیغام ہے کہ اب بھی اگر باز آ جاؤ تو اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

تنبیہات ربانی کا عنصر وحی الٰہی میں جا بجا ملتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کو خلیفہ بنانے کا کہہ کر حق کے ساتھ حکومت کرنے اور خواہش نفس کی پیروی سے اجتناب کرنے کو کہا۔ ایسی بستیوں کی ہلاکت کا ذکر کیا جو اپنی معیشت پر اتراتے تھے۔ تنبیہات ربانی کو جھٹلانے کے نتیجے میں قوم نوح، قوم عاد و ثمود و قوم شعیب وغیرہ کی تباہی کا ذکر کیا۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ جو بھی اس روش پر چلے گا اس کا انجام بھی وہی ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان حکمران جب تک لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرتے رہے ان کو عروج حاصل ہوتا رہا، مگر جب وہ خواہش نفس کی پیروی میں لگ گئے تو وہ راہ حق سے نہ صرف بھٹک گئے بلکہ ذلت وخواری ان کا مقدر بن گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو بڑی بڑی حکومتیں ملیں، بڑے بڑے امپائر بنائے، مگر یہ اس وقت تک قائم رہے جب تک وہ شکر کرتے رہے۔

ارشاد ربانی ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌo (۱۰)

ترجمہ: "اگر تم شکر گزاری اختیار کرو گے تو ہم تمہیں مزید دیں گے اور اگر تم ناشکری کرو گے تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔"

لیکن ناشکری، نافرمانی، کفران نعمت اور اپنے کارناموں پر اترانے کا نتیجہ وہی ہوا جو ناشکروں کا ہوا کرتا ہے۔ جس جگہ بھی مسلمانوں کی حکومتوں پر زوال آیا اور وہ بربادی کا شکار ہوئے، اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تنبیہات کو جھٹلایا، ان سے روگردانی کی اور قرآن کی نصیحتوں کو جب وہ اللہ تعالیٰ کی نصیحتوں کو پس پشت ڈالتے رہے جس کی وجہ سے وہ نعمتیں چھین لی گئیں جو ان کو عطا کی گئی تھیں۔

اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖo (۱۱)

ترجمہ: "اللہ نے کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں رکھے۔"

لہٰذا ایک دل میں دو کی بندگی نہیں ہو سکتی۔ ایک دل دو چوکھٹوں پر بیک وقت سجدہ ریز نہیں ہو سکتا۔ ایک اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی بناء پر مسلم دوسروں سے ممتاز تھے اور جب وہ ایک سجدہ گراں گزرا تو پستی سے ہزاروں خداؤں نے کھینچ لیا اور امت مسلمہ ثریا سے زمیں پر دے ماری گئی۔

فصل دوم

فرقہ بندی

حضور نبی کریمؐ نے جب عرب کی سرزمین پر دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تھا تو یہی عرب مختلف قبائل میں تقسیم تھے۔ حسب ونسب پر فخر کرتے تھے۔ اپنے آپکو عربی اور دوسروں کو عجمی (گونگا) سمجھتے تھے۔ مگر نبی مہربانؐ کی آمد نے ان سب کو ایک کر دیا جو صدیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑا کرتے تھے۔ جن کے دل نفرت وحسد کی آگ میں سلگتے رہتے تھے۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کی ابتداء ہی مواخاۃ سے کی گئی۔ پھر سارے رنگ ونسل، جاہ وحشمت اور کبر وغرور ختم ہو گئے اور

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ"۔ (۱۲)

کی عملی تصویر دنیا نے دیکھ لی اور پھر اس اخوت نے بے سروسامانی کے باوجود تین سو تیرہ کی تعداد نے ہزاروں کے مسلح لشکر کو پسپا کر دیا۔

قرآن وسنت کی تعلیم تو یہ تھی کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۱۳)

ترجمہ: "اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو"

ایھا الناس الا ان ربکم واحدوان ابا کم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لا سود علی احمر الا بالتقویٰ (۱۴)

ترجمہ: "اے لوگو! یقیناً تمھارا رب ایک ہے۔ اور تمھارا باپ ایک ہے (یعنی تم سب اصل کے اعتبار سے ایک ہو) عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے"۔

جس امت کو حضور نبی کریم ﷺ نے ان تعلیمات وارشادات کے ساتھ چھوڑا تھا واقعہ یہ ہوا کہ ان کی فرقہ بندی کا سلسلہ خلفائے راشدین کے بعد سے شروع ہوا تو اب تک ختم نہیں ہو سکا۔

سب سے پہلے شیعان علی کا فرقہ وجود میں آیا، وہ حضرت علیؓ کے وصی ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے، اس لئے اسلام کے پہلے تین خلفاء کے منکر ہو گئے، حضرت فاطمہ ؓ کی اولاد کو اوصیاء سمجھ کر اپنا امام تسلیم کرتے رہے، مگر یہ بھی مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے، کچھ معتدل اور کچھ غالی ہو گئے۔ غالی شیعوں میں فرقہ سبیہ عبداللہ ابن سبا کا متبع ہوا، یہ اس کی ترویج کرتا، کہ اللہ تعالیٰ مجسم ہو کر حضرت علیؓ کی شکل میں نازل ہوا۔ وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ کی طرح آسمان پر اٹھا لیے گئے ہیں۔ ایک اور غالی فرقہ غرابیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ سے اس طرح مشابہ تھے، جیسے ایک کوا دوسرے کوے سے مشابہ ہوتا ہے، حضرت جبرئیل نے غلطی سے محمد ﷺ کو وحی لا کر دے دی، ایک تیسرا فرقہ کیسانیہ ہوا، جو مختار بن عبید ثقفی کا پیرو رہا، یہ حضرت علیؓ کی اولاد کو نبی سے کم نہیں سمجھتا، اور امام حسینؓ کے خون کا بدلہ لینے کا دعوے دار ہوا، فرقہ زیدیہ غالی نہ تھا۔ یہ امام زید ابن علیؓ (زین العابدینؓ) ابن حسینؓ کا مقلد ہوا، یہ صحابہ کرامؓ کی تکفیر نہیں کرتا، لیکن اپنے ائمہ کو رسول کے بعد سب سے افضل سمجھتا ہے۔

شیعوں میں اثنا عشریہ کا فرقہ زیادہ پھیلا، یہ حضرت علیؓ سے لیکر ان کی بارہ پشت تک کی اولاد کو اپنا امام مانتے ہیں۔ اور ان ہی کو کتاب وسنت کا شارع سمجھتے ہیں۔ ان ہی میں سے فرقہ اسماعیلیہ نکلا، اثنا عشریہ امام جعفر کے بعد ان کے بیٹے موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں، اسماعیلی امام جعفر صادق کے دوسرے بیٹے اسماعیل کو اپنا امام قرار دیتے ہیں، اسماعیلیوں ہی میں سے ایک فرقہ باطنیہ ہوا، جس کا عقیدہ ہے، کہ شریعت کے باطن کا علم صرف اس کے امام کو ہوتا ہے، قرامطہ، بوہرے، خوجے اور نزاری بھی اسماعیلیوں ہی میں سے ہیں، نزاریوں کا اہم داعی حسن بن صباح تھا جس نے فدائیوں کے نام سے ایک انتہا پسند فوجی دستہ بھی قائم کیا، اور ایک ارضی جنت بھی بنا رکھی تھی، شیعوں ہی میں سے ایک فرقہ حاکمیہ بھی ہوا، جو چھٹے فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ کا پیرو تھا، اس کا خیال تھا، کہ ذات خداوندی اس کے پیشوا میں حلول کر آئی ہے۔ ایک فرقہ ایک ایرانی حمزہ الدروزی کی قیادت میں دروز کے نام سے ابھرا، دروز اس کو قائم الزماں اور مظہر عقل کل تسلیم کرتے، شام کا ایک فرقہ نصیریہ بھی حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل تھا۔

باطنیوں میں سے بابی اور بہائی فرقے نکلے، ایک مشہور لیکن ضعیف حدیث ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا باب ہیں، شیخ احمد زین الدین احسائی نے دعویٰ کیا، کہ وہ علم کے شہر کا باب یعنی تمام باطنی اسرار سے واقف ہے، یہ فرقہ شیخیہ کہلانے لگا، شیخ احمد کے جانشین سید علی محمد شیرازی نے مامور الٰہی اور باب ہونے کی حیثیت سے حامل نبوت اور پھر مظہر الوہیت ہونے کا اعلان کیا، ان کی وفات کے بعد ان کے دو مریدوں میں جانشینی کا جھگڑا ہوا ایک کا لقب صبح ازل اور دوسرے کا بہاء اللہ تھا۔

ان دونوں مریدین ازلیہ اور بہائی کہلائے ،مگر جو باب کے کسی جانشین کے قائل نہ تھے، بابیہ کے نام سے مشہور ہوئے، بہاء اللہ نے من یظہرہ اللہ ہونے کا اعلان کیا، اور ایسے دین کی تبلیغ کی جس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کیا گیا، کہ یہ تمام ادیان کا ناسخ ہے اور سب کی نمائندگی کرتا ہے، بابیوں کو اس سے اختلاف رہا، مگر وہ اس کے قائل رہے کہ ہر ہزار سال کے بعد شریعت بدل جاتی ہے، شیعوں کے ساتھ خوارج کا بھی فرقہ پیدا ہوا، یہ ایک سیاسی فرقہ تھا جو شیخین کے علاوہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، کو نعوذ باللہ گمراہ تصور کرتے اور ان کے ماننے والوں کو کافر اور مباح الدم قرار دیتے، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا حکم قابل قبول نہیں سمجھتے ، وہ اس کے بھی قائل تھے کہ کوئی بھی مسلمان انتخاب کے ذریعہ خلیفہ ہو سکتا ہے، انہوں نے اپنے غلو میں اس خیال کو دینی رنگ دیدیا اور عبداللہ بن وہب الراسبی کو اپنا امیر المومنین بنایا، مگر ان کے بھی کئی فرقے ہو گئے۔(۱۵)

گروہوں اور فرقوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصد حیات خالق کائنات سے جڑنے اور جوڑنے کے بجائے اپنے مسلک سے جوڑنے کی اور اس کی ترقی و کامیابی مشن بن کر رہ گیا ہے۔

نافع بن ازرق کے پیرو ازارقہ کہلانے لگے، وہ اپنے مخالفین کو مشرک اور جہنمی سمجھ کر قتل کر دینے میں تامل نہ کرتے، عبد اللہ ابن اباض کو اس انتہا پسندی سے اختلاف ہوا، تو وہ علٰیحدہ ہو کر فرقہ اباضیہ کا بانی ہوا، پھر نجدہ بن عامر کے مقلدین فرقہ نجدات سے موسوم ہوئے، جو اشاعت اسلام کے لئے امام کے تقرر کو شرعی حیثیت نہیں دیتے، مگر ان سے الگ ہو کر ایک فرقہ نے ابو فدیک کی رہنمائی اختیار کی، فرقہ صفریہ زیاد بن الاصفر کا معتقد ہوا، جو اپنے مخالفین کو مشرک نہیں سمجھتا، عبدالکریم بن عجرد کے ماننے والے عجاردہ کہلائے، یہ اس کے قائل تھے کہ بچے جب تک جوان ہو کر باضابطہ ایمان نہ لائیں، خارج از اسلام ہیں، ان کی بھی علٰیحدہ علٰیحدہ شاخیں میمونیہ، حلفیہ، حمزیہ، شعوبیہ اور خازمیہ وغیرہ کے نام سے ہو گئیں، یہ بچوں کے ایمان کے بارے میں متشدد ہیں، ایک فرقہ یزیدیہ نے اس کی ترویج کی کہ عجمیوں میں بھی ایک رسول پیدا ہوگا۔

اہل السنۃ والجماعۃ میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے اجل فقہاء ہوئے جن کے مقلدین حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کہلائے۔ ان سے الگ اہل حدیث ہیں، جو کسی امام کے مقلد نہیں ہیں، مگر وہ سنی ہی سمجھے جاتے ہیں، سنیوں میں متکلمانہ اور فلسفیانہ موشگافیاں ہونے لگیں تو اعتقادی طور پر ان کے علٰیحدہ علٰیحدہ فرقے ہو گئے۔

ایک فرقہ جبریہ ہوا، جو اس کا قائل تھا کہ انسان سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے، وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت خراسانی الاصل جہم بن صفوان نے کی، اس کے مقابلہ میں قدریہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

جنہوں نے غیلان دمشقی کی اہم قیادت میں فرقہ جبریہ کی تردید یہ کہہ کر کی کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی تعلق نہیں، پھر ایک فرقہ مرجیہ پیدا ہوا، جس میں ایک مرجیۃ السنّت اور ایک مرجیۃ البدعت کہلایا، مرجیۃ السنّت کا خیال تھا کہ گنہ گار کو اس کے گناہ کے مطابق سزا دی جائے گی، مگر وہ دائمی جہنمی نہیں ہوگا، مرجیۃ البدعت کہتے ہیں کہ ایمان کی موجودگی میں معصیت سے ضرر نہیں پہنچتا، واصل بن عطا کی سرکردگی میں معتزلہ کا گروہ پیدا ہوا، جو مسائل کو عقل پر رکھتا، اور جو بات عقل کے مطابق نہ ہوتی، اس کو رد کر دیتا، اس کی عقلی تعبیرات سے خلق قرآن باری تعالیٰ کی ذات، صفات اور رؤیت پر طرح طرح کی بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں، جن سے فقہاء اور محدثین کو سخت اختلاف ہوا، مگر معتزلہ کے بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ہذیلیہ، حائطیہ، بشریہ، معمریہ، مزادریہ، ثمامیہ، ہشامیہ، جاحظیہ، خیاطیہ اور جبابہ وغیرہ اپنے اپنے داعیوں کے نام سے منسوب تھے۔

معتزلہ کے مقابلہ میں ابوالحسن علی اشعری کی رہنمائی میں اشاعرہ صف آرا ہو گئے، معتزلہ رؤیت باری تعالیٰ سے انکار کرتے، اشاعرہ کہتے کہ آخرت میں اس کی زیارت ہوگی مگر اس کی صورت اور ہیئت بتائی نہیں جا سکتی..... امام ابوحنیفہ کے متبعین میں ابو منصور ماتریدی نے ان جھگڑوں کو یہ کہہ کر مٹانے کی کوشش کی کہ تفکر و تامل ضروری ہے، مگر عقل پر اسی وقت اعتماد کیا جا سکتا ہے جب یہ مشعل شرع سے منور ہو، ان کے ماننے والے ماتریدیہ اشاعرہ اور معتزلہ کے بین بین تھے۔

ایک گروہ سلفیہ بھی پیدا ہوا، اس کے خیال میں وہی عقائد معتبر ہیں جو کتاب و سنّت کے عین مطابق ہیں، عقل سے شرعی احکام کی تائید و توثیق تو ہو سکتی ہے، مگر عقل کی خاطر شرعی احکام ترک نہیں کئے جا سکتے۔ عقل کو نقل کے پیچھے چلنا چاہئے، اس کے پر جوش داعی امام ابن تیمیہؒ تھے...... امام ابن تیمیہؒ کے مسلک کو نجد کے محمد بن عبد الوہابؒ سے زیادہ تقویت پہنچی، جب وہ مسلمانوں میں جتنی بدعتیں رائج ہو گئی تھیں ان کے خلاف نبرد آما ہوئے تو ان کے مقلدین وہابی کہلائے۔ مصر میں حسن البناء کی قیادت میں اخوان المسلمین کی جماعت دین اور سیاست کو ایک چیز قرار دے کر اسلام کے دینی اور سیاسی احیاء کی دعوے دار ہوئی...... ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اباحیتوں کا ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو گناہ کو گناہ نہیں سمجھتا، اس عہد میں دہلی کے ایک باشندہ رکن الدین نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر نوی صدی ہجری میں سید محمد جونپوری کے معتقدین اپنے کو مہدوی کہلانے لگے۔ عہد اکبری میں بایزید روشن جالندھری نے نبوت کا دعویٰ کیا، تو اس کے ماننے والے روشنیہ کہلانے لگے۔ اکبر نے خود دین الٰہی قائم کر کے مذہب کا ایک معجون مرکب تیار کیا، فرخ سیر کے زمانہ میں میر محمد حسین رضوی مشہدی نے بھی اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا۔

اس کے معتقدین فربودی کہلانے لگے، انگریزوں کے زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کو نہ صرف مہدی ظاہر کیا، بلکہ یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی قوت ان میں لوٹ آئی ہے، ان کے معتقدین ان کو نبی ماننے لگے اور وہ احمدی یا قادیانی کہلائے۔

بریلی کے مولانا احمد رضا خان کے پیرو بریلوی کہلاتے ہیں، جن کو ان کے معترضین بدعتی کہتے ہیں، مگر بریلوی اپنے معترضین کے عقائد پر طرح طرح کے فتاوے صادر کرتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد الیاس کی مساعی جمیلہ سے ایک تبلیغی جماعت بنی جو مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے کی کوشش کرتی ہے، مگر اس کے بھی معترضین پیدا ہو گئے ہیں۔

علمائے ظاہر اور صوفیائے کرام کے اختلافات کی المیہ داستان الگ ہے، صوفیہ نے طریقت کے ذریعہ سے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی تعلیم دینی شروع کی، تو کچھ علماء نے اس کو شریعت کی روح کے منافی قرار دیا۔ جب ابن عربی نے وحدت الوجود کا فلسفیانہ نظریہ پیش کیا، تو ان پر گمراہی اور ضلالت کا الزام رکھا گیا، حضرت احمد سرہندی نے وحدت الوجود کا ازالہ وحدت الشہود سے کیا، شاہ ولی اللہ نے دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی، مگر مرزا مظہر جانجاناں جیسے اور بزرگان دین اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور اس مسئلہ پر اختلاف جاری ہے۔ پھر صوفیائے کرام کے بھی مختلف فرقے نظری اور فکری حیثیت سے ہو گئے، محاسبیہ، قصاریہ، طیفوریہ، نوریہ، سہیلیہ، حکیمیہ، فرازی اور خفیفی وغیرہ اپنے اپنے پیشواؤں کے نام سے منسوب ہوئے، ان کے سلسلے بھی علیحدہ علیحدہ ہو گئے، صرف ہندوستان میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، شطاریہ، فردوسیہ اور مجددیہ وغیرہ جیسے سلسلے ہیں۔ ان فرقہ بندیوں سے مسلمانوں میں جو انتشار پھیلا، وہ ان کے سیاسی انتشار سے کم مہلک ثابت نہیں ہوا، شیعوں اور سنیوں کے خون ریز تصادم سے برابر ملّی اور ملکی نقصانات ہوتے رہے، حسن بن صباح نے نظام الملک طوسی کو قتل کرایا، پھر اس کے مقلدوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی حملہ آوروں کا ساتھ دیا، فرقہ نصیریہ نے شام میں تاتاریوں کی حمایت کی، مصر کے فاطمی اندلس کی عرب حکومت کے مخالف رہے، اس اختلاف کی وجہ سے ہلاکو خان نے عروس البلاد بغداد کو مستعصم باللہ کے زمانہ میں خون اور لاشوں کا شہر بنا دیا، بنگال میں پلاسی اور دکن میں سرنگا پٹم کی لڑائیوں میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان شہید ہوئے، پھر بہائیوں نے ایرانی حکومت کے خلاف روسیوں سے مل کر سازش کی کہ وہاں حکومت ختم ہو، تو ان کو بہائیت کی اشاعت کا موقع ملے اب تو وہ خارج از اسلام قرار دیدیے گئے ہیں۔

ایک خارجی ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو شہید کیا، ان ہی میں سے فرقہ ازارقہ امویوں اور حضرت عبداللہ بن زبیر سے

انیس سال تک جنگ کرتا رہا، انہوں نے شمالی افریقہ میں طنجہ کے مقام پر امویوں کی مخالفت میں عربوں کا قتل عام کیا، ان کے خلاف جنگ اشراف ہوئی تو عرب کے بڑے بڑے شرفاء اور عمائد کام آئے، عبدالملک بن حمدان نے خارجیوں سے عاجز آکر ازارقہ اور قدیدیہ کے مقلدوں کا خاتمہ کرادیا۔

معاصر حکمران بھی اپنے سیاسی مصالح یا ذاتی دینی رجحانات کی وجہ سے بعض مذہبی فرقوں کے حریف اور فریق بن جاتے، عبدالملک بن مروان خارجیوں کا سخت مخالف رہا، ہشام بن عبدالملک اموی نے امام زید بن علی بن حسین کو قتل کرادیا، امام ابوحنیفہ عباسیوں کے بجائے سادات کی خلافت کے حق میں تھے۔ منصور نے عہدہ قضا نہ قبول کرنے کے بہانے سے ان کو قید خانہ بھجوا کر وہاں زہر دلوادیا، اسی کے عہد میں مدینہ کے حاکم نے جبری طلاق کے مسئلہ پر امام مالک کو ۷۰ کوڑے لگوائے، خلق قرآن کے مسئلہ پر معتصم باللہ بن ہارون نے امام احمد بن حنبل کو اٹھائیس مہینے تک جیل خانہ میں رکھا، اور برابر کوڑے لگواتا رہا، بہائی حکومت ایران سے برسرِ پیکار ہوئی تو ان کے لئے ہر قسم کی سزا اور تعذیب روا رکھی گئی، وہ ترکی سے بھی جلاوطن کئے گئے، مصری حکومت نے حسن البنا کی تحریک کو اپنے لئے خطرہ سمجھا، تو ان کو قتل کرادیا، پھر ان کی تحریک بھی ہر طرح دبادی گئی۔

ہندوستان میں فیروز شاہ نے رکن الدین کو قتل کردیا، جس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اسی عہد میں اباحیتوں کا بالکل قلع قمع کردیا گیا، سید محمد جونپوری کے مخالفین نے ان کو کہیں چین لینے نہیں دیا، اکبر نے روشنیہ فرقہ کا خاتمہ ہمیشہ کے لئے کردیا، اکبر کے دین الٰہی کے بُرے اثرات کو دور کرنے کے لئے حضرت احمد سرہندیؒ نے مجددانہ کارنامے انجام دیئے، مغلوں کے آخری عہد میں فربودی بھی ختم کردیئے گئے۔ فرقوں میں باہمی کش مکش بھی رہی، دروزی عقائد کا بانی حمزہ بن علی بن احمد آپس کے اختلاف سے قتل ہوا، نجدہ بن عامر کو ابوفدیک کے حامیوں نے ہلاک کیا، فرقہ جبریہ اور قدریہ کے حامیوں میں سے جہم بن صفوان اور غیلان دمشقی دونوں کا قتل ہوا، حنابلہ ہمیشہ اشاعرہ کے مخالف رہے، دونوں میں کشت وخوں کی نوبت پہنچ جاتی، امام غزالی نے امام ابوحنیفہ پر نہایت سخت نکتہ چینی کی، تو ان کے مخالفین ان کو زندیق اور ملحد قرار دینے سے باز نہیں آئے، ابن تیمیہ کے حاسدوں نے ان کو بار بار قید خانہ بھجوایا، آخری بار قید ہوئے تو وفات پا کر چھوٹے۔ آج بھی جہاں کہیں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہوجاتے ہیں تو چھوٹے بڑے مذہبی اختلاف پر خوں ریز تصادم بھی ہوجاتا ہے۔ (۱۶)

اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمان دوسری قوموں سے آپس میں زیادہ عداوت کرتے ہیں۔ ہند میں رہ کر ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ جب ہم نے ترکوں اور عربوں کا معاملہ جا کر دیکھا تو ہمیں یقین ہوا کہ ان میں عداوت ناقابل زوال حالت تک پہنچ چکی ہے۔

اس سے پہلے ہمیں شیعہ سنی کا اختلاف معلوم تھا۔لیکن اختلاف کے باوجود ائتلاف و الفت تھی۔ اب عداوت تمام مسلمان قوموں میں بہت حد تک پھیل چکی ہے۔(۱۷)

آج امت مسلمہ کی حالت بگاڑ یہ ہے کہ ایک ارب سے زائد عددی قوت رکھنے کے باوجود اور جغرافیائی لحاظ سے مراکش سے انڈو نیشیا تک پھیلے ہوئے مسلم بلاک ہونے کے باوجود ذلت و مسکنت ہم پر چھائی ہوئی ہے اور اسکی سب سے بڑی وجہ فرقوں اور گروہوں میں تقسیم در تقسیم کا لامتناہی سلسلہ ہے، جو ہمیں سر بلندی کی طرف جانے نہیں دیتا۔

علامہ اقبالؒ نے اسی فرقہ بندی کے حوالے سے یہ کہا ہے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں(۱۸)

محمد الغزالی دستور الوحدة الثقافية بين المسلمين میں سفری احوال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں اسلامی دنیا کے اسفار کے دوران میں نے دیکھا کہ تقریباً ایک ہزار سال سے فقہا کے اختلافات نے مسلمانوں کو مختلف اور متضاد گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور معمولی معمولی باتوں پر لوگ ایک دوسرے کی طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ کبھی تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں اور اس پر بس نہیں بلکہ شخصی معاملات اور ذاتی مفادات کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسائل کو بھی فقہی اختلافات کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی اخوت کی چٹان پگھلنے لگتی ہے، خباثت بھرے لڑائی جھگڑے پروان چڑھتے ہیں اور مسلمان آپس میں دست وگریباں رہتے ہیں۔(۱۹)

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان تمام جماعتوں کو آپس میں ملکر اور ایک دوسرے کو اپنا دایاں بازو سمجھتے ہوئے ان قوتوں کو، صلاحیتوں کو، علمی قابلیتوں کو امت کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کیا جاتا مگر افسوس اسکی اہمیت کا ادراک نہ کیا گیا!!

اسی وحدت کے ختم ہونے اور تفرقہ بازی نے امت مسلمہ کو زوال کی طرف دھکیلا ہے۔ زوال کا اہم نکتہ یہی ہے کہ رب

ایک، قرآن ایک، رسول ﷺ ایک اور کعبہ ایک ہونے کے باوجود تفرقہ میں پڑنے سے، آپس میں **رحماء بینھم** کے بجائے آپس ہی میں گتھم گتھا ہیں اور **اشداء علی الکفار** کے بجائے **تشبہ بالکفار** پر مطمئن ہیں۔ ایک حدیث ترغیب و ترہیب بحوالہ بزار جوامت کے زبوں حالی کی نشاندہی کرتی ہے۔

و عن الزبیرؓ قال قال رسول اللہ ﷺ دب الیکم داءُ الامم قبلکم الحسد و البغضآءُ ھی الحالقة لا اقول تحلق اشعر و لکن تحلق الدین (۲۰)

ترجمہ: "حضرت زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" پہلی امتوں کی بیماریاں تم میں سرایت کر گئی ہیں (یعنی اے امت محمد تم میں پچھلی امتوں کی بیماریاں پیدا ہو گئیں ہیں) اور وہ بیماریاں حسد اور بغض ہیں جو مونڈنے والی ہیں میری مراد اس سے بالوں کو مونڈنا نہیں ہے بلکہ دین کو مونڈنا ہے (یعنی یہ بیماریاں دین کی جڑ کاٹ دیتی ہیں)۔"

فصل سوم

عیش کوشی و بے جا اسراف

اقوام کا ہر معاملہ اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے کار اقتدار کو بھی عبادت سمجھ کر بطور ذمہ داری قبول کیا تھا جو حقیقت میں خلافت کہلاتا ہے۔ اور یہ خلافت صاحب اقتدار کو پابند مالک رکھتے ہوئے مملکت کے امور سرانجام دینے پر قائم رکھتی ہے۔ مگر جب خلافت، ملوکیت سے بدل دی جائے تو لازمی بات ہے کہ ملوکیت کے اثرات ظہور پذیر ہوں گے جو اس کا خاصہ ہے۔

پھر حکومت عوام کے بجائے ذاتی اور خاندانی ملکیت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک وملت کے تمام ذرائع و وسائل مفاد عامہ پر خرچ ہونے کے بجائے بادشاہت کی بقاء اور شان وشوکت پر صرف کیے جانے لگتے ہیں۔ قانون کا نفاذ صرف اور صرف دولت کو خاندان شاہی میں قائم رکھنے کے لئے ترتیب دیے جانے لگتے ہیں، شریعت و مذہب میں حیلوں اور تاویلوں کے نئے نئے دروازے بادشاہ کی مصلحتوں کے مطابق کھلنے لگتے ہیں۔ بادشاہ اپنی قوم کا خادم ہونے کے بجائے طاقت کے نشے میں عوام کا مالک و آقا بن جاتا ہے اور لوگ اس کے غلام کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ آزادی ءرائے بالکل سلب ہو جاتی ہے حق گوئی و بے باکی جرم بن جاتا ہے اور اس کو روکنے کے لیے بے رحمانہ سزا نافذ کیے جاتے ہیں۔ شان وشوکت اور جاہ وجلال کو ظاہر کرنے کے لیے بادشاہ اس زمین پر خدا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ شاہی رکھ رکھاؤ، عمارات، جلوس وتفریحات میں بیت المال کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں افلاس پھیلتی جاتی ہے اور پھر یہی فتنہ وفساد کا سبب بن کر حکومت کے زوال کا باعث بنتا ہے۔

بنوامیہ کے دور میں جنم لینے والی ملوکیت نے اپنے پنجے مکمل طور پر عباسی دور میں گاڑے اور امت مسلمہ ان نتائج و عواقب میں پھنس گئی جو ملوکیت کا خاصہ ہے۔

حضورﷺ اور خلفائے راشدین کی سادگی مثالی نمونہ ہے۔ اپنے ادوار میں ان ہستیوں نے ضرورت کے مطابق وظیفہ لیا اور ہر قسم کی تصنع و بناوٹ سے پاک رہتے ہوئے پیوند لگے کپڑے پہننے میں بھی عار نہیں سمجھا۔

براویت سلیمان الخرومی تاریخ الخلفاء میں ہے کہ

امیر معاویہؓ نے صرف تخت اور مقصورہ کی تعمیر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اور بھی کئی شاہانہ رسومات کی بنیاد ڈالی علامہ جلال الدین سیوطی کی روایت کے مطابق سب سے پہلے آپ کو اس طرح پر سلام کیا گیا جو مسلمانوں کے سلام سے مختلف تھا۔ السلام علیکم یا امیر المومنین ورحمتہ اللہ وبرکاتہ الصلوۃ برحمتک اللہ۔ سب سے پہلے آپ ہی نے بیت المال کی رقومات کو اپنی ذاتی اغراض کے ماتحت بے دریغ خرچ کرنا شروع کیا۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک مرتبہ ابوحبیب یعنی عبداللہ بن زبیرؓ کو صرف تین اشعار کے بدلے میں تین لاکھ درہم دے ڈالے۔ غرضیکہ ملوکیت کی یہ بنیاد جو امیر معاویہؓ کے زمانے میں پڑی آگے چل کر ایک ایسی عمارت بن گئی جس نے اسلام کی پرانی اور سیدھی سادی عمارت کو بالکل ڈھانپ لیا خود ان کی پہلی ہی نسل میں بدعات واختراعات کی اس رو نے سیلاب عظیم کی وہ شکل اختیار کر لی جس نے اسلام کی تمام روایات وتعلیمات کو بہا ڈالا۔

آپ کے عہد میں تو حاجبوں کے تقرر کی ابتداء ہی ہوئی تھی مگر مسلمان عوام آسانی سے آپ سے مل لیتے تھے مگر یزید کے زمانے میں خلیفہ کا محل باقاعدہ "شاہی محل" بن گیا..... بنوامیہ کے ابتدائی دور تک خلیفہ امامت نماز کے فرائض خود ادا کرتا تھا اور یہ ایک مرتبہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد خلفاء نے منصب امامت کو چھوڑ کر اپنی طرف سے نائب مقرر کرنے شروع کیے۔ کبھی کبھی خصوصاً نماز عیدین و جمعہ وغیرہ میں آ کر امامت کر لیتے تھے۔ صرف امامت ہی کو ترک نہیں کیا گیا۔ بلکہ کچھ اور عرصے بعد نماز جماعت کے اوقات میں پابندی ترک کر دی گئی تھی۔ مساجد میں نماز کا انتظام ابتر ہو گیا۔ بالخصوص حجاج بن یوسف کے دور میں نمازیں برباد ہوتی جا رہی تھیں۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد آیا تو آپ نے خاص طور سے عدی بن ارطاط کو ہدایت کی کہ: "حجاج کی تقلید نہ کرو کیونکہ وہ نماز بے وقت پڑھتا تھا..... علامہ سیوطی نے خلفاء کی چند بدعتوں کا ذکر کیا ہے جو رفتہ رفتہ نظام حکومت کا جزو بن گئیں تھیں آپ نے لکھا ہے:

"جس نے سب سے پہلے اپنا نام سکے پر درج کرایا، عبدالمالک بن مروان ہے۔ جس شخص نے سب سے پہلے اپنا نام لے کر پکارنے کو منع کیا، ولید بن عبدالملک ہے۔ جس خلیفہ کو سب سے پہلے لقب کے ساتھ پکارا اور لکھا گیا، امین ہے۔ جس نے سب سے اول گھوڑوں کو سونے کو زیور پہنایا وہ معتز ہے"۔ (۲۱)

اموی خاندان کا فرماں روا ولید ثانی بن یزید عبدالملک اپنی رندی اور سرمستی میں ایسا مبتلا ہوا کہ اس کے مخالفین نے اس پر یہ الزام رکھا کہ اس نے خانہ کعبہ کی چھت پر بھی شراب پینے کا ارادہ کیا، عباسی فرماں رواؤں مہدی اور ہادی نے اپنی رنگین مزاجی سے اپنے محل کو حسین عورتوں کا جمالستان بنا رکھا تھا۔

محمد امین بن ہارون رشید اپنے باپ کی شاندار روایات کو نظر انداز کر کے عیش پرستی کا دلدادہ بنا، تو طرح طرح کی نزہت گاہیں بنوائیں، جہاں حسین عورتوں اور مسخروں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہتا، مامون بن ہارون رشید اپنی تمام خوبیوں کے باوجود پری پیکر نازنینوں کے جھرمٹ میں رہتا، نبیذ پیتا، اس کے دربار میں بڑے بڑے صاحب فن مغنی جمع تھے، رومی کنیزیں رقص و سرود سے اس کی محفل گرم کرتی تھیں، موثق جب نبیذ پینے کے لئے بیٹھتا تو پہلے ہاتھ دھونے کے لئے تسلہ اور سونے کی کشتی میں بلور کے جام و مینا پیش کئے جاتے، بابر اور جہانگیر تو اپنی شراب نوشی کی محفلوں کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں۔(۲۲) شریعتِ الٰہی میں تو واضح طور پر اسراف سے منع کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ وہ شیطان کے بھائی ہیں۔ مگر اپنی بادشاہت کے نشے میں وہ تمام احکام ربانی سے منہ موڑ چکے تھے۔

یہ سلاطین سلطنت کی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنی ذاتی ضروریات پر صرف کر ڈالتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک کے حج کے سفر کے متعلق "عقد الفرید" ص ۳۶۶ کی یہ خبر کس قدر عبرتناک ہے:

"حج کے ارادے سے نکلا اور چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے بدن کے کپڑے تھے"۔

غور فرمائیے کہ حضرت علیؓ کے بعد بنو امیہ کی صرف پانچویں پشت میں انقلاب کہاں سے کہاں پہنچا ہے اور یہ وہ دور ہے جبکہ ملوکیت اپنے عہد طفولیت ہی میں تھی بنو امیہ کے دور کو مورخین نے بہت سادہ زمانہ لکھا ہے اسی خاندان کی دوسری مثال سنیئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے غیلان دمشقی کو بنو امیہ کے شاہی توشہ خانہ کے نیلام کی خدمت سپرد کی۔ آپ نے خلیفہ ہوتے ہی گذشتہ خلفاء کی تمام غصب کی ہوئی جاگیریں بیت المال میں جمع کر دی تھیں اسی سلسلے میں یہ نیلام بھی کیا گیا تھا۔ وہ برسرِ عام نیلام کرتا تھا اور پکار کر کہتا جاتا تھا "یہ وہ مال واسباب ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کیا گیا تھا"۔ اس توشے خانے کے سامان عیش و طرب کا اندازہ اس سے لگایئے کہ صرف اونی جرابوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ غیلان نے کہا کہ صاحبو! کچھ حد ہے اس ظلم کی کہ عوام فاقے کرتے تھے۔ اور ہمارے فرمانروا تیس تیس ہزار جرابیں اپنے توشہ خانوں میں رکھتے تھے.... علامہ سیوطی نے محمد بن حفص الانماطی کی روایت بیان کی ہے کہ:

عید کے دن میں نے مامون کے ساتھ کھانا کھایا دستر خوان پر تین سو قسم کے کھانوں سے زیادہ کھانے چنے ہوئے تھے۔

ابن فہیم کی روایت کے مطابق الواثق باللہ کا دستر خوان سونے کا بنا ہوا تھا جس کے چار ٹکڑے تھے ہر ایک ٹکڑا بیس آدمی اٹھایا کرتے، اور اس میں کٹورے گلاس اور آبخورے تمام سونے ہی کے تھے۔ جس سونے کے دستر خوان کو اسی آدمی پکڑ کر اٹھاتے ہوں اس میں کتنا سونا ہوگا۔ اس کا اندازہ با آسانی ہوسکتا ہے۔

مقتدر باللہ نے، جس کے پاس رومی، صقالبی اور حبشی غلاموں کے علاوہ گیارہ ہزار خصی غلام رہتے تھے، ۳۰۲ھ اپنے پانچ لڑکوں کے ختنوں میں چھ لاکھ دینار خرچ کر ڈالے، ذرا ہارون الرشید اور اس کی چہیتی بیوی زبیدہ خاتون کا تصور کیجئے۔ مسعودی لکھتا ہے:

"عنبر کی شمعیں پہلے پہل اسی (زبیدہ) کی شبستان عیش میں جلائی گئیں۔ جواہر کی مرصع جوتیاں اسی کی ایجاد ہیں چاندی، آبنوس اور صندل کے قبے اول اسی نے تیار کرائے اور ان کو دیبا و سمور سے آراستہ کیا۔ کپڑوں کی ساخت میں یہ ترقی ہوئی کہ زبیدہ کے استعمال کے لیے ایک ایک تھان پچاس پچاس ہزار اشرفی کا تیار ہوا"....... زمانہ جتنا گزرتا گیا ملوکیت کے پرانے طریقوں میں نئی نئی ایجادیں ہونے لگیں۔ پھر جب خلیفہ کی ملوکیت کے ساتھ سلطان کی ملوکیت کا مزید اضافہ ہو گیا تو مسلمانوں کی گردنوں میں دو بادشاہتوں کا بار پڑ گیا۔ ایک ہی مملکت میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اسراف بے جا خواہشات نفسانی کا پہلے ایک ہی دروازہ تھا اب دو راہیں کھل گئیں۔ سلطان اور خلیفہ دونوں ایک دوسرے سے فضول خرچیوں میں بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

اس طرح خلیفہ مقتدی بامر اللہ نے جب سلطان ملک شاہ کی دختر سے نکاح کیا اور صفر ۴۸۰ھ میں رخصت ہوئی تو جس شان سے رخصتی کا جلوس نکالا گیا اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ دو طاقتوں کا بار عوام پر کس قدر پڑتا ہو گا۔ جلوس کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔

۱۳۰ اونٹوں پر جن کی جھولیں دیبائے رومی کی تھیں سامان طلاء نقرہ تھا۔ ۷۴ خچروں پر جن کی گردنوں میں چاندی سونے کی گھنٹیاں لٹکتی تھیں بیش قیمت اور نفیس اسباب تھا۔ اور منجملہ ان کے چھ پر بارہ صندوق قیمتی جواہرات اور زیورات سے بھرے ہوئے تھے اور اس قطار کے آگے ۳۳ سوار تھے، اور تین عماری تھیں جو لاگت اور صنعت کے لحاظ سے لاجواب تھیں اور اس جلوس کے پیچھے دلہن کا محفہ تھا۔ ان کے علاوہ تین سو کنیزوں کے ڈولے تھے۔ اور خواجہ سراؤں کی تعداد بیشمار تھی اور رسومات بیحد تھیں۔

خلیفہ نیس کھانے میں کس قدر صرف کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف شکر چالیس ہزار من صرف ہوئی تھی۔ (۲۳)

مامون الرشید کی شادی ہوئی تو اس کے لئے سنہرے کام کا فرش بچھایا گیا، جیسے ہی اس نے اس پر قدم رکھا، اس کے اوپر بڑے بڑے موتی نچھاور کئے گئے، شب عروسی کی روشنی میں چالیس من موم بتیاں سونے کے لگن میں روشن کی گئی تھیں، مؤرخین اس شادی کے اخراجات کا اندازہ پانچ کروڑ کرتے ہیں۔

مقتدر کی ماں نے اپنے صغیر السن پوتے کی ایک تقریب میں چاندی کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد کیا، جس کے مکانات اور کھیت وغیرہ بھی چاندی ہی کے تھے، شاہ جہاں نے دارا شکوہ کی شادی میں ۹۳ لاکھ روپے خرچ کیئے تھے جو آج کل کے حساب سے ایک ارب کے برابر سمجھا جاسکتا ہے۔ پھر محبوباؤں پر بھی بے دریغ روپے خرچ کیئے جاتے، اندلس کے فرماں روا عبدالرحمٰن ثانی کی محبوبہ طروب ایک باراس سے خفا ہوگئی، تو اس نے اپنے محل کا دروازہ بند کر کے اس سے ملنے سے انکار کیا، دروازہ توڑنے کے بجائے عبدالرحمٰن ثانی نے اس کے نیچے سے اوپر تک دینار کی تھیلیاں چن دیں جن میں تقریباً تیس ہزار دینار تھے۔ طروب اس ناز برداری سے خوش ہوکر اس کے قدموں سے آ لگی، ایک بار اس نے اس کو ایک لاکھ دینار کے زیورات دیئے، اس کے وزراء نے اس پر اعتراض کیا، تو اس نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کیا، کہ جس کے جسم پر ان سے زینت ہوگی وہ زیادہ بیش قیمت گوہر ہے، کیا روئے زمین پر اس کے حسن و جمال کے دیدار سے بھی زیادہ کسی چیز میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی، عبدالرحمٰن ثانی نے اپنے ایک مغنی زریاب کو چالیس ہزار دینار سالانہ مقرر کر کے ایک عالیشان محل میں ٹھہرایا۔ (۲۴)

ان مسرفانہ اور عیاشانہ تکلفات کا بار بیت المال پر ضرورت سے زیادہ پڑتا رہا، بیت المال کا سرمایہ جو محبوباؤں کی خوشنودی، رنگ رلیوں کی سرمستی، خورد و نوش کی فضول خرچی، محلول اور مقبروں کی تعمیر کی رعنائی میں خرچ ہوتا رہا، وہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی پر قابو پانے کی کوشش میں صرف ہوتا، تو آج مسلمان کچھ اور ہی ہوتے، بعض فرماں روا تو بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے رہے، جس سے ان کی حکومت اور فرماں روائی شخصی سمجھی جاتی رہی، ان کے سامنے ان کے وزراء اسطرح جھکے رہتے، کہ وہ ان کے خدا ہوں، قادسیہ کی جنگ کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے سفیر حضرت مغیرہؓ نے ساسانی حکمراں یزدگرد کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "تم میں بعض لوگ بعض لوگوں کے خدا ہیں، اب تمہاری سلطنت قائم نہیں رہ سکتی" جب مسلمانوں میں بعض لوگ بعض لوگوں کے خدا ہو گئے تو ان کی سلطنت کیسے باقی رہتی۔ (۲۵)

غیر اسلامی تہذیب کا بندھن:

مسلمان کا ہر کام شریعت کے تابع ہوتا ہے چاہے وہ خوشی کا مرحلہ ہو یا غم کا مگر جب مسلمان بادشاہوں نے اپنی زندگیوں کو ملوکیت کے طرز پر گزارنا شروع کیا۔ ان کی نظر اسوۂ رسول ﷺ سے ہٹ کر عجم و روم کے شاہ و سلاطین پر جم گئی تو اس عیش و عشرت کی راہ نے ان کو حسن پرستی کا دلدادہ بنا دیا اور انہوں نے مسلم و غیر مسلم کا فرق کیے بغیر اپنے حرم میں قیصر و کسریٰ کے خاندان کی شہزادیوں کو داخل کرنے لگے اور اس طرح ملت اسلامیہ کے دشمنوں نے کئی مسلم بادشاہوں کو اپنی شہزادیوں کے ذریعے ذہنی غلام بنالیا۔

ہندوستان کے مغل فرماں روا بے تکلف راجپوت شہزادیوں سے شادی کر کے ان کو اپنے حرم میں داخل کرتے رہے، جس سے ان کی خانگی زندگی میں پیچیدگی پیدا ہوتی رہی، یہ موضوع اب تک زیر بحث ہے کہ وہ مسلمان ہو کر حرم میں داخل ہوئیں یا ہندو بن کر رفاقت کرتی رہیں، وہ حرم میں داخل ہوئیں تو اپنا تمدن ساتھ لائیں جس سے محل کی تمدنی زندگی بھی بڑی حد تک بدلتی رہی، پھر اس کے آخری فرمانروا اس نیچی سطح تک اتر آئے تھے کہ طوائف اور رقاصہ کو اپنے حرم میں داخل کر لیتے، مثلاً جہاندار شاہ کی ایک طوائف لال کنور تھی، جس کی بدمستی اور شراب نوشی سے جہاندار شاہ بہت بدنام رہا، محمد شاہ کی ایک بیوی کا نام اودھم بائی تھا، جو ایک نومسلم رقاصہ تھی، اسی کا لڑکا احمد شاہ محمد شاہ کا جانشین ہوا، تو احمد شاہ کی جگہ وہی حکومت کرنے لگی، اس کا بھائی مان خاں ادنی درجہ کا نچنیا اور گویا تھا، لیکن اس کو چھ ہزاری منصب اور معتضد الدولہ بہادر کا خطاب دیا گیا۔ امراء اودھم بائی کی ڈیوڑھی پر جاتے اور وہ خواجہ سراؤں کے ذریعہ ان سے باتیں کر کے احکام صادر کرتی، اسکا سب سے معتمد علیہ ایک خواجہ سرا جاوید خان تھا، جس کو ہفت ہزاری کا منصب اور نواب بہادر کا خطاب دیا گیا، اس کو بھی مراتب، نوبت اور مرصع پالکی استعمال کرنے کی اجازت تھی، بعض عثمانی ترک بھی حسن و جمال کے پرستار ہو کر بے تکلف عیسائی شہزادیوں کو اپنے حرم میں داخل کرتے رہے جس کے مضرت رساں اثرات ان کی فرماں روائی پر مرتب ہوتے رہے، بازنطینی حکومت کے فرمانروا ارمانوس نے اپنی دو لڑکیوں کی شادی سلجوقی سلطان الپ ارسلان سے کی، اس طرح الکیولیس اپنی لڑکی کو ملک شاہ کی زوجیت میں دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا مگر شادی سے پہلے اسکی وفات ہو گئی، بازنطینی حکومت کا قیصر کنیٹا کوزین اپنی بیٹی تھیوڈرا کو دولت عثمانیہ کے ایک فرمانروا اورخان کے حبالہ عقد میں دے دیا تھا...... اسی طرح بایزید یلدرم سے سرویا کے بادشاہ نے اپنی بہن شہزادی ڈیسپنا کی شادی کر دی تھی۔ صلیبی جنگ کے زمانے میں انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ اول نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یورپ کی شہزادیاں مسلمانوں کے حرم میں بلا تکلف دے دی جائیں، تاکہ وہ اپنے حسن سے اپنے مسلمان شوہروں کو اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کریں۔ رچرڈ شیر دل تو اپنی بہن کی شادی صلاح الدین ایوبی کے بھائی عادل سے کرنے کو تیار ہو گیا تھا گو یہ رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔ بعض مسلمان فرماں رواؤں کے حرم میں غیر کفو کی عورتیں محض اپنے حسن و جمال کی وجہ سے داخل ہوئیں، تو ان سے نسلی خرابیاں بھی پیدا ہو کر ان فرماں رواؤں کی اولادوں سے ان کی نسلی خوبیاں بھی زائل ہوتی رہیں۔ (۲۶)

سعید احمد اکبر آبادی صاحب کے مطابق اورخان نے کنیٹا کوزین کی بیٹی تھیوڈرا سے شادی کی اور اسے مذہب عیسوی پر ہی قائم رہ کر زندگی بسر کرنے کی اجازت دی۔ اورخان کے بعد اس کے جانشین سلطان مراد اول نے بلغاریہ کے بادشاہ سیسمان کی لڑکی سے شادی کی۔

اسی طرح سلیمان اعظم کی بیگم روسی روکسلین تھی اور اسی نے سازش کر کے سلیمان کا ایک قابل لڑکا مصطفیٰ جو کسی اور بیوی سے تھا سلیمان کے ہاتھوں قتل کروا دیا تا کہ اس کے بطن سے جو لڑکا سلیم پیدا ہوا ہے وہ ولی عہد قرار پائے۔ یہ تو وہ شہزادیاں تھیں جو محل سلطانی میں بیگم بن کر رہتی تھیں اور جو سلطنت کے معاملات میں دخل دینا اپنا حق سمجھتی تھیں، ان کے علاوہ جو غیر مسلم باندیاں اور کنیزیں محل میں عمل دخل رکھتی تھیں ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے چنانچہ استاذ کرد علی دولتِ عثمانیہ کے اسباب زوال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولعله يعد من الاسباب الجوهريه فى الانحطاط تغير الدم السلطانى فى أل عثمان تغير الكبير الكثرة ما اقنو ا من السرارى والجورى النصر انياند

ترجمہ: "آلِ عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری سبب یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور کنیزوں کی کثرت کی وجہ سے سلطانی خون بہت زیادہ بدل گیا تھا۔"

چنانچہ سلیم ثانی آدھا روسی تھا، کیونکہ اس کی ماں روس کی باشندہ تھی، محمد ثالث آدھا اطالوی تھا اس لیے کہ اس کی والدہ شہر وینس کی رہنے والی تھی، اس طرح عثمان ثانی مراد رابع اور ابراہیم اول نصف رومی تھے اس سب کی مائیں رومی خواتین تھیں۔ غیر مسلم خواتین کی محل میں کثرت کا نتیجہ وہی ہوا جو بنو عباس کے عہد میں رونما ہو چکا تھا یعنی جب تک سلاطین جری، بہادر اور بیدار مغز پیدا ہوتے رہے، ان غیر مسلم خواتین کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوئے۔ لیکن جب سے سلیم ثانی، مراد ثالث اور مصطفیٰ اول جیسے عشرت پسند اور عیش کوش سلاطین، تخت حکومت پر قابض ہونے لگے تو عنانِ سلطنت بھی انھیں جواری وسراری کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی۔ (۲۷)

ابھی بھی صورتحال یہ ہے کہ مسلم دنیا میں مغرب کی نقالی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ مغربی خیالات اور تصوارت کو اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس طرح وہ بتدریج ماضی سے اپنا رشتہ کاٹتی چلی جا رہی ہے، نہ صرف اپنی ثقافتی جڑیں بلکہ روحانی جڑیں بھی کاٹ رہی ہے۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جو بہت توانا تھا مگر اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے درخت آہستہ آہستہ گرتا چلا جا رہا ہے کیونکہ وہ اپنی غذا سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے پتے جھڑ چکے ہیں، اس کی شاخیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب صرف تنا رہ گیا ہے جس کے گرنے کا خطرہ ہے۔ عالم اسلام اس وقت روبہ زوال ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عملی مذہب کو محض ظاہری رسوم ورواج کا مذہب بنا دیا گیا ہے اور اس کی روح نکال کر اسے بے جان کر دیا گیا ہے۔ (۲۸)

تعمیراتی مسابقت:

تعلیمات قرآنی کے مطابق دنیا کی زندگی متاع غرور سمجھنا اور فرمان نبویؐ کے مطابق اس دنیا میں زندگی کا نک غریب او عابری سبیل کی طرح بسر کرنے کا حکم تھا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے امت کو نعمت دولت سے نوازا تو امت کے حکمرانوں نے اس نعمت دولت کا استعمال استحکام امت کے بجائے اہتمام قصر و تعمیرات میں کیا۔

نئی عمارتوں کی تعمیر کا آغاز خلافت راشدہ میں ہی ہو گیا تھا۔ مگر وہ عمارتیں صحابہ کرام اپنی معمولی رہائش کے لئے بناتے تھے۔ اس کے بعد مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ کچھ اور بہتر عمارتیں بنائی گئیں۔ چنانچہ حضرت زبیر نے بصرہ، مصر، کوفہ اور اسکندریہ میں اچھے مکانات بنوائے حضرت طلحہ نے بھی کوفہ اور مدینہ میں اپنے لئے ایک ایک مکان بنوایا۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے اپنا گھر سنگ سرخ سے بہت عمدہ بنوایا تھا اور اس میں معقول صحن اور جا بجا عمارت میں جھروکے بھی رکھے تھے حضرت مقداد نے مدینہ میں ایک عالی شان عمارت بنوائی تھی۔ مگر یہ سب عمارتیں ضروریات رہائش کے مطابق تھیں.... بنوامیہ ہی کے دور میں قصر خلافت کی تعمیر میں لاکھوں دینار صرف کئے گئے تاریخ اسلام مصنفہ امیر علی کے مندرجہ اقتباس سے قصر خلافت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہشام خلیفہ بنوامیہ کا محل دمشق میں سنگ مرمر کا تھا جس میں سنہرا اور روپہلا کام کیا ہوا تھا۔ فرش اور دیواریں گویا سونے کا ٹکڑا تھیں۔ چلتے ہوئے فواروں میں سے خوشبودار عرقیات کا جاری ہو کر ہوا کو معطر و سرد کرنا عجب سرور پیدا کرتا تھا۔ باغوں میں کمیاب و نادر سائے دار درختوں کی افراط اور درختوں پر بیشمار خوبصورت پرندوں کا چہچہانا، یہ لطف عالم دنیا کو بہت کم نصیب ہوتا ہے، دالانوں کے پردے اور ان کے سفید ہیرے موتیوں سے جڑاؤ عجب بہار دیتے تھے۔ زرق برق لباس پہنے ہوئے غلام ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر آتے جاتے تھے جس کمرے میں ہشام ملاقات کرتا تھا اس کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ ہر ایک پتھر کی سل کے درمیان سونے کی دھار تھی، غالیچہ جس پر وہ سرخ لباس پہنے اور مشک و عنبر لگائے بیٹھا کرتا تھا سرخ رنگ کا تھا اور اس میں سونے کا کام باریکی سے کیا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید و مامون الرشید کے زمانے میں عجائب روزگار عمارات بنوائی گئیں۔ ہارون الرشید کا قصر خلافت اس وقت دنیا میں آپ اپنی تنہا مثال تھا۔ خلیفہ منصور نے بغداد شہر کی شہر پناہ ایوان خلافت، مسجد جامع، قصر الذہب، قصر الخلد اور قبہ الخضراء اور دوسری بہترین عمارتوں میں دو کروڑ درہم صرف کئے تھے۔ مگر ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی نے صرف ایک محل کی تعمیر میں جو اس نے اپنے لئے بنوایا تھا دو کروڑ درہم صرف کر ڈالے۔

ان سب عمارتوں پر المقتدر باللہ کی بنائی ہوئی عمارت دار الشجر ہ کو جو اہمیت تاریخ قیصریت میں حاصل ہے اسکی مثال آج تک نہیں مل سکی۔ اس کا مختصر خاکہ علامہ شبلی نے المامون میں ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

صحن کے ایک وسیع حوض میں سونے کا ایک درخت تھا جس میں سونے چاندی کے اٹھارہ گدے تھے اور ہر گدے میں بہت سی شاخیں تھیں، ہر شاخ میں بے بہا مختلف رنگوں کے جواہرات اس خوبی سے مرصع کئے گئے تھے کہ قدرتی پھولوں اور پھلوں کا دھوکہ ہوتا تھا۔ نازک ٹہنیوں اور شاخوں پر رنگ برنگ اور مختلف اقسام کے طلائی پرند تھے اور اس ترکیب سے بنائے تھے کہ ہوا چلنے کے وقت سب کے سب اپنے ذاتی نغمات سے خوش الحانی کرتے سنائی دیتے تھے، حوض کے دونوں جانب پندرہ مصنوعی سوار تھے جو نہایت قیمتی دیبا و حریر کی وردیاں پہنے مرصع زریں تلواریں لگائے اس طرح حرکت کرتے نظر آتے تھے کہ گویا ہر سوار اپنے مقابل کے سوار پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔

آخری خلیفہ معتصم کا محل موسوم "بہ قصر الشجر ہ" اس سے بھی زیادہ شاندار تھا اس میں ہیرے، جواہرات، یاقوت اور موتیوں سے آراستہ درخت لگائے گئے تھے جن کو کئی چھکڑوں میں بھر کر ہلاکو خان اپنے ساتھ لے گیا۔

خلفاء بنو عباس کے رسوم دربار و جلوس اور ان کے محلات کی شان و شوکت پر نظر ڈالنے کے بعد داؤد بن علی کے اس خطبے کے مندرجہ ذیل الفاظ کو پڑھئے جو بنو عباس کی بیعت خلافت کے وقت کوفہ کی مسجد میں دیا گیا تھا۔ اس خطبے میں گویا اس اصول حکومت کا اعلان کیا گیا تھا جس پر بنو عباس کی خلافت کی بنا قائم کی جارہی تھی۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

اے لوگوں۔ ہم اس لیے حکومت کرنے نہیں اٹھے کہ اپنی دولت کو زیادہ کریں، اپنی جائداد بڑھائیں، نہریں کھودیں اور عالی شان قصر تعمیر کریں..... بنو امیہ نے جو طرز عمل تمھارے ساتھ روا رکھا جس طرح انھوں نے تم کو کھلونا سمجھ کر تم سے بازی گری کی تم کو ذلیل کیا تمھاری آمدنی، صدقات اور مال غنیمت پر خود قبضہ کر لیا اس کی وجہ سے ہم سخت پیچ و تاب کھاتے رہے اور اب ہم اللہ اور اس کے رسول اور عباس کے واسطے اپنے اوپر یہ ذمہ لیتے ہیں کہ اس معاملے میں ہم ہر خاص و عام کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق عمل کریں گے...... اس اصول سیاست پر بنو عباس نے کہاں تک عمل کیا اس پر یہاں ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بنو عباس کی طرح بنو فاطمی بھی اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ حق دار سمجھتے تھے لیکن جب مصر میں ان کو کئی صدیوں تک خلافت کا موقع ملا تو انھوں نے استبداد و آمریت کے ساتھ دنیاوی سطوت و شوکت میں بنو امیہ اور بنو عباس کی نہ صرف تقلید کی بلکہ ان سب سے آگے بڑھ گئے۔

ان ہاشمی خلفاء کا جو محل قاہرہ میں دریائے نیل کی جانب بنا ہوا تھا اس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس میں سولہ اور بیس ہزار کے درمیان لوگ آباد تھے اور اس کے میدان میں دس ہزار سپاہی قواعد کر سکتے تھے۔

اس محل میں کمروں کی تعداد چار ہزار کے قریب تھی۔ ان سب کے دروازے ایک عالی شان کمرے کی جانب تھے اس بڑے کمرے کے ستون سونے اور چاندی کے تھے، سقف پر جواہرات کی مینا کاری تھی۔ یہ کمرہ خلفاء کے دربار کے لئے مخصوص تھا تخت خلافت میں اس قدر جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ نگاہ نہ ٹکتی تھی۔

اسپین میں خلیفہ عبدالرحمٰن نے اپنی عیسائی بیوی زہرہ کے لئے جو قصر قرطبہ کے قریب بنوایا تھا اس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملتی ہے۔ یہ قصر بجائے خود ایک شہر تھا اسی لئے اس کو مدینۃ الزہرا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے احاطے کی دیواروں میں پندرہ ہزار بلند دروازے تھے۔ (۲۹)

محلات کی تعمیر میں اس اسراف کا مظاہرہ ہوتا، صرف بغداد میں ۲۳ محل تھے۔ اس کے قصر فردوس میں سونے کے دس ہزار جوشن، خود اور دوسرے اسلحے آویزاں تھے۔ مقتدر نے دجلہ کے کنارے قصر التاج بنایا تھا، تو اس کے مرصع تخت کے دائیں بائیں جواہرات کے اٹھارہ ہزار ہار کی جوت سے رات کو دن کا عالم نظر آتا تھا۔ اسکی تقلید دوسرے فرماں روا بھی کرتے، اندلس کے فرماں رواؤں نے قرطبہ کو بغداد ثانی بنا دیا تھا، اس میں عالیشان محلات، حمام، حوض اور سیر گاہوں کے فواروں کی بڑی فراوانی تھی، سلطان محمد تغلق کے محل کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ جس کی چمک دمک سے کوئی شخص محل کی طرف نظر جما کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ شاہ جہاں نے آگرہ اور دہلی کے محلات کو بہشت بریں بنا رکھا تھا۔

ان تمدنی تکلفات سے تہذیبی لوازم کا معیار تو ضرور بلند ہوا مگر ان سے فاسقانہ اور عیاشانہ رنگ بھی پیدا ہوتا گیا۔ جس سے معاشرے میں طرح طرح کی خرابیاں جڑ پکڑتی گئیں۔ اگر یہ فرماں روا قصر فردوس، قصر التاج، الحمراء اور لال قلعہ کے بجائے مسلمانوں کے کردار اور سیرت کے ایسے ہی محلات بنانے کی کوشش کرتے تو ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی، مسلمان ان تمدنی تکلفات میں الجھ کر اپنی ان تمام خوبیوں کو بھول گئے جس کی وجہ سے وہ دنیا پر چھا گئے تھے۔ قوموں کی جاندار زندگی کا انحصار ان کی تمدنی قوت مدرکہ سے زیادہ ان کی قوت ارادی اور اولوالعزمی پر ہوتا ہے، تمدنی ادراک جب اعتدال سے بڑھ جاتا ہے، تو یہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہوتا ہے۔ (۳۰)

مسلمان بادشاہوں نے بھی مسلمانوں کی ضرورت کی طرف توجہ نہیں دی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں اقتدار کی جنگ اور آپس کی خونریزی سے فرصت نہ تھی۔

اگر وہ ذرا بھی توجہ دیتے، کوئی بادشاہ اپنی بنوائی ہوئی عمارتوں میں سے صرف ایک عمارت پر صرف ہونے والی رقم اگر علمی کاموں کے لئے مختص کر دیتا تو مسلمان حکماء کی تصنیف کی ہوئی تمام کتابیں عربی سے فارسی زبان میں (جو برصغیر کی علمی زبان تھی) منتقل ہو سکتی تھیں۔(۳۱)

مسلم سلاطین کے محلات و تعمیرات آج بھی عجائبات روزگار میں شمار کئے جاتے ہیں، بلاشبہ دنیا کی ہر زندہ قوم اپنی نشانیاں اسی طرح ماضی کے صفحات پر ثبت کر جاتی ہیں جن سے ان کی شان و عظمت کا ادراک ہوتا ہے مگر بحیثیت مسلمان، زندہ و فاتح قوم کی حیثیت سے پہچان سب سے الگ رہی ہے اور وہ پہچان توحید و اصول تھے جن کی بناء پر مسلم شناخت ہوتی تھی۔ جب وہ اصول پس پشت ڈال دیے گئے اور وہ راستہ اختیار کیا گیا جو درحقیقت مسلم امہ کی اپنی ممتاز شناخت سے میل نہ کھاتی تھی تو وہی عروج، قصہء پارینہ میں تبدیل ہوگئی۔(۳۲)

فصل چہارم

فریضہء اقامت دین سے غفلت

خیر امت کا اصل کام دعوت الی الخیر یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور حقیقت میں یہ انسانیت کیلئے پیغام فلاح ہے۔ لہذا اس پیغام کو قبول کرنے والوں پر لازم ہے اسے ساری نوع انسانی تک پہنچانے کی سعی کرے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (۳۳)

ترجمہ: "دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم خیر کی دعوت دیتے ہو، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

بنی اسرائیل کو لعنت کے قابل ان کی سرکشی اور ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دینے نے بنایا۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۳۴)

ترجمہ: "وہ ایکدوسرے کو افعال بد سے نہ روکتے تھے، بہت برا تھا وہ جو کرتے تھے۔"

مسلمانوں نے جب تک اپنے اس کام کو فرض سمجھ کر ادا کرتے رہے، ان کے معاملات زندگی میں اصلاح و درستگی کا عمل جاری رہا۔ قرآن مجید میں ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے معاملے میں ظالم نہیں ہے کہ کسی قوم یا امت کو خواہ مخواہ برباد کر دے یا اس کا شیرازہ بکھیر دے۔ اور معاملہ یہ ہو کہ وہ نیکوکار اور درستگی کرنے والے ہوں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ أَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝ (۳۵)

ترجمہ: "اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے تباہ کر دے حالانکہ اسکے باشندے نیک عمل کرنے والے ہوں۔"

ہلاک و برباد کر دینے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ قوموں اور بستیوں کو یا ان میں رہنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے بلکہ تباہی و بربادی کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ ان کی ہوا اکھاڑ دی جائے، ان کا شیرازہ بکھیر دیا جائے، انکی اجتماعی قوت توڑ دی جائے انکو محکوم و مغلوب اور ذلیل وخوار کر دیا جائے۔ وحی الٰہی اور فرمان نبوی کے مطابق اقوام و بلاد کی تباہی و زوال اجتماعی فساد، اجتماعی فواحشات و اجتماعی بدکاری کے سبب ہوا۔

یعنی بربادی و زوال کا سبب انفرادی شر و فساد کی روک تھام سے بے فکری اور اسی غفلت کے نتیجے میں یہ اجتماعی اور قومی شر و فساد میں بدل جاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہلاکت کی صورت میں ہوتا ہے۔

حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے اور انکو توڑ دینے والوں کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جنہوں نے قرعہ اندازی کر کے ایک کشتی کے حصے آپس میں بانٹ لیئے ان میں سے بعض کو اوپر کا حصہ ملا اور دوسرے کو نیچے کا۔ جو لوگ کشتی کے نیچے حصے میں تھے انہیں جب پانی لینا ہوتا تو وہ اوپر والوں کے پاس سے گذرتے (انہوں نے سوچا کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے) پس وہ کہنے لگے اگر ہم اپنے حصے میں شگاف کر لیں اور (شگاف کے ذریعہ پانی لے لیا کریں اور بار بار اوپر جا کر) اوپر والوں کو تکلیف نہ دیں (تو اچھا ہے) اب اگر اوپر والے انہیں ایسا کرنے سے نہ روکیں گے اور انہیں چھوڑ دیں گے کہ اپنا (یہ خطرناک) ارادہ پورا کر لیں، تو (شگاف کے ذریعے کشتی میں پانی بھر آئے گا اور اسے ڈبو دے گا اور) پھر سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اوپر والے انکا ہاتھ پکڑ لیں (اور انہیں شگاف کرنے سے روک دیں گے) تو (خود بھی) بچ جائیں گے اور (باقی) سب بھی نجات پائیں گے"۔(۳۶)

جب امت کے افراد نیکی کا حکم نہ دیں اور برائی سے نہ روکیں تو آہستہ آہستہ پورا معاشرہ فسادی بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اور پھر وہ دنیا کا زمام کار جو اسکے اہل ہوں انکے حوالے کر دیتا ہے۔

امت مسلمہ نے جب اپنے فریضہء سے روگردانی کی اور جب وہ بھی اپنے پیش رووں کی طرح بگڑنے لگے۔ انکے اندر بھی بناؤ کی صلاحیتیں گھٹنی شروع ہوئیں اور بگاڑ کے میلانات بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بھی اونچ نیچ اور نسلی امتیازات اور طبقاتی تفریقیں کر کے خود اپنی سوسائٹی کو پھاڑ لیا، جسکے بے شمار اخلاقی، سیاسی اور تمدنی نقصانات ہوئے۔ انہوں نے بھی انصاف کم اور ظلم زیادہ کرنا شروع کر دیا۔

وہ بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو بھول کر صرف اسکے فائدوں اور زیادہ تر ناجائز فائدوں پر نظر رکھنے لگے۔ انہوں نے بھی ترقی اور اصلاح کا کام چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی قوتوں اور ذرائع کو ضائع کرنا شروع کر دیا اور اگر استعمال کیا بھی تو زیادہ تر زندگی کو بگاڑنے والے کاموں میں کیا۔ تن آسانی وعیش پرستی میں وہ اتنے کھو گئے کہ جب آخری شکست کھا کر ان کے فرماں رواؤں کو دلی کے لال قلعہ سے نکلنا پڑا تو ان کے شہزادے -- وہی جو کل تک حکومت کے امیدوار تھے -- جان بچانے کے لیے بھاگ بھی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ زمین پر چلنا انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی عام اخلاقی پستی اس حد کو پہنچ گئی کہ ان کے عوام سے لیکر بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں تک کسی میں بھی اپنے ذات کے سوا دوسری کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی جو انہیں دین فروشی، قوم فروشی اور ملک فروشی سے روکتی۔ (۳۷) جب انکی یہ حالت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کا انتظام دوسروں کے حوالے کر دیا اس ضمن میں قرآن فرماتا ہے:

" لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ " کی تفسیر میں نبی ﷺ سے جو احادیث منقول ہیں اس سے امت کی پستی کا اہم ترین نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔

سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی مہربان ﷺ نے فرمایا:

"بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو یہ حال تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی یا دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرتے دیکھتا تو اسکو منع کرتا اور کہتا کہ اے شخص، خدا کا خوف کر۔ مگر اسکے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل ملکر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اسکو اس بدکار شخص کیساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت کرنے سے نہ روکتا جب انکا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایکدوسرے کا اثر پڑ گیا اور اللہ نے سبکو ایک رنگ میں رنگ دیا اور انکے نبی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی"

راوی کہتا ہے کہ جب حضور ﷺ سلسلہ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آ کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی، جسکے ہاتھ میں میری جان ہے! تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو۔ اور جسکو برا فعل کرتے دیکھو اسکا ہاتھ پکڑ لو اور اسے راہ راست کیطرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو ورنہ اللہ تمھارے دلوں پر بھی ایکدوسرے کا اثر ڈال دے گا اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی"۔ (۳۸)

پس فریضہ اقامت دین سے غفلت کے نتیجے میں نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا امت مسلمہ سے ختم ہوا تو وبائی مرض کی طرح برائی عام ہوئی اور جو انصاف و امن کے پیکر تھے اب ان سے دور ہو چکے تھے جب اجتماعی فساد برپا ہوا تو اس چیز نے امت مسلمہ کے زوال کی راہ ہموار کر دی۔

اسلام میں رہبانیت:

اسلام دین فطرت ہے اور اس دنیا میں انسانوں کو بھیجنے سے پہلے جو پہلا فرد بھیجا گیا وہ بھی تحرک پیدا کرنے والا، پیغام پہنچانے والا اور یہ بتانے والا کہ خالق و مالک کی مرضی و منشا یہ ہے، لہٰذا اس پر گامزن رہو اگر فلاح و کامرانی چاہیے۔ اور کم و بیش ایک لاکھ چالیس ہزار انبیاء اپنی قوم میں تحریک ہی برپا کرتے نظر آتے ہیں، رہنمائی کرتے، اپنے رب کے حکم کے تابع بناتے اور عزلت و گوشہ نشینی سے نکال کر لوگوں کی زندگیوں کو سنوارتے اور اصلاح کرنے کی فکر میں سرگرداں کہ کسی طرح اللہ کے بندے اللہ کی غلامی میں آجائیں۔

آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر جب پہلی وحی اور اس عظیم ذمہ داری کے کاندھے پر آجانے سے، ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی اور امی خدیجہ الکبریٰ سے کہا کہ مجھے چادر اوڑھا دو تو قانون الٰہی جس کا مقصد اس دنیا میں حرکت، جدو جہد، کش مکش اور انقلاب ہے، ان سے خطاب کیا جاتا ہے:

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝ (۳۹)

ترجمہ: "اے اوڑھ لپیٹنے والے، کھڑے ہو جائیں اور خبردار کریں، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔"

اسلام میں تو رہبانیت کا تصور کسی بھی گوشہ میں نہیں بلکہ اس کی مذمت کی گئی ہے۔ اسی لئے اسلام نے رہبانیت کے اس تخیل کی سخت مخالفت کی جو اس زمانے میں یونان وغیرہ کے عیسائیوں میں فاقہ کشی و ترک لذائذ کی صورت میں جاری تھا۔

وَرَھْبَانِیَّۃَ ِ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا (۴۰)

ترجمہ: "اور رہبانیت جس کو انہوں نے خود ہی نکالا تھا۔ ہم نے تو ان پر اس کو فرض نہیں کیا تھا۔"

پھر جو لوگ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر کے گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں ان سے کہا گیا۔

یٰا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ (۴۱)

ترجمہ: "اے مومنو! اللہ نے جو اچھی چیزیں تم پر حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو۔"

ان آیات الٰہی کی مزید تشریح حضور اکرم ﷺ کے مندرجہ ذیل اعلان سے ہوتی ہے جو در حقیقت مذہب اسلام کا بنیادی اعلان ہے۔

.......فمن رغب عن سنتي فليس مني (۴۲)

ترجمہ: "جو شخص میری سنت سے انحراف کرے وہ مجھ سے نہیں۔"

لیکن افسوس ابھی ان احکامات الٰہی کے نزول اور ارشادات نبوی کے اعلان کو نصف صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ اسلام میں اس مسیحی رہبانیت کا آغاز ہوگیا جس کی مذمت صریح الفاظ میں قرآن کریم نے کی تھی...... جہاد بالسیف کے بجائے مجاہدہ بالتسبیح، عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا باقاعدہ آغاز اسلام میں پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری کے اوائل میں ہوا۔ علاوہ بیرونی علوم، عیسائی پادریوں اور یونانی وایرانی راہبوں اور خانقاہ نشینوں کے اثرات کے اسلام کے چند داخلی اسباب وعوامل نے مسلمانوں کی ایک جماعت عبادت گذار کو عزلت نشینی کے طریقہ کو اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ملوکیت نے جہاں اسلام میں اور فتنے پیدا کئے رہبانیت بھی اسی غیر فطری نظام کے ردعمل کے طور سے ظہور میں آیا۔ دولت کی فراوانی اور خلفاء بنوامیہ و بنوعباسیہ کے ملوکیت پرست طرز عمل نے اسلام سے جہاد کی روح کو بالکل ختم کردیا اور تمام سوسائٹی عیش پرستیوں اور تن آسانیوں کا شکار ہوگئی۔ مذہبیت ختم ہوکر دنیاوی شوکت تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی جس نے خدا ترسی اور مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کے قلوب میں دنیا کی طرف سے جیسا کہ فطرت کا اصول ہے نفرت پیدا کردی اور انھوں نے ان ناجائز اور غیر اسلامی تخم پرست سامانوں سے علیحدگی اختیار کرلی جس نے آگے چل کر ترقی کر کے ان نعمتوں اور آسائشوں تک کو ترک کرنے کا خیال پیدا کردیا جن کو اسلام نے جائز قرار دیا تھا۔

اگر حقائق پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو ایک حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تو فلاطونیت و درویشی کی بدعت کے قیام کی ذمہ داری جس قدر علماء اور ملک پر ہے اسی قدر اس طبقے پر بھی ہے جنھوں نے صرف لا کو نصب العین بنا کر محض نفی پر اپنی زندگیوں کی بنیاد رکھی۔ جنھوں نے شر وفساد کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے فرار اختیار کیا اور گوشہ نشینی قبول کرلی.... بہر حال مختلف اسباب کی بناء پر اسلام میں گوشہ نشینی کے رجحانات پیدا ہوئے۔ بادشاہوں نے ان خانقاہوں کی اس لیے ہمت افزائی کی کہ بہترین قابل اور بزرگ ہستیاں جو اعلاء کلمۃ الحق کے ذریعہ ان کی ظالم حکومتوں کا تختہ الٹ سکتی تھیں ان خانقاہوں میں جذب ہوکر بے اثر ہوگئیں اور دنیاوی اختیارات حکومت ان بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوگئے۔

مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے دنیوی معاملات میں دلچسپی لینی چھوڑ دی انہوں نے خود تارک الدنیا ہو کر دنیا کو دوسروں کے حوالے کر دیا اور اس طرح خدا ترس اور مذہبی رجحان رکھنے والے طبقے کی عزلت نشینی سے شر و فساد پیدا کرنے والا گروہ دنیاوی اختیارات پر قابض رہا۔ حالانکہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق مومن تمام عالم میں عدل و امن کا ذمہ دار ہے۔ تمام دنیا اس کی میراث بلکہ اسی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔...... دوسرا نقصان یہ ہوا کہ دنیا سے علیحدگی نے ان خانقاہ نشینوں کے اندر یاس و نومیدی محرومی و بے عملی پیدا کر دی۔ انہوں نے دنیا کو ترک نہیں کیا بلکہ خود دنیا نے ان کو ترک کر دیا۔ اس لیے وہ رفتہ رفتہ دنیا والوں کے محتاج بن گئے۔ مریدوں اور ارادتمندوں کے نذرانوں پر ان کی گزر اوقات کا انحصار ہو گیا۔ لیکن اس نظام غیر فطری سے نہ صرف پرواز میں کوتاہی آئی بلکہ زمین سے نکل کر فضاء آسمانی میں اڑنے کا خیال ہی جاتا رہا۔ اور زمین کی خاک میں دانہ تلاش کرنا ہی مسلمانوں کا نصب العین ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے محکومی و بے عملی کے اثرات خانقاہوں سے نکل کر تمام اسلامی دنیا میں داخل ہو گئے جن کے نتائج سے آج مسلمان دو چار ہو رہے ہیں۔ (۴۳) امت مسلمہ کے اندر اتنی زیادہ افراط و تفریط کہ ایک طرف دنیا داری اور اس کی لذتوں میں مشغول حکمران تھے اور دوسری طرف مایوس ہو کر دنیا سے کنارہ کش ہونے والے اہل علم افراد۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ذمہ دار ہیں اور دونوں نے جب ذمہ داری سے ہٹ کر اس راہ کو متعین کر لیا جو مشیت خداوندی کے برخلاف ہے تو امت آج تک سر اٹھانے کے قابل نہ ہو سکی ہے۔

فصل پنجم

عربی زبان کی مرکزیت ووحدت سے دوری

زبان نہ صرف رابطے کا ذریعہ ہے بلکہ وحدت کی علامت بھی ہے۔ امت مسلمہ کے رہنما محمد عربی ﷺ جنکی زبان عربی تھی اور منبع ہدایت قرآن بھی عربی میں ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ شہریوں کی زبان اکثر قوم غالب اور سلطنت کی زبان کی تابع ہوتی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کے زمانہ میں تمام ممالک اسلام میں شرقاً وغرباً عربی ہی بولی جاتی تھی۔ اگر چہ شہروں میں عربی زبان کا ملکہ مفقود اور اصول اعراب بگڑ گیا تھا۔ اس لیے کہ دولت عربیہ دور دور تک کی سلطنتوں اور ان کے دیرینہ مذاہب پر غالب آئی اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک عربی ملک وملت کے اقبال کا پرچم لہرانے لگا۔ اور دین ومذہب عربی زبان میں تھا۔ اس لیے عرب کے تمام مفتوحہ ممالک نے اپنی قدیم زبان چھوڑ کر عربی اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ خود عربوں نے کوشش کی کہ ان کی زبان عام وتام ہو کر ان کی قلم رو میں پھیل جائے..... پس جب مذہب نے تمام عجمی زبان کو خوار و بے مقدار کر دیا اور مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور یہی شریعت کی۔ تمام ممالک اسلام نے بھی اپنے مذہب کے ساتھ قدیم زبانوں کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ یہاں تک کہ عربی زبان شعائر اسلام میں داخل ہوگئی..... اس کے علاوہ ممالک اسلام میں عربی زبان کے عام رواج کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ابتدائی زمانہ میں تو اسلامی شہر خود مسلمانوں سے بھرے پڑے تھے۔ اس کے بعد بھی ایک زمانہ دراز تک ان کی اولاد اور ان عجمیوں کی اولاد سے شہر بھرپور رہے جن کی زبان ابتدائی دور میں عربی ہو چکی تھی۔ اور پھر وہی عربوں کے وارث بنے اس لئے عربی زبان بطریق وراثت ان لوگوں کو پہنچتی رہی (۴۴)

اس دور میں عربی تمام مسلمانوں کی علمی زبان تھی۔ ترک، ایرانی، حبشی، بربر تمام قوموں کے عالم تصنیف وتالیف کے لئے عربی زبان ہی استعمال کرتے تھے۔ عربی زبان تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی جس کی وجہ سے ماوراء النہر میں لکھی ہوئی کتابیں اندلس تک اور اندلس میں لکھی ہوئی کتابیں ماوراء النہر تک آسانی سے پھیل جاتی تھیں۔ اس کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے خیالات سے واقفیت رکھتے تھے۔ بعد میں جب اسلامی دنیا میں انتشار پیدا ہو گیا اور ایک کی جگہ کئی حکومتیں قائم ہوگئیں تو یہی عربی زبان تھی جس کے ذریعے مسلمانوں میں اتحاد قائم تھا......(۴۵)

عربی زبان کی بجائے قومی زبان کا فروغ بھی امت مسلمہ کے زوال کا سبب بنا۔ اسطرح عربی کی وحدت ختم ہوگئی۔
عربی صرف دینی علوم کی زبان رہ گئی۔ دوسرے علوم پر ترکی اور فارسی میں زیادہ لکھا جانے لگا۔ علوم حکمت، ریاضی، فلسفہ اور کلام پر
عربوں کے دور میں جو فکر انگیز کتابیں لکھی گئیں ان تک رسائی کم ہوگئی۔ قومی زبان کا فروغ اگرچہ اپنی افادیت رکھتا ہے لیکن انکی
وجہ سے لسانی وحدت کو نقصان پہنچا۔ اسلامی ہند اور ایران کی علمی کتابیں جو فارسی میں تھیں ترکی اور عرب دنیا تک نہ پہنچ سکی اور اسی
طرح ترکی اور عرب دنیا کے بہت سے علوم زبان کی رکاوٹ کی وجہ سے اسلامی ہند منتقل نہ ہو سکے۔ (۴۶)

فصل ششم

اخلاقی بگاڑ

اخلاقیات کا سب سے زیادہ درس اسلام نے دیا ہے اور خلق عظیم کے مرتبے پر فائز اخلاق کی تکمیل کرنے والے محمد عربی ﷺ کی امت میں جب اخلاق زوال پذیر ہونا شروع ہوئے اور بناؤ کے بجائے بگاڑ کا عنصر پروان چڑھا تو امت مسلمہ زوال کا شکار ہوئی۔ قرآن کریم نے جو بہترین اخلاق نشوونما کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسوہ حسنہ کی صورت میں عملی نمونہ بھی مبعوث کر دیا تھا تا کہ یـــزکیھم یعنی وہ ان کا تزکیہ کرے، اسی وجہ سے ہمارے اسلاف اعلیٰ مرتبہ تک پہنچے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ مغرب پسندی نے مسلمانوں کے اندر سے اخلاق حسنہ کو نکال کر مادیت کا بندہ بنا دیا۔

مشرق کے جمود اور اس کے زوال کی اس وقت تک پوری تشریح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اخلاقی شعور کے فقدان کا ذکر نہ ہو۔ اخلاق ہمارا اس سے مقصد صرف جنسیات نہیں اور نہ اس لفظ کو ہم محض جنسیات تک محدود کرنا چاہتے ہیں، تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں، اور جن کی اہمیت کو بالعموم کم سمجھا جاتا ہے۔ اغراض پرستی اور ایک فعل کے اخلاقی ردعمل سے بے پروائی، یہ چیز محض اخلاق کے خالص مجرد اصولوں کے اعتبار سے مضرت رساں نہیں۔ بلکہ اس سے قوم میں ایک عام بے اعتمادی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو معاشرہ کی سب سے مفید اور بارآور قوتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور اس کی جگہ بہت ہی نقصان دہ قسم کی قوتیں بروئے کار آ جاتی ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری کا احساس، یہ یقین کہ بے انصافی، غداری، جھوٹ، چند ایک فائدے کے لئے آبادی کے ایک بڑے طبقہ کا معاشی استحصال، مادی اعتبار سے قوم کو کمزور کر دیتا اور ان لوگوں کی آرزوؤں اور دیانت کو پامال کر دیتا ہے، جو ان برائیوں کا تختۂ مشق بنتے ہیں۔ جو لوگ ان بداخلاقیوں کا شکار ہوتے ہیں، وہ اپنی قوتِ مدافعت کھو بیٹھتے ہیں اور وہ خود اپنے ماحول میں بھی وہی نازیبا حرکتیں کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو ان کے ساتھ ہو چکی ہوتی ہیں، یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ باہمی تعاون کے شعور کا فقدان اور اس یقین کا فقدان کہ معاشرے کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ اس کا ہر فرد دوسرے کے حقوق ادا کرے۔

قوم کو اس پہیے کی طرح بنا دیتا ہے جس کے گرد کا چکر ٹوٹ پھوٹ رہا ہو...... اسلامی مشرق میں رائج شدہ ظلم و جور

اس کے عوام کے اخلاق کے لئے بدترین درس گاہ تھی۔ افراد کی خودغرضی اور نو دولتے برسرِ اقتدار طبقے کی غیر ذمہ داری نے اسلامی معاشرے کے ڈھانچے کی بنیادوں کو کمزور کر دیا، یہاں تک کہ اس میں دیانت اور ایمان داری کے معنی افلاس سمجھے جانے لگے اور جو شخص سچائی اور استقامت پر گامزن ہونے کی جرأت کرتا، اسے اپنی قربانی کی صورت میں اس کی سزا بھگتنی پڑتی، بلکہ اُلٹا اس کی اس قربانی کا فائدہ بھی معاشرے کے غیر مستحق عناصر کو پہنچتا۔ حکومتوں نے رعایا کو مادی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے لوٹنا کھسوٹنا اپنا شعار بنالیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا متوسط طبقہ دوسروں کا فرماں بردار آلہ کار بن گیا، اور اس کا یہ کام ہوگیا کہ وہ حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی حماقتوں پر داد دینے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہے، لیکن جہاں تک عوام الناس کی غالب اکثریت کا تعلق تھا، وہ بدستور جاہل، افلاس زدہ اور تباہ حال رہی۔ (۴۷)

اور جب مسلمان حکمران انصاف سے عاری ہوگئے اور ظلم و ناانصافی زیادہ کرنا شروع کر دیں نیز حکومتی ذمہ داریوں کو بھول کر صرف اسکے فائدوں اور زیادہ تر ناجائز فائدوں پر نظر رکھنے لگے اور انہوں نے ترقی و اصلاحی اور تعمیری کاموں کو چھوڑ کر اپنی خداداد صلاحیتوں کو غلط استعمال کرنے اور بے جا اسراف کرنا اور ضائع کرنا شروع کر دیا اور جب اخلاقی بگاڑ اس حد تک پہنچ گئی کہ عوام سے لیکر بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں تک کسی میں بھی اپنی ذات کے سوا دوسری کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی جو انہیں دین فروشی، قوم فروشی اور ملک فروشی سے روکتی۔

جب امت کی یہ حالت ہوگئی کہ کسی کا حق تلف کرنے میں کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے میں کوئی "فائدمند" جھوٹ بولنے اور کوئی نفع بخش بے ایمانی کرنے میں صرف "قانون کے خداؤں" کے علاوہ اور کسی کا ڈر و احساس نہ رہا۔ بدعہدی، رشوت، خیانت، نفع اندوزی، تکبر، اختیارات کا ناجائز استعمال، ظلم کام چوری و مصلحت پسندی اسی طرح کی دوسری اخلاقی بگاڑ کی یہ وبا جب امت پر چھاگئی تو امت تنزلی کا شکار ہوگئی۔ اسی لیے امیر الشعراشوقی فرماتے ہیں

و انما الامم الاخلاق ما بقیت

فان هم ذهبت اخلاقهم ذهبوا (۴۸)

"قومیں اسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں اخلاق موجود ہوا گر ان کے اخلاق ختم ہو جائیں تو گویا وہ خود ختم ہوگئیں"۔

فصل ہفتم

نصب العین سے دوری

نصب العین کا مطلب ہے کہ اپنی نگاہ کو اہم مقصد کے حصول کے لیے جمائے رکھنا لہٰذا زندگی کے تمام مقاصد کو ایک اعلیٰ مقصد کے تحت لا کر تمام تر توجہ اس اعلیٰ مقصد کی جانب مبذول رکھنا نصب العین کہلاتا ہے۔

جب کسی قوم کا کوئی نصب العین نہ ہو تو اس کا ہر عمل یا تو بے مقصد ہوتا ہے یا عمل کی استعداد ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی منزل، بقاء، کامیابی و غلبہ اور اس کے حصول میں معاون تمام محرکات و جذبات سرد ہو جاتے ہیں اور وہ قوم قال و قیل کی حجتوں اور جزوی تنازعات میں مشغول ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی مقصد زندگی و جذبہ تحرک کار فرما ہی نہیں رکھا جاتا

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاع کردار

بحث میں آتا ہے جب فلسفہ ذات و صفات (۴۹)

قرون اولی کے مسلمان غلبہ اسلام کے نصب العین سے سرشار تھے اور وہ دنیا کی نجات کے لیے اسلامی انقلاب کو ایک لازمی چیز سمجھتے تھے۔ ملوکیت کے زیر اثر مسلمانوں کا یہ اسلامی نصب العین کمزور ہوتا چلا گیا اور ایک وقت وہ آ گیا کہ مسلمان حکمرانوں کے ذہن سے یہ نصب العین بالکل محو ہو گیا اور اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایک رسمی مذہب بن گیا۔ جہاد کا نظریہ اپنے اصلی مقصد سے ہٹ گیا اور صرف کافروں کے کشت و خون کا نام رہ گیا اور مسلمان حکمرانوں کی فتوحات کی مقصد ذاتی اقتدار اور ذاتی شہرت کے علاوہ کچھ نہ رہا۔ (۵۰) جب مسلمانوں کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین باقی نہیں رہا تو وہ زوال پذیر ہوئے۔ اسی حقیقت کو حضرت علامہ اقبالؒ نے انتہائی درد انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔

شبے پیش خدا بگریستم زار | مسلماناں چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم | دلے دارند و محبوبے ندارند (۵۱)

"رات میں خدا تعالیٰ کے آگے بڑی عاجزی سے رویا کہ خدایا مسلمان دنیا میں کیوں عاجز و درماندہ اور ذلیل و خوار ہیں اس پر یہ آواز آئی کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے مگر اس دل کے اندر کوئی محبوب نہیں رکھتی"۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا زوال بے مقصدی کی وجہ سے ہے۔ یہ "محبوب" وہی مسلمان قوم کا نصب العین تھا جس نے مسلمانوں کے اندر وہ قوت وہمت پیدا کر دی تھی کہ جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کو چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ..... زار ندو خوار ند ہیں

امت مسلمہ کے لئے نصب العین سے دوری کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی مسافر اپنی منزل کو دور اور سفر کو مشکل سمجھتے ہوئے پست ہمتی کا مظاہرہ کرے اور کسی سائے کو تلاش کر کے آرام کرنے لگے مگر حشرات الارض ہیں کہ اسے چین لینے نہیں دیتے اور وہ آرام وسکون حاصل کرنے کے بجائے مزید پریشان ہو جاتا ہے مگر کم ہمتی اسے از سر نو سفر پر گامزن ہونے بھی نہیں دیتی۔ اسی کشمکش میں وہ مبتلا رہتا ہے نہ آرام ہی نصیب ہوا اور نہ ہی منزل تک پہنچ پایا۔ یعنی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ یہی حال آج امت مسلمہ کا ہے کہ منزل سے دور کم ہمتی کو گلے لگائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فرداں ہے۔

فصل ہشتم

تقلید و جمود

اگر کوئی قوم سوچنا، تحقیق کرنا، معلومات جمع کرنا اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا چھوڑ دے تو وہ جمود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جمود کا نتیجہ آخر کار انحطاط ہوتا ہے اور انحطاط کا نتیجہ آخر کار اس پر کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے۔ پھر جب کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے تو لامحالہ وہ محض سیاسی اور معاشی حیثیت ہی سے غالب نہیں ہوتی، بلکہ سب سے بڑھ کر اس کا غلبہ فکری حیثیت سے ہوتا ہے، یعنی اس کی تہذیب مغلوب قوم کی تہذیب پر غالب آ جاتی ہے۔ اب اس کے بعد دوسرا مرحلہ اس مغلوب قوم کا یہ شروع ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیتی ہے، دوسروں کی تحقیقات کا پس خوردہ کھانا شروع کر دیتی ہے۔ تحقیقات دوسرے کرتے ہیں، ان کو جمع دوسرے لوگ کرتے ہیں، ان کو مرتب کر کے ایک فلسفہء حیات دوسرے لوگ بناتے ہیں، ایک نظامِ فکر وعمل دوسرے لوگ تیار کرتے ہیں اور یہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور ان کی ہر چیز کو قبول کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ عمل جتنا جتنا بڑھتا جائے گا اور جتنا جتنا تکمیل تک پہنچتا جائے گا، اس مغلوب قوم کی انفرادیت ختم ہوتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ یہ فنا بھی ہو سکتی ہے اور قومیں فنا ہوتی رہی ہیں۔ ایسی قومیں دنیا میں گزری ہیں جو اس طرح سے مٹیں کہ اب ان کی تہذیب صرف تاریخ کا سرمایہ ہے اور دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اسلامی تحریک جب دنیا میں اٹھی تھی، اس وقت مسلمانوں نے دوسری قوموں پر محض سیاسی یا فوجی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان ہی اس وقت ایسے تھے جو تحقیقات کا کام کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ ان معلومات کو اپنے نقطہء نظر، اپنے طرزِ فکر اور اپنے عقیدے کے مطابق مرتب کیا۔ چنانچہ ایک ایسی غالب تہذیب اس کی بدولت وجود میں آئی جس کے رنگ میں دنیا رنگتی چلی گئی۔ (۵۲)

مسلم امہ نے علم وتحقیق اور تہذیب وتمدن کی وہ اعلیٰ مثال قائم کی کہ اپنے تو اپنے غیر بھی مسلمانوں کی تقلید کرنے پر فخر محسوس کرنے لگے۔ امت مسلمہ کے نظام توحید ومحبت نے شرک ونفرت کی جڑیں کاٹ دی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ وقت بھی آیا جب مسلمانوں نے تحقیقاتی کام سے کنارہ کشی اختیار کرنی شروع کر دی۔ اسلاف کے تحقیقاتی ورثے کو پڑھنے پڑھانے اور حاشیے لکھنے ہی پر اکتفا کرنے لگے۔

دوسری طرف اسی زمانہ میں اہلِ مغرب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تحقیقات علمی شروع کی۔ انہوں نے نئی نئی معلومات جمع کرنی شروع کیں۔ انہوں نے ان کو مرتب کر کے نئے فلسفے اور نئے نظام ہائے فکر و عمل کی تشکیل شروع کر دی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف مسلمان رفتہ رفتہ جمود میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف اس علمی تحریک کی بدولت مغرب کی طاقت روز بروز بڑھنی شروع ہوگئی۔ آپ اپنی تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے، اٹھارھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مسلمان اور اہلِ مغرب کے درمیان اتنا نمایاں فرق ہوگیا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہوگئے اور مغربی قومیں ان پر غالب آنی شروع ہوگئیں۔ دو تین سو برجمود میں لگے اور اس جمود کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہوگئے اور مغربی قومیں غالب آنے لگیں۔ اٹھارھویں صدی سے مسلمانوں پر مغربی قوموں کی یورشیں اور ان کی فتوحات خود اس بات پر شاہد ہیں کہ علمی تحقیقات چھوڑ دینے اور جمود اختیار کرنے کے نتائج ہم نے کیا بھگتے اور انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کے کیا فوائد حاصل کیے۔ (۵۳)

وحیِ الٰہی حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ کے ذریعے مسلمانوں کو مکمل رہنمائی کی گئی تھی کہ وہ متحرک رہیں۔ لہٰذا نبی ﷺ کو فرمایا گیا تھا کہ

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ (۵۴)

ترجمہ: "مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و ساماں مہیا کیئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں"

اور یہ کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (۵۵)

ترجمہ: "اور جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے تو ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے"۔

مگر اس قوت متحرکہ میں اس وقت زنگ لگنا شروع ہوگیا جب مسلمانوں نے دنیاوی عیش و عشرت میں دوسروں کی تقلید شروع کر دی لہٰذا ان میں آہستہ آہستہ جمود آنا شروع ہوگیا اور وہ جمود نہ صرف تعلیمی میدان میں تھا بلکہ فنون جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں بھی تھا۔ وحی الٰہی کی روشنی میں تحرک جاری نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح پانی مستقل کھڑا رہے تو بدبودار ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمان کمزور اور پست ہوگئے اور اس چیز نے ان کو زوال کی طرف دھکیل دیا۔

عثمانیوں کے یہاں علماء کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی، انھوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا، جب تک ملتِ اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا، ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت نہ تھی، سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں، اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔ علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، دماغ تھکے تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں، اور ایک عالمگیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتدا نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کی نویں صدی ہجری وہ آخری صدی تھی، جب جدتِ فکر، قوتِ اجتہاد اور ادب وشاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔(۵۶)

علامہ ابوالحسن علی ندویؒ اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اجتہاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت وامامت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہو وہ نئے پیش آنے والے مسائلِ زندگی میں انفراداً یا اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں اور روحِ اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اتنی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے ہوں جس سے وہ امت کی مشکلات کو حل کرسکیں، اور اشتباہ اور تحیر کے موقع پر اس کی رہنمائی کرسکیں، نیز وہ اتنی ذکاوت ومستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں، اور زمین میں دولت وقوت کے چشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لئے مفید بنائیں، بجائے اس کے کہ اہلِ باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لئے استعمال کریں اور زمین میں سر بلندی اور فساد کے لئے ان سے مدد لیں، اہلِ حق ان سے وہ کام لیں جن کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ لیکن دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصبِ جلیل پر وہ لوگ حاوی ہوگئے، جنھوں نے اس کے لئے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی، خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانہ کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انھوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت نہیں پائی تھی، ان کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند تھا جو ملتِ اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایانِ شان ہے۔

ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہوئی تھیں، ان میں نہ روحِ جہاد تھی، اور نہ قوتِ اجتہاد جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لئے ضروری ہے، خلیفہء راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۷۱ھ) کی ذات کو مستثنیٰ کر کے عام خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کا یہی حال تھا۔(۵۷)

شاہ ولی اللہؒ نے تقلید پر نہ صرف تنقید کی بلکہ ان اسباب تقلید کو بھی بیان کیا ہے۔ جس سے اہل علم وحکمرانوں کی ذہنی وعلمی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ تقلید کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پہلا سبب تو یہ تھا کہ فقہا میں باہم مزاحمت اور مجادلہ ہونے لگا۔ لوگ فتوؤں میں روک ٹوک کرنے لگے۔ جو شخص فتویٰ دیتا تھا فوراً اس کے فتوے پر اعتراضات کیے جانے لگے اور اس کو رد کیا جاتا تھا، انجام کار سخن کا سلسلہ متقدمین سے کسی شخص کے مصرح قول پر ختم ہوتا تھا۔ دوسرا سبب حکام اور قضاۃ کا جور وتعدی بھی تقلید کا باعث ہوا۔ اکثر حکام کی طبیعت میں جور ہو گیا تھا۔ ان میں تدین اور امانت کی صفت مفقود تھی۔ ان کے فیصلے جب ہی مقبول سمجھے جاتے تھے کہ عام لوگوں کو ان میں اشتباہ باقی نہ رہے اور اس کا قول کسی شخص سابق کے مطابق ہو۔ تیسرا سبب سرتاج لوگوں کی جہالت اور بے علموں سے فتویٰ لینا تقلید کا باعث ہوا۔ یہ مفتی علم حدیث اور تخریج کے طریقے سے ناواقف ہوتے تھے۔ جیسے کہ اکثر متاخرین کی ظاہراً حالت ایسے ہی تم دیکھتے ہو۔ چوتھی وجہ تقلید کی یہ ہوئی کہ اکثر لوگوں نے ہر فن میں عمیق باتوں کی جانب زیادہ توجہ کی۔(۵۸)

چوتھی صدی کے بعد سے تقلید جامد کی گھٹائیں تمام ممالک اسلامی میں پھیل گئیں اور آگے چل کر اسی کی وجہ سے فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں نے جو شکل اختیار کر لی وہ اسلام میں بے شمار فتنوں، نزاعات اور باہمی جنگ وقتال کا باعث بن گئی۔ سقوط بغداد کے بعد جب کہ مسلمان زندہ ہونے کے باوجود بالکل مردہ تھے تقلید جامد نے ایک عجیب شکل اختیار کر لی تاتاری نومسلموں کے زمانہ حکومت میں نہ صرف ہر مذہب کے علیحدہ علیحدہ قاضی مقرر ہونے لگے بلکہ کسی ایسے مجتہد کے لئے جو چاروں مروجہ مذاہب میں سے کسی ایک سے وابستہ نہ ہوتا ان کے محکمہ قضاۃ میں کوئی جگہ نہ ہوتی تھی اس لئے بہت سے ایسے مجتہدین بھی جو اجتہاد کی تمام شرائط کے مالک ہوتے تھے تقلیدی مسلک پر رہنے پر مجبور تھے..... پہلے یہ حالت تھی کہ فقہ کا طالب پہلے قرآن مجید کے درس اور حدیث کی روایت میں مصروف ہوتا تھا جو کہ استنباط کی بنیاد تھے لیکن اب وہ ایک معین امام کی کتابیں پڑھتا تھا اور اس طریقے کا مطالعہ کرتا تھا۔ جس کے ذریعے سے اس نے اپنے مدونہ احکام مستنبط کیے تھے۔ اور جب وہ اس کام کو پورا کر لیتا تھا تو علماء فقہاء سے ہو جاتا تھا۔ تقلید کی یہ رو برابر بڑھتی گئی حتیٰ کہ آج ائمہ کی تقلید شخصی سے انکار کرنا بے دینی کا ثبوت سمجھا جانے لگا ہے۔

علماء اسلاف کے خیالات صحیح تاریخ سے عدم واقفیت نے مسلم عوام تک کو مقلد و غیر مقلد کے ناموں سے فرقہ بندیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (۵۹) حالانکہ فقہائے ملت بھی اس کا خیال رکھتے تھے کہ امت کو کسی بھی ایک فرد کی تحقیق و خیالات کا پابند نہ کیا جائے جیسا کہ امام شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے:

جب منصور عباسی نے حج کیا تو امام مالک سے کہا میرا مقصد یہ ہے کہ تمہاری مصنفہ کتابوں کو لکھوا کر سب اسلامی شہروں میں ان کا ایک ایک نسخہ بھیج دوں اور لوگوں کو حکم کروں کہ انہی کے مسائل پر عمل کریں ان کے علاوہ اور کسی جانب رخ نہ کریں۔ انہوں نے فرمایا اے امیر المؤمنین ایسا نہ کرو۔ لوگوں میں پہلے ہی سے اقوال مشتہر ہو گئے ہیں۔ وہ احادیث سن چکے ہیں۔ روایت کو نقل کر چکے ہیں۔ جو مسائل معلوم ہو گئے ان پر انہوں نے عملدرآمد کر لیا ہے لوگوں میں اختلافات ہو گئے ہیں۔ اسی واسطے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو جو انہوں نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے اسی پر رہنے دو اور یہ قصہ بعض نے ہارون رشید کی طرف منسوب کیا ہے اس نے امام مالک سے مشورہ کیا تھا کہ مؤطا کو کعبہ میں لٹکا دینا چاہتا ہوں۔ تمام لوگوں کو اسی پر عمل کرنے کی ترغیب دوں گا۔ امام مالکؒ نے کہا ایسا نہ کرو رسول ﷺ کے صحابہؓ نے فروع مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ بلاد اسلامی میں وہ متفرق ہو گئے احادیث مشتہر ہو چکیں۔ ہارون رشید نے کہا وفقک اللہ یا ابا عبد اللہ ط (۶۰)

فکری و سائنسی علوم و ٹیکنالوجی میں غفلت:

مسلم امہ کی تربیتی بنیاد سرور دو عالم ﷺ نے انسانیت کی فلاح پر رکھی تھی:

و عن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (۶۱)

ترجمہ: "عبداللہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے مخلوق خدا کا کنبہ ہے پس بہترین شخص مخلوق میں سے وہ ہے جو خدا کے کنبہ کے ساتھ احسان کرے۔"

لہٰذا خلق خدا کے معاملہ میں خیر الناس من ینفع الناس کی روشنی میں اپنے علوم و فنون کے ذریعے انسانیت کو جتنا فائدہ امت مسلمہ نے پہنچایا کسی اور نے نہیں پہنچایا۔

انہی کی بدولت بغداد رشک ارم بن گیا، ایران کے مٹے ہوئے نقش و نگار ابھر آئے، قرطبہ اور غرناطہ علمی آرزوؤں اور تمدنی تمناؤں کے عشرت کدے اور گل کدے بن گئے، یونان کی برہم شدہ مجلس علم پھر سرگرم ہو گئی، صقلیہ کی اسلامی حکومت کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی، ہندوستان جنت نشان بن گیا۔

یونان وروم مٹ چکے تھے، یورپ میں ذہنی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، ایران میں فکری طوائف الملوکی تھی، ہندوستان جاگ کر پھر سو رہا تھا تو بغداد منصور سے معتضد باللہ کے عہد تک بیت الحکمۃ بن فلسفیوں نے اپنے ماہرانہ انداز میں ان کو اپنے رنگ میں ایسا رنگ لیا کہ عرب حکماء کی ساری موشگافیاں دب کر رہ گئیں۔ بغداد کی طرح قرطبہ، غرناطہ اور قاہرہ بھی علمی مرکز بنے، اہل یورپ یہاں کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے، پوپ سیلوسٹر ثانی نے اپنی تعلیم قرطبہ کی اسلامی درسگاہ میں پائی، مصر کے فاطمی حکمراں کے زمانہ میں قاہرہ کی علمی شہرت سے بحراوقیانوس اور بحر منجمد کے ممالک متاثر تھے۔ یورپ اس عہد میں بڑے مشکل دور سے گزر رہا تھا کانسٹنٹائن اور اس کے جانشینوں نے اپنی راسخ العقیدگی میں تمام کتب خانوں میں قفل لگا رکھا تھا، علم کو جادو سمجھا جاتا تھا۔ اس کے حصول کو غداری قرار دیا جاتا تھا، فلسفہ اور سائنس دربدر کر دی گئی تھی، اصلی عبادت کی ماں عدم واقفیت تھی..... اسی زمانہ میں بغداد میں ایک ایسا مکتب فکر ابھرا جو ہر چیز کی علت ومعلول کی تفتیش میں لگا ہوا تھا، آج یورپ کو اپنے طریق استخراج واستنباط پر ناز ہے لیکن اس کی ابتداء عرب حکماء ہی کی طرف سے ہوئی تھی..... ابن رشد کو ارسطو کا شارح خیال کیا جاتا ہے مگر بہت سے مسائل میں اس کی رائے ارسطو سے بہتر سمجھی گئی..... ابن ہیثم طبیعات کا بڑا ماہر تھا، اس کی کتاب المناظر کے ترجمے لاطینی اور اطالوی زبانوں میں ہوئے۔ کیپلر نے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے اس کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے، جن سے یورپ نے پورا فائدہ اٹھایا، جابر ابن حیان علم کیمیا کا موجد تھا، اسی کی تصانیف سے شورے کے تیزاب، ماء الملوک، نوشادر، چاندی کے شوری، زیبق سیمانی، راسب الاحمر وغیرہ جیسی چیزیں یورپ والوں کو معلوم ہوئیں۔ جبر ومقابلہ بھی عربوں کی خاص چیز رہی، وہی اس علم کے موجد ہیں..... نجوم وہیئت کے علوم میں ماشاءاللہ احمد بن محمد نہاوندی، سند بن علی، یحییٰ بن منصور، خالد بن عبدالملک، ابو معشر، ابوالحسن الناریمری، محمد بن عیسیٰ، ابوعبداللہ جیسے فضلاء پیدا نہ ہو سکے، عربوں میں محمد بن جابر البتانی کی وہی حیثیت تھی جو یونانیوں میں بطلیموس کی تھی...... خراسان میں ابوالوفا نے اختلاف حرکت قمر سے متعلق جو انکشافات کئے، ان سے چھ سو برس بعد ٹائکو براہے نے پورا فائدہ اٹھایا اور ابوالوفاء کی ساری تحقیقات اس کی طرف منسوب کر دی گئیں، گھڑی کے پنڈولم کا موجد ابن یونس تھا، اس نے زیج الاکبرالحا کی لکھی تو بطلیموس کے کارنامے ماند پڑ گئے...... یورپ میں جو پہلی رصدگاہ بنی، اس کا تعمیر کرنے والا جابر بن عفیہ تھا، عمر خیام اور عبدالرحمٰن الخزینی نے مل کر جو زیج تیار کی، وہ گریگوری کلنڈر سے چھ سو برس پہلے تھی، کپر جدید ہیئت کا بانی سمجھا جاتا ہے، مگر اس سے کئی سو برس پہلے الغ بیگ نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی۔ (۶۲) مسلمانوں نے ہی دنیا کے کونے کونے جانے کی کوششوں میں نہ صرف صفر کیے بلکہ ایسی جگہوں کے سفرنامے لکھے جن سے دنیا آگاہ نہ تھی۔

علم طب میں بھی مسلم حکماء نے جن میں ابن زکریا رازی، علی بن عباس، شیخ بوعلی سینا، ابوالقاسم الزہراوی، خلف ابن عباس، ابن زہر، البقاس، ابوولید، محمد بن رشد اور عبداللہ بن علی بیطار وغیرہ ثانی نہیں رکھتے تھے۔

علم وحکمت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مسلم مفکرین نے نئی معلومات نہ کی ہوں کاغذ، قطب نما، بارود جیسی اہم ایجادات مسلمانوں کی معلوم کردہ ہیں۔ مشہور مؤرخ موسیوسیوویوفرانسیسی اپنی کتاب تاریخ عرب میں لکھتا ہے:

"عربوں نے کاغذ، قطب نما، بارود اور توپوں کو ایجاد کیا اور ان کی اس ایجاد سے تمام دنیا کی سیاسی ادبی اور فوجی حالت میں کیسا انقلاب عظیم رونما ہوا بعض یورپین اہل قلم نے عربوں سے ان چیزوں کے ایجاد کرنے کا شرف زبردستی چھین لیا ہے ان کے بیان پر کوئی التفات نہ کرنا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ ان اشیاء کے موجد عرب ہیں اور عربوں ہی نے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا ہے۔ (۶۳)

غرض یہ کہ علم کیمیا، طب، افلاک ونجوم، جغرافیہ، تاریخ میں مشاہدہ وتحقیقی عناصر کو مسلمانوں ہی نے متعارف کرایا تھا۔ حتیٰ کہ عقلیت پسندی بھی مغرب نے مسلمانوں ہی سے سیکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

مغربی مما لک میں جو مسیحی متکلمین کا ایک گروہ گزرا ہے، اس کی کتابیں پڑھیے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ مسلمانوں کے متکلمین اور ان کے علمِ کلام کی جوں کی توں نقل اتاری جارہی ہے۔ وہی مسائل ہیں، وہی اصطلاحات ہیں، وہی بحثیں ہیں بجز اس کے کہ انہوں نے مسیحی عقیدے کو اس کے اندر شامل کردیا ہے۔ لیکن آپ مسیحی متکلمین کی تحریروں اور مسلمان متکلمین کی تحریروں میں بجز تثلیث اور ابنیت کے عقیدے کے اور کوئی فرق نہیں پائیں گے۔ (۶۴)

دنیوی نعمتوں کی تقسیم میں اگرچہ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے مگر قانون فطرت کے مطابق جو قوم اس میدان میں آگے بڑھتی ہے وہ گویا کہ ان دنیوی نعمتوں کی حق دار بن جاتی ہے۔ اور جو قوم ان نعمتوں کے بٹورنے میں پیچھے رہ جاتی ہے وہ قانون فطرت کے مطابق دنیا کے سٹیج سے اتاردی جاتی ہے یا خلافت ارض کے میدان میں پیچھے ڈال کر دیگر اقوام کی غلام یا حاشیہ بردار بنادی جاتی ہے.... تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلم قومیں جب تک سائنسی علوم کو سینے سے لگائے تسخیر موجودات میں منہمک رہیں وہ بڑی آن بان کے ساتھ سریر آرائے سلطنت رہیں اور دیگر قوموں پر ان کی دھاک بیٹھی رہی۔ جس طرح کہ آج یورپ اور امریکہ کی دھاک دیگر اقوام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر جیسے ہی انھوں نے اس وظیفے کو ترک کیا وہ مغلوب ومقہور ہوگئیں۔ حتیٰ کہ پوری پانچ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک ان کی ذلت ومسکنت کا یہی حال ہے.... اگر مسلمان قومیں قرون وسطیٰ

کی طرح موجودہ دور میں بھی ان علوم وفنون میں امام ہوتیں اور جدید تحقیقات میں ان کا بھی حصہ ہوتا تو ان علوم کی غلط اور مادہ پرستانہ نقطہءنظر سے تشریح وتوجیہہ کے باعث جو عالمگیر فکری بے راہ روی اس وقت پائی جارہی ہے وہ ہرگز رونما نہ ہوتی۔ اور اس نقطہءنظر کے باعث موجودہ تمدن میں جو غلط اور مضر رجحانات...... خدا بیزاری اور آخرت فراموشی کی وجہ سے..... پیدا ہو گئے ان کا سد باب ہوتا۔ اور عالمِ انسانی جن ہلاکت خیزیوں سے اس وقت دوچار ہے ان سے وہ محفوظ رہتا۔ اس طرح امت مسلمہ کے اس میدان میں پیچھے رہ جانے کے باعث عالم انسانی کو دوہرے اور عظیم نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے، جس کی تلافی بہت مشکل سے ہو سکے گی۔ (٦٥)

فصل نہم

حب الدنیا وکراہیت الموت

اسلام نے شروع سے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں دنیا کی حیثیت مزرعة الاخرة کے طور پر بٹھائی ہے۔

براویت حضرت شداد بن اوسؓ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الکیس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت و العاجز من اتبع نفسه هواها و تمنی علی الله (٦٦)

یہی وجہ ہے کہ رومی سردار مسلمان فوجوں کو جب اس دنیا ومتاع سے بے نیاز دیکھتا ہے تو تعریفی کلمات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "رات میں تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے، اور دن کو روزہ دار، عہد وفا کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں"۔

دوسرے کے الفاظ ہیں "وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں، اور رات کو عبادت گزار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں بھی وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کر کے داخل ہوتے ہیں، اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں"۔

ایک تیسرے شخص نے ان الفاظ میں تعریف کی "رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں، اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں، اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے گویا یہی کام ہے، بڑے تیز انداز، اور بڑے نیزہ باز، خدا کی یاد میں اس طرح مشغول وتر زباں کہ ان کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے"۔

اسی اخلاقی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدائن کی فتح میں کسریٰ کا مرصع تاج اور اس کا فرشِ بہار جو لاکھوں اشرفیوں کی مالیت کا تھا، فوج کے ہاتھ لگتا ہے، لیکن کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی تصرف کیا جائے وہ قائد کے حوالے کر دیتے ہیں، اور قائد حضرت عمرؓ کو بھیج دیتے ہیں۔ (٦٧)

نومسلم محمد اسد اپنی کتاب Islam at the cross road میں لکھتے ہیں کہ تمام مذاہب میں سے صرف اسلام ہی انسان کے لیے یہ ممکن بناتا ہے کہ وہ اپنی روحانیت کو قربان کیے بغیر دنیاوی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔

یہ عیسائیت کے تصور سے کتنا مختلف ہے! عیسائیت کے مطابق انسان پر آدم وحواؑ کا گناہ چپک گیا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کی ساری زندگی مصائب سے بھر گئی ہے۔ عیسائیت کے نزدیک دنیا دو مختلف طاقتوں خیر وشر کی کشمکش کا اکھاڑہ ہے۔ شر کی نمائندگی شیطان کرتا ہے اور خیر کی نمائندگی حضرت عیسی علیہ السلام کرتے ہیں..... ان تعلیمات کی موجودگی میں مذہبی انسان میں یہ احساس مستقل رہتا ہے کہ اس کا ضمیر برا ہے۔ اس طرح انسان دو خواہشوں کی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ ایک یہ کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے اور دوسری یہ فطری خواہش کہ دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہوا جائے۔ آدم علیہ السلام کا یہ مبینہ گناہ جس سے بچنا ممکن نہیں اور اس کے کفارہ کے طور پر حضرت عیسی علیہ السلام کا سولی پر چڑھنا جو عام انسانوں کے لیے نا قابل فہم ہے، ان کا تصور ہی انسان کی روحانی ترقی اور اس کی جائز دنیاوی خواہشات کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے...... اسلام میں جدید مغرب کی اس مادی رجائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں جو یہ کہتا ہے:" میری سلطنت صرف یہی دنیا ہے"۔ اور نہ اسلام عیسائیت کے اس تصور کا حامی ہے کہ "میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے"۔ اسلام درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ دعا سکھاتا ہے:

"اے ہمارے رب! اس دنیا میں بھی ہمیں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی دے"۔

اس لیے اس دنیا سے تمتع حاصل کرنا ہماری روحانی ترقی میں مانع نہیں۔ مادی خوشحالی اگر چہ بذات خود نصب العین نہیں ہے لیکن یہ پسندیدہ ضرور ہے۔ ہماری عملی سرگرمیوں کا مقصد ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ ایسا انفرادی اور سماجی ماحول پیدا کیا جائے اور اس کو برقرار بھی رکھا جائے جو انسان کی اخلاقی ترقی کے لیے سازگار ہو۔ (٦٨)

قال رسول الله ﷺ يؤشک الامم ان تداعیٰ علیکم کما تداعی الأكلة الى قصعتها فقال قائل و من قلة نحن يومئذ فقال بل انتم يؤمئذ كثير و لكنكم غثاء كغثاء السيل و لينزعن الله من صدور عدوكم المهابة منكم و ليقذ فن في قلوبكم الوهن قال قائل يا رسول الله ﷺ و ما الوهن قال حب الدنيا و كراهية الموت (٦٩)

"نبی مہربان ﷺ نے فرمایا میری امت پر وہ وقت آنے والا ہے جب دوسری قومیں (لقمہ تر سمجھ کر) تم پر اسطرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا اس زمانے میں ہماری تعداد اتنی کم ہو جائے گی کہ ہمیں نگل لینے کے لیے قومیں

متحد ہو کر ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔ ارشاد فرمایا نہیں! اس وقت تمہاری تعداد کم نہ ہو گی۔ البتہ تم سیلاب میں بہنے والے تنکوں کی طرح بے وزن ہو گے۔ اور تمہارا رعب نکل جائے گا تمہارے دلوں میں بزدلی اور پست ہمتی پیدا ہو جائے گی۔ اس پر ایک آدمی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! یہ بزدلی کیوں پیدا ہو جائے گی فرمایا! اس وجہ سے کہ تم دنیا سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے اور موت سے بھاگنے اور نفرت کرنے والے ہو جاؤ گے"۔

یعنی تمہیں دنیا سے رغبت و محبت پیدا ہو جائیگی جس سے عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کے کام نہ ہونے پائیں گے۔ اور موت سے ناگواری اور کراہیت پیدا ہو جانے لگے گی جس کی بناء پر اعلائے کلمۃ اللہ اور حق کی سربلندی کی راہ میں جانبازی کا جوہر باقی نہیں رہے گا۔

جب امت کے اندر دنیا سے محبت پیدا ہو گئی اور انکا ترجیح اول دنیا کا حصول ہو گیا اور وہ دنیا ہی میں مگن ہو گئے تو ان کے اندر موت سے نفرت اور ہمیشہ باقی رہنے کی خواہش نے ان کو بزدل بنا دیا۔ اور وہ وقت کے باطل قوتوں کے خلاف مقابلے میں آنے کے بجائے اپنے محلات میں رنگ رنگیلیوں میں مصروف رہے۔ اور تاریخ نے وہ وقت بھی محفوظ رکھا کہ دشمنوں سے انہوں نے اپنی زندگی کی بھیک مانگی اور جب انہوں نے کوئی چارہ نجات نہ پائی تو دشمنوں نے انہیں جس قطار میں کھڑا کیا تھا اسی جگہ پر سر جھکائے اپنی قتل کی باری آنے کا انتظار کرنے لگے۔

آج بھی اسلامی بلاک کی ایک طاقتور کڑی موجود ہے مگر حال یہ ہے کہ تمام سربراہانِ مملکت اسلامیہ اپنی عیاشیوں میں مصروف ہیں۔ اور دشمن یکے بعد دیگرے ایک ایک اسلامی ملک کو مختلف حربوں سے زیر کر رہا ہے اور اس طرح امت مسلمہ مزید تنزلی کی طرف گرتی چلی جا رہی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سسکیاں لے رہی ہے مگر کوئی اسکو سہارا دینے کے لیے اپنی عیش و عشرت کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

مایوسی و قنوطیت:

حب الدنیا و کراھیت الموت کا یہ نتیجہ نکلا کہ امت کے اندر بزدلی اور مایوسی گھر کر گئی۔ اور امت رفتہ رفتہ پستی میں چلی جا رہی ہے۔ ہمارے اسلاف تمام اقوام عالم میں شجاعت و شہامت، عزم و استقلال کے لیے مشہور تھے کیونکہ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرتے تھے۔ وقت کے آئینہ میں لوگوں نے دیکھا اور تاریخ کے صفحات میں اب بھی درج ہے کہ ایک مسلمان تن تنہا دسیوں کا اور بعض دفعہ سینکڑوں کا مقابلہ کرتا تھا مگر آج یہ موت سے ڈرتے اور چھپتے نظر آتے ہیں۔

اسلام کے دشمن اپنی قوم وملت (الکفر ملت واحدۃ) کے لیے کس طرح موت سے کھیل کر کامیابیاں حاصل کرتے جارہے ہیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ موت کو برحق جانتے ہوئے بھی موت کا خوف دل میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بطور نصیحت اس کا ذکر کردیا کہ:

وَ لَا تَهِنُوْا فِیْ ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا یَرْجُوْنَ ۞ (۷۰)

ترجمہ: "اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھارہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھارہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جسکے وہ امیدوار نہیں ہیں"۔

امت مسلمہ کے اندر ایک طرف بزدلی اور دوسری طرف مایوسی اس حد تک پھیل گئی ہے اور ان کی یہ سوچ دل میں گھر کر گئی ہے کہ وہ طاغوتی اور باطل قوتوں سے لڑ کر کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے ساتھ جنگ کرنے کا کوئی فائدہ ہے۔ اسی سوچ و فکر نے باطل طاقتوں کو مسلمانوں پر غلبہ دیا ہوا ہے۔ اس حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ ہوا کہ امت کے اندر اس ڈرپوکی و بزدلی کو چالاکی وعقلمندی سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔

یری الجنا ان الجبن خرم
و تلک خدیعة الطبع اللئیم (۷۱)

"ڈرپوک لوگ بزدلی کو عقلمندی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ کمینہ لوگوں کا ہتھیار ہے"

احساس زیاں کا ختم ہو جانا:

نبی مہربان ﷺ نے چودہ سو سال پہلے اس چیز کی نشاندہی کردی تھی کہ امت پر ایک ایسا وقت آئے گا جب اسلام کے شیرازے یکے بعد دیگرے بکھرنے لگیں گے۔ اور امت کے اندر احساس زیاں ختم ہو جائے گا اور اسے وہ جوڑنے کے بجائے بے حسی کا مظاہرہ کریں گے۔ ترغیب کی ایک حدیث بحوالہ صحیح ابن حبان، نبی ﷺ نے فرمایا:

عن ابی امامة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لتنقضن عری الاسلام عروة عروة فکلما انتقضت عروة تشبث الناس بالتی تلیها فاولهن نقضا ن الحکم و اخر هن الصلوة (۷۲)

ترجمہ: "حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (ایک وقت ایسا آئے گا کہ) اسلام کے شیرازے ایک ایک کر کے بکھرنا شروع ہونگے تو جب کوئی شیرازہ بکھرے گا تو بجائے اسکو جوڑنے کے بقیہ شیرازوں پر لوگ قناعت کر لیں گے۔ تو سب سے پہلے جو شیرازہ بکھرے گا حکومتِ عادلہ (خلافت راشدہ حکومت الٰہیہ) کا شیرازہ ہوگا۔ اور آخری بکھرنے والا شیرازہ نماز ہوگی۔"

امت مسلمہ کے زوال پذیری میں امت کے اندر سے احساسِ زیاں کا ختم ہو جانا بھی ایک اہم سبب ہے۔ جب ایک ایک کر کے شیرازۂ اسلامیہ بکھرنے لگے تو بجائے اسکو جوڑنے کے، امت کے علمبرداروں نے بقیہ کو غنیمت جان کر اسی پر قناعت کرنے لگے۔ جسکے نتیجے میں آج یہ وہی امت ہے جس کا دل غبار، آنکھیں بے نور، جس کا دماغ جامد اور بازو شل ہیں۔ اسکی زندگی کا قافلہ لٹ چکا ہے اور کوئی خبر لینے والا نہیں ہے۔ اسکے اوپر ذلت و ناکامی مسلط ہے اور کوئی آگاہ کرنے والا نہیں ہے اور وہ موت کی نیند سو رہی ہے اور کوئی جگانے والا نہیں ہے۔ وہ خواب و خیال کی دنیا میں مگن ہے اور کوئی احساس دلانے والا نہیں ہے۔

جبکہ قرآن بار بار ذکر کر رہا ہے کہ قوم نوح کیوں پستی و ذلت کا شکار ہوئی۔ قوم عاد و ثمود و قوم لوط و اصحب مدین و بنی اسرائیل ان امتوں کو اللہ تعالیٰ نے نعمت عظمیٰ عطا کی مگر اس نعمت کی قدر نہ کرنا اس کا احساس نہ رکھنا اور اس کی فرماں برداری و شکر گزاری اختیار نہ کرنے کے نتیجہ میں کس طرح زوال پذیر ہوئیں۔ وحی ربانی میں امت مسلمہ کو بار بار کہیں فاعتبروا کہیں فانظر کے ذریعے احساس دلایا جا رہا ہے کہ اپنی بصارت کے ذریعے بصیرت کو کھونے سے بچاؤ۔

دوسری امتوں کے انجام سے آگاہی کے باوجود اسی روش پر گامزن ہونا اور پلٹنے کے بجائے بے حسی کے مظاہرہ نے امت کو راندۂ درگاہ کر دیا ہے۔ اسی کا اظہار علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں کیا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا (۷۳)

فصل دہم

حکمرانوں وعلماء کی کمزوری

حکمرانوں کی کمزوری

نبی محترم ﷺ کے بعد امت نے باہمی مشورہ سے ایسی حکومت قائم کی تھی جسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرنے میں جو فرائض رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں سرانجام دیتے تھے آپ ؐ کی وفات کے بعد وہی فرائض خلیفۃ المسلمین ایک زندہ اتھارٹی کے طور پر انجام دیتے تھے۔ امت میں بگاڑ کا مرحلہ وہاں سے شروع ہوا جب خلافت کو بالائے طاق رکھ کر ملوکیت کو گلے لگایا گیا اور خلافت جو کہ ذمہ داری تھی، ملوکیت یعنی عہدے داری میں تبدیل ہوگئی اور بادشاہت کے نشے نے آپس میں اختلافات کو پروان چڑھایا اور اجتماعیت جو دراصل بقائے قوم وملت ہے، انتشار کو شکار ہوگئی۔ جب انتشار اپنے ڈیرے جمالیتی ہے تو فسادات جنم لیتے ہیں۔ یہ انتشار طاقتور اور دیندار حکمرانوں کے عہد میں دب کر رہ جاتا، جو نہ صرف اپنی مملکت کو سنوارے رکھتے، بلکہ ملک گیری میں بھی مشغول ہو جاے، اس ملک گیری کا بڑا نقص یہ تھا کہ کوئی فرماں روا" یک در گیر ومحکم گیر" کا قائل نہیں رہا، فتح وکامرانی کے جوش میں علاقے کے علاقے فتح تو کر لیتے، لیکن ان کو مالی اقتصادی، انتظامی اور حربی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مضبوط اور پائیدار بنانے کی بہت فکر نہ کرتے، جب تک ان کی شمشیر کی جہانگیری اور جہاں داری موثر رہتی، وہ علاقے ان کے زیر نگیں رہتے۔ جب یہ کمزور پڑتی یا ان کے جانشین نااہل ثابت ہوتے تو یہ علاقے ان کی حکومت سے کٹ جاتے۔

جتنے حکمران گزرے ہیں، وہ اسلام کے نمائندے بن کر حکومت کرنے کی کوشش کرتے رہے، مگر کچھ ایسے بھی ہوئے جو صاحب تقویٰ نہ تھے اور اپنے آپ کو اور اپنے احکام کو خداوند تعالیٰ کا جوابدہ نہیں سمجھتے، ان کے سامنے انکی اپنی دنیا رہی، اور اسی کو عظیم الشان بنانے کی فکر میں رہے، اسی لئے ان کے دل سے اسلام کی ہیبت جاتی رہی، جس کے بعد بعض حکمرانوں نے بڑی فاسقانہ، فاجرانہ اور مسرفانہ زندگی گزاری، جس سے حکومت اور معاشرہ دونوں کو نقصان پہنچتا رہا۔ (۷۴)

مسلمان بادشاہوں نے بھی مسلمانوں کی ضرورت کی طرف توجہ نہیں دی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں اقتدار کی جنگ اور آپس کی خونریزی سے فرصت نہ تھی۔

اگر وہ ذرا بھی توجہ دیتے، کوئی بادشاہ اپنی بنوائی ہوئی عمارتوں میں سے صرف ایک عمارت پر صرف ہونے والی رقم اگر علمی کاموں کے لئے مختص کر دیتا تو مسلمان حکماء کی تصنیف کی ہوئی تمام کتابیں عربی سے فارسی زبان میں (جو برصغیر کی علمی زبان تھی) منتقل ہو سکتی تھیں۔ (۷۵)

مگر مسلمانوں کا سرمایہ، مسلم حکمرانوں کی عیاشی و غفلت کی نذر ہو گیا۔ اور دشمن نے اپنی چالاکی سے سب کچھ مسلمانوں سے سیکھ کر یورپ منتقل کر لیا۔ علم و حکمت میں ترقی، کامیابی و منتقلی کا فریضہ سرانجام دینے کے بجائے ان چیزوں کی طرف توجہ دی گئی جس سے ان کی واہ واہ ہوتی تھی۔ لہٰذا شاعری میں قصائد نے اپنا مقام بنا لیا تھا۔

خلفاء کے عدل اور جود و سخا کے جھوٹے قصائد اور جھوٹی تعریفوں پر خلفاء اپنے نام کی بقاء کے لیے ان شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اگر یہ خلفاء تعلیمات قرآنی اور فرمان نبوی کو مدنظر رکھتے تو کبھی بھی اپنی جھوٹی تعریف تو ناممکن اپنی سچی تعریف پر بھی خوش نہ ہوتے بلکہ حمد و ثناء اس ذات کی کرتے جس نے انہیں یہ مقام عطا کیا ہے۔ مگر معاملہ یہ تھا کہ قرآن مجید کا استعمال ان خلفاء کے دربار میں عمل سے ہٹ کر صرف تقدیم و تاخیر، بحثوں اور مناظروں کی حد تک تھا۔

اگرچہ انفرادی طور پر ان میں بعض حکمران بہت سی برائیوں سے بچے ہوئے تھے۔ مگر ان میں سے بہت ساروں کے عدل و انصاف، مساوات، ہمدردی و رواداری تاریخ کی زینت ہیں۔ مگر قولی طور پر اللہ کی بندگی اور رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرنا اور عملی طور پر قوانین الٰہی سے بغاوت اور اسوۂ رسول ﷺ کو چھوڑ کر ملوکیت کی راہ اختیار کرتے ہوئے بدعات، خرافات و ظلمات کو جاری کر کے خود کو خلیفہ اور سلطان ظل اللہ کہلوانا، اسلام دشمن عناصر سے مقابلہ اور اپنوں کو سلطنت میں حصہ داری سے روکنے کے لیے قتل سے بھی دریغ نہ کرنا ایک طرح کا نفسانی دھوکا تھا۔ تاریخ الخلفاء میں الطائع باللہ ابوبکر کا ذکر ہی حکمرانوں کی حالت اور کمزوریوں کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔

۳۶۹ھ میں جب طائع باللہ نے عضد الدولہ کو اپنی حکومت کا مختار کل بنا دیا اور اس کے القاب میں تاج الملت کا اضافہ کر دیا تو طائع ایک تخت پر بیٹھا سو آدمی تلواریں لے کر اس کے گرد اردلی میں کھڑے ہوئے۔ پوری زینت کی گئی سامنے خود حضرت عثمان کا لکھا ہوا قرآن شریف رکھا چادر شریف مونڈھے پر ڈالی، عصا ہاتھ میں لیا اور جناب رسول اللہ ﷺ کی تلوار حمائل کی گئی، عضد الدولہ کے بھیجے ہوئے پردے ڈال دیئے گئے تاکہ کوئی لشکر کا آدمی عضد الدولہ سے قبل طائع کو نہ دیکھ سکے۔ ترک اور دیلمی خالی ہاتھ بغیر ہتھیار لگائے ہوئے داخل ہوئے دونوں طرف روسا اور اعیان سلطنت کھڑے ہوئے اس کے بعد عضد الدولہ کی طلبی ہوئی، پردے اٹھا دئے گئے۔

عضد الدولہ نے زمین خدمت چومی اور سر دلدن لشکر زیادتی افواج کو دیکھ کر ڈر گیا طائع نے یہ دیکھ کر کہا کیوں جھجکے کیوں ہو؟ کیا خدا کی شان نظر نہیں آتی؟ عضد الدولہ نے کہا واقعی آپ خلیفہ اللہ فی الارض ہیں۔ پھر آگے بڑھا اور سات مرتبہ زمین کو بوسہ دیا۔ طائع نے کہا آگے آؤ۔ عضد الدولہ اور آگے بڑھا اور دو مرتبہ زمین چومی۔ پھر طائع نے کہا اور زیادہ قریب آؤ، عضد الدولہ آگے بڑھا اور طائع کی قدم بوسی ادا کی۔ طائع نے کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا مگر عضد الدولہ کی ہمت نہ ہوئی طائع نے باصرار کہا اور عضد الدولہ انکار کرتا رہا۔ آخر کار طائع نے قسم دی اور عضد الدولہ کو جرات ہوئی۔ اول اس نے کرسی کو بوسہ دیا پھر اس پر بیٹھ گیا۔ اس بت پرستی کو دیکھ کر عضد الدولہ کا ایک افسر جو اس کے ساتھ تھا بول اٹھا کہ کیا یہ خدا ہے جو اس طرح تعظیم بجالاتے ہو عضد الدولہ نے کہا کہ ہاں یہ خدا کا خلیفہ ہے...... علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ:

۳۹۶ھ میں حاکم نے مصر اور حرمین شریفین میں حکم دیا کہ جس جگہ میرا نام لیا جائے بازار ہو یا جلسہ عام سننے والا ادب اور تعظیم کے لئے کھڑا ہو جایا کرے اور سجدہ کیا کرے........ اسلامی خلافت کے دور میں مسلمانوں کا اپنے ہی جیسے مسلمان خلیفہ و سلطان کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے کے واقعات آج مسلمانوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں لیکن خود ہندوستان میں شاہان کے درباروں میں شہنشاہ جہانگیر کے زمانے تک علماء کی منظوری سے سجدہ تعظیمی ادا ہوتا رہا جس کے خلاف شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو کافی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ خدا کو رب العالمین اور شہنشاہ کہہ کر پکارنے والے اپنے لئے وہ القابات وخطابات استعمال کرتے تھے جو اسلامی نقطہ نظر سے نہ صرف ناجائز بلکہ شرک و کفر کے مترادف ہیں۔ مثال کے طور پر ہم خلیفہ سلیمان خان ثانی ۹۲۶ھ تا ۹۳۰ھ کے اس خط کے ابتدائی القاب کو پیش کرتے ہیں جو موصوف نے ماہ ربیع الثانی ۹۳۰ھ میں شاہ فرانس کو ارسال کیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

میں سلطانوں کا سلطان، خاقانوں کی برہان، بادشاہوں کو تاج پہنانے والا اور زمین پر سایہ الٰہی سلطان بحر ابیض و بحر اسود وانا طولیہ........ وغیرہ وغیرہ و دیگر ممالک کثیرہ جن کو میرے محترم آباء ذی عظمت اجداد ان اللہ براھیم نے اپنی قوت قاہرہ سے فتح کیا تھا اور بہت سے اور شہر جن کو میری عظمت کے بازو نے نصرت شمشیر سے فتح کیا میں ہوں۔ (۷۶) یزید بن عبد الملک اور ولید بن یزید کا نشے میں مست رہنا، مہدی و ہادی کی رنگین مزاجی، امین کی عیش پرستی اور اس کے علاوہ شاہان مغلیہ کی غیر اسلامی رسومات و بدعات اظہر من الشمس ہیں۔ بابر و جہانگیر اپنی عیش کوشی اور شراب نوشی کی محفلوں کا ذکر بانگ دہل کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۱۲۴ھ کو بہادر شاہ اول مرض ہیضہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا اور اس کے نالائق بیٹے محمد معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے تین بھائیوں کو ٹھکانے لگا کر تخت طاؤس پر اپنے قدم جمائے۔ وہ اپنے جلو میں فلاکت و نکبت کو لئے ہوئے آیا اور اس نے رزم کے ہنگاموں سے بچ کر بزمِ نشاط کو آراستہ کیا۔ اس کے آتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا کہ شمشیر و سناں کا دور ختم ہو چکا ہے اور طاؤس و رباب کا زمانہ آ گیا ہے۔ مؤلف تاریخ راحت افزا نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

" ..... بادشاہے بود کہ ہمیشہ بہ عیش و عشرت اشتغال نمودہ پروائے امور ملکی و مالی نہ داشت واختیار خود بہ لعل کنور کنچنی دادہ بود..... وکلاونت و قوالان در عمل آن بادشاہ عیش دست گاہ بہ مناصب سہ ہزاری و چہار ہزاری عروج کردند"

ترجمہ: وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جو ہمیشہ عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا اور جس کو ملکی و مالی امور کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے خود کو لعل کنور کنچنی کے اختیار میں دے رکھا تھا..... کلاونت اور قوال اس عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے فرماں روا کے دور حکومت میں سہ ہزاری اور چار ہزاری کے منصب پر فائز تھے۔ اس بادشاہ عیش دوست کے زمانے میں ذہین و متین اور عالم و فاضل لوگ دربار سے خارج کر دیئے گئے اور ان کی جگہ مغنیوں، بھانڈوں اور مسخروں نے لے لی (۷۷)

یہ مختصر ذکر ملوکیت پرور غیر اسلامی نظام پر قائم حکمرانوں کی ایک جھلک ہے۔ جب حکمرانوں کا یہ حال ہو تو پھر دشمن طاقتوں نے جو کچھ کیا وہ تو ہونا ہی تھا۔

علماء کی کمزوری:

امت مسلمہ کے زوال کی ایک اہم وجہ علماء کی کمزوری بھی ہے۔ علماء جو کہ دین کی سربلندی کے لیے حق گوئی کے علمبردار ہوتے ہیں اور جیسا کہ انہوں نے پہلے وقتوں میں جب بھی حکمران وقت نے غلط فیصلہ کیا اور رعایا پر ظلم کیا تو یہ علماء حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مثال کے طور پر جب عبدالملک نے اپنی زندگی میں اپنے دو بیٹوں کو یکے بعد دیگرے جانشین بنانا چاہا تو مشہور تابعی سعید بن مسیبؒ نے مخالفت کی اور قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں اور کوڑے کھائے۔ حجاج نے جب بصرہ اور کوفہ کے نو مسلموں پر جزیہ لگایا تو علماء نے شدید مخالفت کی اور جب عبدالرحمن ابن اشعثؒ نے حجاج کے مظالم کے خلاف بغاوت کی اور امر بالمعروف کا علم بلند کیا تو علماء کی بڑی تعداد نے جن میں سعید بن جبیرؒ، ابراہیم نخعیؒ اور شعبیؒ جیسے بزرگ شامل تھے، عبدالرحمنؒ کا ساتھ دیا۔

اس حق پسندی کی وجہ سے سعید بن جبیرؒ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس بغاوت کے سلسلے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام شعبیؒ جیسے ان علماء نے بھی جو حکومت سے تعاون کرتے تھے باغیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس طرح جب ہشام کے زمانہ میں حضرت زید بن علی نے استبدادی نظام کا تختہ پلٹنا چاہا تو امام ابوحنیفہؒ نے ان کی تائید کی۔

بنی امیہ کی حکومت سے متعلق علماء کے طرزِ عمل کا اس دور کے دو مشہور اہل علم کے اقوال سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ مدینہ کے عالم سعیدؒ بن مسیب کہا کرتے تھے:

"بنی مروان انسانوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں"۔

اور بصرہ کے مشہور عالم امام حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کہ:

"اس زمانہ کے امراء کی تلواریں، ہماری زبانوں سے آگے بڑھ گئی ہیں جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہمیں تلوار سے جواب دیتے ہیں"۔ (۷۸) اس کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام غزالیؒ، ابن حزمؒ، عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ احمد سرہندیؒ، امام شاہ ولی اللہؒ وغیرہ حق بات کہنے اور اصلاح کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

مگر جب کوئی قوم اپنے مقصدِ حیات سے لاپرواہ ہو جائے تو اس کا کردار لایعنی چیزوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ قوم محض لفظی تنازعات، ظنی مقدمات اور جزئیات کے بحث و مباحثہ میں منہمک ہو جاتی ہے۔

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفہ ذات و صفات (۷۹)

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو متشابہات میں پڑنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ نہ ہی وہ دین کی بنیاد ہیں اور نہ وہ اس عقدہ کو حل کر سکتے ہیں۔

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّاالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ج وَما یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ o (۸۰)

ترجمہ: "اے پیغمبر وہی (حی وقیوم ذات) ہے جس نے تم پر الکتاب نازل فرمائی ہے اس میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے یعنی ایسی آیتوں کی جو اپنے ایک ہی معنی میں اٹل اور ظاہر ہیں اور وہ کتاب کی اصل واساس ہیں۔ دوسری قسم متشابہات کی ہے (یعنی ایسی آیتوں کی جو ملتے جلتے معانی کا احتمال رکھتی ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے (اور سیدھے طریقے پر بات نہیں سمجھ سکتے) وہ محکم آیتیں چھوڑ کر ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو کتاب اللہ میں متشابہ ہیں اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کرلیں۔ حالانکہ ان کی حقیقت تو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔"

اسی طرح قیامت وروح کے بارے میں اتنا مختصر و جامع جواب دے کر یہ بتا دیا گیا ہے کہ اس میں کھوج لگانے اور بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۖ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ (۸۱)

ترجمہ: "(اے پیغمبر) لوگ تم سے قیامت کے آنے والے وقت کی نسبت پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کب قرار پائے گا۔ تم کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے پروردگار کو ہے۔"

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۸۲)

ترجمہ: "(اے نبی ﷺ) وہ آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہہ دیجیے روح میرے رب کا حکم ہے۔"

لیکن اتنی واضح ہدایات کے باوجود علماء وحکماء اسلام نے غیر ضروری مسائل، آیات متشابہات کی تشریح اور ایمانیاتی مسائل میں وحی، حقیقت روح، عذاب قبر، مسئلہ جبر وقدر وغیرہ پر نہ صرف تصنیفات کے انبار لگا دیے بلکہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اسی پر خرچ کرتے رہے۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلائل و بحث کی بنیاد پر فرقے در فرقے وجود میں آنے لگے۔ چھٹی صدی ہجری میں خاص بغداد اور دمشق میں حنبلیوں اور شافعیوں اور حنفیوں اور شافعیوں کی دشمنی ایک دوسرے سے اس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ کھلم کھلا آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں، بلوے ہوتے تھے اور ہزاروں مسلمان عوام کا خون ناحق علماء کی فرقہ بندیوں کی نذر ہوتا تھا..... مولانا آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" میں اس غم انگیز داستان کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:

"اسلام کا مؤرخ کبھی اس واقعہ کے ماتم سے فارغ نہیں ہو سکتا کہ تا تاریوں کی ابتدائی تاخت اور آخری تاخت، یہ دونوں کا باعث خود مسلمانوں کی فرقہ بندی اور ان کی جاہلی عصبیت ہوئی۔ یعنی بربادی کا پہلا دروازہ حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی جدال سے کھلا، اور بربادی کی آخری تکمیل یعنی بغداد کا قتل عام سنیوں اور شیعوں کے اختلاف کا نتیجہ تھا۔ چنگیز خاں نے وسط ایشیا کا بالائی علاقہ خوارزم تک (یعنی خیوا تک) فتح کر لیا تھا لیکن اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکا تھا۔ بعد کو جب اس کے پوتوں میں سلطنت تقسیم ہوئی تو وسط ایشیاء اور اس کے ملحقات ہلا کو خاں کے زیر حکومت آگئے لیکن اسے بھی آگے بڑھنے کی جرات نہیں ہوئی۔ کیونکہ اسلامی مملکتوں کی شش صد سالہ عظمت کا رعب ابھی تک دلوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ مگر اس اثناء میں ایک اچانک واقعہ پیش آگیا جس نے خود بخود ہلا کو کے آگے فتح و تسخیر کی راہیں کھول دیں۔ خراساں میں حنفیوں اور شافعیوں میں باہمی جنگ و جدال کا بازار گرم تھا۔ اس لیے حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آکر ہلا کو کو حملہ کی دعوت دی اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ پھر جب تا تاریوں کی تلوار چمک گئی تو اس نے نہ حنفیوں کو چھوڑا نہ شافعیوں کو۔ دونوں کا خاتمہ کر دیا..... اس کے علاوہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی ان کی بناء پر اب خواص و فقہاء ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے اور جس گروہ کو حکومت میں زیادہ دخل ہوا اس نے دوسرے کو قید خانوں اور جلا وطنیوں کی مصیبت تک پہنچا کر چھوڑا۔ عوام کا فتنہ اسی زمانے میں اس درجہ تک پہنچا جہاں آج نظر آ رہا ہے۔ شریعت کے اعتقاد و عمل کی ساری بادشاہی انہی کے ہاتھ ہے۔ جو بات چاہیں علماء سے کہلوا دیں"۔ (۸۳)

عثمانیوں کی تاریخ وارثت کا یہ ایک دلچسپ باب ہے کہ فوج جس بادشاہ کو معزول کرنا چاہتی ہے مفتی اعظم کا فتوئی ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ابراہیم کے عزل کا اعلان بھی مفتی اعظم عبدالعزیز آفندی نے اس طرح سنایا:

"تیسرے بادشاہ علماء کے اور مخصوص ارا کین حکومت کے فیصلوں کی رو سے آپ کو معزول کیا جاتا ہے"۔

ابراہیم کو دس روز قید میں رکھنے کے بعد اس کا قتل ضروری سمجھا گیا۔ قتل کے لیے مفتی کے فتوے کی ضرورت تھی لہٰذا اس طرح مفتی اعظم سے استفتاء کیا گیا:

"کیا ایسے حکمران کو معزول اور قتل کرنا جائز ہے جو حکومت کے عہدے ان لوگوں کو تفویض نہیں کرتا جو اہل قلم اور اہل شمشیر ہیں اور ان عہدوں کی قابلیت ان میں ہے بلکہ ان کو دیتا ہے جو ان کو قیمتاً خریدتے ہیں"۔ مفتی نے اس کا جواب "ہاں" میں دیا۔ مفتی اعظم نے اپنے اس فتوے کو فقہ کے اس جذبے پر مبنی قرار دیا کہ: "اگر ایک حکومت میں دو خلیفہ ہوں تو ایک کو قتل کر دو"۔

علماء کی مدد سے فوج کی دست درازیاں برابر جاری رہیں اور ترکی سلاطین یکے بعد دیگرے معزول اور تخت نشین ہوتے رہے۔(۸۴)

ہر دور میں ایسے لوگوں کا ٹولہ موجود رہا ہے جس کا مطمع نظر "پہلے اپنا مفاد" ہوتا ہے اور وہ ٹولہ مسلمانوں کے علماء میں سے ہو تو پھر امت کی آبیاری کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔اس طرح کے علماء سوء اپنے مفاد کے لیے نئی نئی اصطلاحات و توجیہات کے پیرائے میں اپنے قول کو صادق قرار دینے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ پھر اسلام کو بطور دین لینے کے بجائے مذہب کے طور پر لیا جاتا ہے۔اور مذہب (عبادات) کی آزادی کو اسلام کی آزادی سے تعبیر کیا جانے لگتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے بہت ہی بہترین انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد (۸۵)

حواشی وحوالہ جات (باب سوم)

(۱) القرآن (۳:۸۳)

(۲) ایضاً (۴:۶۰)

(۳) ایضاً (۲۵-۵۳:۲۳)

(۴) ایضاً (۴:۶۵)

(۵) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص:۵۹

(۶) الخطیب العمری، امام ولی الدین محمد بن عبداللہ: "مشکوٰۃ شریف"، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

(۷) ایضاً (محولہ بالا)

(۸) اقبال، علامہ: "کلیات اقبال "نویدا ے شیخ، لاہور، ص: ۱۸۸

(۹) القرآن (۸:۳۱)

(۱۰) ایضاً (۱۴:۱۰)

(۱۱) ایضاً (۳۳:۴)

(۱۲) ایضاً (۴۹:۱۰)

(۱۳) ایضاً (۳:۱۰۳)

(۱۴) نعمانی، شبلی، علامہ: "سیرۃ النبیؐ" آرمی بک کلب، راولپنڈی، ۱۹۷۹ء، ج:۲، ص:۱۲۰

(۱۵) صباح الدین، عبدالرحمٰن، سید: "مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص:۲۴-۲۲

(۱۶) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۳۰-۲۷

(۱۷) سندھی،عبیداللہ:"الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن" مکتبہ اوراق،لاہور،۲۰۰۵ء،ص:۴۹۶

(۱۸) اقبال،علامہ:" کلیات اقبال "نویدا ے شیخ،لاہور،ص:۱۸۶

(۱۹) طحان،مصطفےٰ محمد:"معتدل اسلامی فکر" مکتبہ المصباح،لاہور،۲۰۰۸ء،ص:۸۰

(۲۰) الخطیب العمری،امام ولی الدین محمد بن عبداللہ:"مشکوٰۃ شریف"،مکتبہ رحمانیہ،لاہور،باب ما نھی عنہ من التھاجر والتقاطع واتباع العورات

(۲۱) عبدالوحید خان:"مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس،لاہور،۱۹۹۶ء، ص:۲۲۵-۲۲۴

(۲۲) صباح الدین،عبدالرحمٰن،سید:"مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام،کراچی، ۱۹۹۴ء،ص:۳۲

(۲۳) عبدالوحید خان:"مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس،لاہور،۱۹۹۶ء، ص:۲۲۹-۲۲۷

(۲۴) صباح الدین،عبدالرحمٰن،سید:"مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام،کراچی، ۱۹۹۴ء،ص:۳۳

(۲۵) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۳۶

(۲۶) ایضاً (محولہ بالا)،ص:۳۵-۳۴

(۲۷) اکبر آبادی،سعید احمد،مولانا:"مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ،کراچی،۱۹۴۷ء،ص:۱۴۴-۱۴۳

(۲۸) محمد اسد،علامہ:"ملت اسلامیہ دوراہے پر" دارالسلام،لاہور،۲۰۰۴ء،ص:۸۱

(۲۹) عبدالوحید خان:"مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس،لاہور،۱۹۹۶ء، ص:۲۳۳-۲۳۱

(۳۰) صباح الدین،عبدالرحمٰن،سید:"مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام،کراچی، ۱۹۹۴ء،ص: ۳۶-۳۵

(۳۱) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص: ۸۵
(۳۲) محمد اسد، علامہ: "ملت اسلامیہ دوراہے پر" دارالسلام، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۸۱
(۳۳) القرآن (۳:۱۱۰)
(۳۴) ایضاً (۹:۷۵)
(۳۵) ایضاً (۱۱:۱۱۷)
(۳۶) بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل: "صحیح بخاری" نور محمد کارخانہ کتب، کراچی، ۱۹۶۱ء، ج: ۱، باب قرعۃ فی المشکلات
(۳۷) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید: "اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات" اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۳۲۸
(۳۸) محمد نوح، سید، ڈاکٹر: "تیس دروس احادیث" مکتبہ اسلامی، راولپنڈی، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۱۵
(۳۹) القرآن (۳-۱:۴۷)
(۴۰) ایضاً (۴۷:۵۷)
(۴۱) ایضاً (۸۷:۵)
(۴۲) بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل: "صحیح بخاری" نور محمد کارخانہ، کراچی، ۱۹۶۱ء، ج: ۱، باب الترغیب فی النکاح
(۴۳) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۴۸۱-۴۸۰
(۴۴) ابن خلدون، عبدالرحمٰن، علامہ: "مقدمہ ابن خلدون" الفیصل ناشران و تاجران، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۴۴۸-۴۴۷
(۴۵) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۱، ص: ۳۷۸
(۴۶) ایضاً (محولہ بالا)، ج: ۲، ص: ۳۵۸
(۴۷) جرمانوس، عبدالکریم، ڈاکٹر: "مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب" محمد مسعود پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۰۶-۱۰۴

(۴۸) شکیب ارسلان، علامہ: "اسباب زوال امت" دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص:۴۲

(۴۹) اقبالؒ، علامہ: "ضرب کلیم" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص:۷۶

(۵۰) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۲، ص:۳۵۸

(۵۱) اقبالؒ، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص:۵۴

(۵۲) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید: "قوموں کے عروج وزوال پر علمی تحقیقات کے اثرات" ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۵۷-۵۶

(۵۳) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۶۰

(۵۴) القرآن (۸:۶۰)

(۵۵) ایضاً (۲۹:۶۹)

(۵۶) ندوی، ابوالحسن علی، سید: "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص:۱۸۷

(۵۷) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۶۴-۱۶۳

(۵۸) الدہلوی، شاہ ولی اللہ: "حجۃ اللہ البالغہ" دارالاشاعت، کراچی، ص:۲۴۷

(۵۹) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۳۸۲-۳۸۱

(۶۰) الدہلوی، شاہ ولی اللہ: "حجۃ اللہ البالغہ" دارالاشاعت، کراچی، ص:۲۳۴

(۶۱) الخطیب العمری، امام ولی الدین محمد بن عبداللہ: "مشکوٰۃ شریف"، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، باب الشفقۃ و الرحم علی الخلق

(۶۲) صباح الدین، عبدالرحمٰن، سید: "مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص:۷۵-۷۲

(۶۳) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۴۹

(۶۴) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید: "قوموں کے عروج وزوال پر علمی تحقیقات کے اثرات" ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۶۰

(۶۵) ندوی، محمد شہاب الدین: "اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۷۰-۱۶۹

(۶۶) ترمذی، ابوعیسی محمد ابن عیسی: "جامع ترمذی" مکتبہ قدیمی کتب خانہ، کراچی، باب صفۃ القیامۃ

(۶۷) ندوی، ابوالحسن علی، سید: "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص: ۱۴۲

(۶۸) محمد اسد، علامہ: "ملت اسلامیہ دوراہے پر" دارالسلام، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۳-۳۱

(۶۹) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث: "سنن ابی داؤد" مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۹۵۲ء، باب: فداعی الامام علی الاسلام

(۷۰) القرآن (۴:۱۰۴)

(۷۱) شکیب ارسلان، علامہ: "اسباب زوال امت" دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۵

(۷۲) ندوی، جلیل احسن، مولانا: "زادراہ" اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص: ۴۴

(۷۳) اقبال، علامہ: "کلیات اقبال "نویدا ے شیخ، لاہور، ص: ۱۷۳

(۷۴) صباح الدین، عبدالرحمٰن، سید: "مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص: ۳۲-۳۱

(۷۵) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص: ۸۵

(۷۶) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۳۵-۲۳۴

(۷۷) صدیقی، ثناء الحق: "زوال سلطنت مغلیہ "ادارہ دانش وحکمت، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۶-۲۵

(۷۸) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۶۸-۱۶۷

(۷۹) اقبال، علامہ: "ضرب کلیم" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ٦٦

(۸۰) القرآن (۷:۳)

(۸۱) ایضاً (۷:۱۸۷)

(۸۲) ایضاً (۸۵-۱۷)

(۸۳) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹٦ء، ص: ۳۹۴-۳۹۳

(۸۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۴۵-۱۴۴

(۸۵) اقبال، علامہ: "ضرب کلیم" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۳۰

باب چہارم

یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے اثرات

فصل اوّل : احیاءِ علم و مادی ترقی

فصل دوم : یورپی نشاۃ ثانیہ ایجادات وفتوحات

فصل سوم : یورپی نشاۃ ثانیہ کے فکری و مادی مفسدات

باب چہارم

یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے اثرات

فصل اول

احیاء علم و مادی ترقی

مسلمانوں کے علم کی یورپ منتقلی:

اگرچہ مسلمانوں نے یونانی، رومی اور ہندی تمدن و تفکرات سے کافی اثرات قبول کیے تھے مگر عربی تراجم و تحقیق سے ان قدیم علوم کو جو مردہ ہو چکے تھے، ازسرِنو زندہ کیا۔ اور ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو سب پر حاوی ہو گئی اور گذشتہ تہذیبوں کے لیے توحید کو جھٹلانا ممکن نہ رہا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم کے اثرات و غلبہ کی ایسی بہترین مثال ناممکن ہے۔
دورِ جدید کی علمی ترقیاں ہرگز اس نہج پر نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ جب تک اسپین کے راستے مسلمانوں کے علوم یورپ تک نہ پہنچتے۔

تاریک یورپ کے مقابلے پر اسی یورپ کے دو ملکوں، اسپین اور سسلی میں علم کی ترویج و ترقی اور فلکیات، طبیعات، فطری علوم اور طب وغیرہ کے ساتھ ایک ترقی پسندانہ طرزِ عمل نے جو مسلم حکماء کی سرگرمیوں کی وجہ سے ان جگہوں پر پیدا ہو گیا تھا، دو ڈھائی صدیوں کے بعد آخر کار اہلِ یورپ کو ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ سب سے پہلے خود اسپین کے خانقاہی پادریوں اور راہبوں نے ان علوم کی طرف توجہ دی۔ بشپ ربی بن زید نے دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جدید نجوم (Astrology) کی تعلیم حاصل کی اور عربی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی۔ بشپ آٹو آف وچ (Bishop Atto of Vich) نامی پادری نے اسی صدی کے نصف آخر میں مسلم ریاضی میں مہارت حاصل کی..... لاطینی ہندسوں کے ذریعہ صرف گنتیاں لکھی جا سکتی تھیں۔ جمع، تفریق اور ضرب و تقسیم ممکن نہ تھی۔ لہٰذا عربی ہندسوں کی ترویج کی وجہ سے ریاضی میں جو عظیم الشان ترقی رونما ہوئی وہ تمثیلاً اسی قسم کی تھی جیسی آج کی قلمی ریاضی کے مقابلے پر کمپیوٹر کی ریاضی نے دکھائی ہے۔ جربرٹ کے بعد (Pedro Alfonso) نامی ایک شخص نے اسپین جا کر طب اور فلکیات وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

اس نے فلکیات پر ایک کتاب بھی لکھی اور مسلمان جغرافیہ دانوں کی کتابوں کی مدد سے دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا۔ وہ بعد میں انگلستان کے بادشاہ ہنری اول کا طبیب مقرر رہا جس کے بعد اس نے مسلم طب کو انگلستان میں متعارف کرایا۔

مسلم علوم کی تحصیل کا شوق جب بہت بڑھا اور اس کے فوائد بھی نظر آنے لگے تو ان علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا کیونکہ یورپ میں بڑے پیمانے پر ان کی ترویج اپنی زبانوں میں ان علوم کی منتقلی کے ذریعہ ہی عمل میں آسکتی تھی۔ ہر شخص کے لئے اسپین جا کر تعلیم حاصل کرنا یا عربی سیکھ کر ان علوم میں دسترس حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے متعدد مقامات پر کلیسا اور عیسائی بادشاہوں کی امداد و انتظام میں دار التراجمے قائم کئے گئے۔ دو دار التراجمے خود اسپین میں قائم کئے گئے۔ ایک طیطلہ (Toledo) میں اور دوسرا اشبیلیہ (Seville) میں۔ طیطلہ کا دار الترجمہ ۱۱۳۵ء میں بادشاہ ریمنڈ اول کی امداد و اعانت سے قائم ہوا۔ یہ ایک عظیم الشان دار الترجمہ تھا کیونکہ اس میں ترجمے کے لئے ماہرین لسانیات کی بہت بڑی ٹیم مامور کی گئی تھی۔ یہاں جملہ مروجہ علوم جیسے فلکیات، ریاضی، طبیعات، کیمیا، نجوم اور طب وغیرہ کی کتابوں کا عربی سے لاطینی، اسپینی، عبرانی اور Castilian زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا رہا۔(۱) اسی طرح تراجم کے لیے ۱۲۵۲ء میں دوسرا بڑا دار الترجمہ اسپین کے شہر اشبیلیہ میں بادشاہ الفانسو دہم نے میں قائم کیا تھا۔ اور یہاں عیسائیوں کی نسبت یہودی مترجمین زیادہ تھے۔

تیسرا دار الترجمہ اٹلی کے ایک ساحلی شہر سالرنو Salerno کے ایک اسکول میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اسکول ۶۰۰ء سے قائم تھا۔ بعد میں گیارہویں بارہویں صدی میں اس میں دار الترجمہ قائم کر دیا گیا۔ یہاں زیادہ تر طب کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ آگے چل کر اس اسکول کو میڈیکل اسکول بنا دیا گیا۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ طب کی جو کتابیں ترجمہ کی جاتیں وہ یہاں کے میڈیکل اسکول میں داخل نصاب کر دی جاتیں۔ گویا تراجم کا سب سے فوری فائدہ اسی ادارے نے حاصل کیا۔ مسلمان حکماء کی جو کتابیں ترجمے کے بعد یہاں داخل نصاب ہوئیں، ان میں ابن سینا کی قانون طب، قاسم زہراوی کی التصریف، زکریا رازی کی الحاوی، ابن رشد کی کلیا، ابن زہر کی التیسیر Al-Toiseer قابل ذکر ہیں۔(۲) مسلمانوں کی اس علمی و تحقیقی خدمات کو سراہتے ہوئے متعدد مستشرقین نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں نے یورپ کو حیات نو بخشنے میں سرانجام دیئے۔ اپنی کتاب "تشکیل انسانیت" میں بریفالٹ لکھتا ہے:

"یورپ کی حیات ثانیہ عربوں کی وجہ سے ہوئی۔ یورپ کی حیات نو کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ سپین تھا۔ جس وقت یورپ جہالت و بربریت کے تاریک ترین گڑھوں میں گرا ہوا تھا۔ اس وقت بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور طلیطلہ سے وہ تہذیب اور زندگی نمودار ہو رہی تھی۔

جس نے بعد میں انسانی ارتقاء کو اک نئی صورت دی" یہی فاضل ذرا آگے چل کر لکھتا ہے:

"اگر عرب نہ ہوتے تو عصرِ رواں کی مغربی تہذیب جنم ہی نہ لیتی۔۔۔۔ یورپی نشو ونما کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کا یقینی سراغ نہ مل سکے۔۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں نے کوئی کاپرنیکی یا نیوٹن پیدا نہیں کیا۔ لیکن عربوں کے بغیر کاپرنیکی یا نیوٹن پیدا ہونا ناممکن تھا"۔۔۔۔۔ "معرکہ مذہب وسائنس" میں ڈاکٹر ڈریپر فرماتے ہیں:

"قرونِ وسطیٰ میں سائنس کی ترقی مسلمانوں کی بدولت تھی۔ اس وقت عیسائی دنیا پر جہل واوہام کی تاریکی محیط تھی اور انہیں علمی مشاغل کی ہوا تک نہیں لگی تھی"۔ اسی طرح "میراث اسلام" میں پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے:

"عربی کتابوں کے سینکڑوں تراجم یورپ کی بربادزمین پر بارش بن کر برسے اور مختلف شعبہ ہائے علم نے انگڑائی لی"۔ (۳)

جب ان حکماء کی کتابوں کے تراجم مقبولِ عام ہوئے تو پھر ان کی شرحیں لکھی جانے لگی زکریا رازی کی کتاب "المنصوری" کی کم سے کم نو شرحیں لکھی گئیں۔ قانونِ طب کی بارہ شرحیں لکھی گئیں۔ پھر ان کتابوں سے اخذ واستفادہ کر کے کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ڈاکٹر قدوائی کے ایک جائزے کے مطابق ابنِ سینا کی تصانیف سے کم سے کم چون کتابوں میں اخذ و استفادہ کیا گیا زکریا رازی کی کتابوں سے انتیس مصنفین نے قاسم زہراوی سے تیرہ نے، علی ابن عباس المجوسی سے بارہ نے اور ابن رشد کی تصنیف سے نو مصنفین نے اخذ واستفادہ کیا۔ (۴)

مسلم حکماء کے دستیاب لٹریچر کے تراجم کا یہ کام تین سو سال سے زیادہ عرصے تک ہوتا رہا۔ یہ کام دسویں صدی عیسوی کے وسط میں شروع ہوا تھا اور تیرہویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔ دنیا کی کسی قوم کے لٹریچر کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لئے تین صدیاں صرف کرنے کی نظیر دنیا نے پہلے شائد کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس سے ان تصانیف کی قدر و قیمت اور ان کی تعداد کی بہتات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔ تراجم کے بعد کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حالانکہ یورپ کے کلیسائی نظام میں کلیسا کی چاردیواری سے باہر اشاعت علم اور تحصیل علم صدیوں سے اجنبی تصور تھا۔ کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کا شوق مسلم اسپین کی یونیورسٹیوں کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ سب سے پہلے ۱۱۵۸ء میں بادشاہ فریڈرک اول کے حکم سے Bologna میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی۔ چونکہ بادشاہان کلیسا کے تابع تھے اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ فریڈرک اول نے یونیورسٹی قائم کرنے کا کلیسا کی منظوری سے جاری کیا ہوگا۔ پھر ۱۲۱۲ء میں اسپین کے شہر ویلنیشیا (Valencia) میں اور ۱۲۳۰ء میں سلمانکا اور مرسیا میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

۱۲۳۰ء فرانس کے شہر Toulose میں، ۱۳۰۶ء میں اسی ملک کے شہر Orleans میں، ۱۲۱۲ء میں اٹلی کے شہر پیڈوا میں، ۱۲۲۴ء میں اور ۱۲۴۴ء میں اسی ملک کے دوشہروں نیپلز اور روم میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ انگلستان کے اندر ۱۲۶۶ء میں Balliol اور ۱۲۸۴ء میں Peter House کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ پرتگال کے اندر ۱۲۹۰ء میں لشبونا (Lisbona) میں اور ۱۳۰۰ء میں Coitember میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے یورپ میں مزید یونیورسٹیاں قائم ہوتی گئیں۔ ان میں سے بہت سی یونیورسٹیوں میں عربی زبان بھی ذریعہ تعلیم رہی۔ پوپ کی جانب سے قائم کردہ تعلیمی کاؤنسل نے ۱۳۱۲ء میں اپنے ایک فیصلے کے تحت آکسفورڈ، سلمانکا، پیرس اور وائنا کی یونیورسٹیوں میں عربی داخل نصاب کی۔

مسلم حکماء کی تصانیف کی یورپی زبانوں میں منتقل کردینے اور کلیسا کی چہاردیواری سے باہر کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے سے یورپ میں ہر سو علم کی روشنی پھیل گئی اور یورپ آٹھ سو سالہ طویل دور تاریکی سے باہر نکل آیا، جس میں کلیسائی نظام نے پانچویں صدی عیسوی میں اسے مقید کر رکھا تھا۔ اسی کو یورپ میں احیائے علم کی تحریک کہا جاتا ہے۔ احیائے علم سے اہل یورپ کو بھی وہ تمام قسم کے فوائد حاصل ہونے لگے جو اس کی وجہ سے قبل ازیں مسلمانوں کو حاصل ہو چکے تھے۔ اسی احیائے علم کا نام یورپی نشاہ ثانیہ (Renaissance) ہے۔(۵)

فصل دوم

یورپی نشاۃ ثانیہ ایجادات وفتوحات

یورپی نشاۃ ثانیہ (ایجادات)

یورپ میں علم کے احیاء کے اس شوق نے تین چار صدیوں کے اندر اندر کلیسائیت، یونانیت اور نظام شہنشاہیت کی جڑیں اکھاڑ دیں اور اکثر ملکوں میں تو اس نظام کا مکمل طور پر خاتمہ ہی ہو گیا۔ بالآخر یورپی عوام نے علم اور اہل علم کے ساتھ کلیسا کی تنگ نظری سے قطع تعلق کرتے ہوئے کلیسا کو علم اور ترقی پسندی کا دشمن سمجھنے لگے۔ یورپی نشاۃ ثانیہ نے اہل یورپ میں تحقیق وتسخیر کی راہ کو ہموار کر دیا۔

احیائے علم نے یورپ میں مادی ترقیوں کا دروازہ کھول دیا۔ یہی ترقیاں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہلاتی ہیں۔ کیونکہ یونان اور روم کے زوال کے ہزار بارہ سو سال بعد یورپ کو نئی زندگی ملی تھی۔ یورپ کا علمی زوال روم میں کلیسائیت کے عروج کے ساتھ شروع ہوا تھا اب اس کا پھر سے عروج کلیسائیت کے زوال کے ساتھ شروع ہوا۔

علم کے احیاء کا پہلا ثمرہ یورپ کو بارود (Gun powder) کی ایجاد کی صورت میں ملا۔ یہ ایجاد جیسا کہ بعض مصنفین کا کہنا ہے، ممکن ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں عمل میں آئی ہو مگر اس کا فائدہ سب سے پہلے اہل یورپ نے حاصل کیا۔ انہوں نے بارود سے بندوقیں اور توپ بنائے۔ یہ اسلحے جنگ میں اب تک استعمال ہونے والے تیر وتلوار اور نیزہ و بھالا سے بدرجہا بہتر و مؤثر تھے۔ لہٰذا ان بارودی اسلحوں نے تیر وتلوار اور نیزہ و بھالا پر فیصلہ کن برتری حاصل کر لی۔ اس کا فائدہ یورپ کو یہ ہوا کہ بعد میں وہ جہاں جہاں بھی گئے، بڑی آسانی سے فتوحات حاصل کر لیں۔ امریکہ، کناڈا، برصغیر پاک و ہند، ملائشیا، برما، انڈونیشیا، آسٹریلیا وغیرہ اسی طرح سے ان کے زیر نگیں آئے۔ احیائے علم کے ساتھ جو مادی ترقیاں شروع ہوئیں ان کے نتیجے میں سب سے پہلے یورپ میں مشینیں ایجاد ہوئیں۔ کپڑے بننے کی مشین، کپڑے سینے کی مشین، تیل پیلنے کی مشین وغیرہ۔ یعنی جو کام اب تک ہاتھ سے لئے جاتے رہے تھے، وہ مشینوں کے ذریعہ انجام پانے لگے۔ اس لئے کارکنوں کی کارکردگی بڑھ گئی اور کارخانوں کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ پیداوار بڑھی تو نئی منڈیوں کی جستجو ہوئی۔ اس جستجو میں اہل یورپ سمندری راستے سے باہر نکلے۔ افریقہ پہنچے، ایشیا آئے، برصغیر پاک و ہند، برما، ملایا، انڈونیشیا اور چین تک پہنچے۔ انہیں اپنی منڈیاں بنا لیا۔

اپنا مال لا کر جمع کرنے اور اندرون ملک سپلائی کرنے کے لئے تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔اس طرح رفتہ رفتہ اپنے اثرات میں اضافہ کیا۔ پھر سیاسی اثرات قائم کئے، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی تک ان میں سے بہت سے ملکوں پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرلیا۔ برصغیر اسی طریقے پر ان کی غلامی میں گیا۔ برما، ملایا اور انڈونیشیا پر بھی اسی طریقے سے اہل یورپ نے قبضہ جمایا اور چین پر بھی ان کا جتنا کچھ سیاسی اثر قائم ہوا وہ ان کی صنعتی اور تجارتی ترقی کے ہی ذریعہ قائم ہوا۔اسی دوران انہوں نے ۱۴۹۲ء میں کولمبس کے ذریعہ امریکہ دریافت کیا اور اس نئے براعظم پر اپنی بستی بسائی۔

مشینی دور کے آغاز کے اتنے سارے فائدے یورپ کو پہنچے مگر اتنے پر ہی بس نہ ہوا۔ مزید تھوڑے عرصے کے بعد ۱۷۶۵ء میں انگلستان میں بھاپ انجن (Steam Engine) ایجاد ہو گیا جسے جیمز وائٹ (James Watt 1736 - 1819) نامی ایک شخص نے ایجاد کیا۔ یہ توانائی کا بہت بڑا ذریعہ بنا۔اب تک یورپ کے صنعتی کارخانوں کی مشینیں ہاتھ سے چلائی جاتی تھیں۔ان مشینوں کے لئے توانائی کی بہم رسانی کا ذریعہ دست و بازو تھا مگر اب بھاپ انجن بن گیا۔ کارخانے اب بھاپ انجن سے چلائے جانے لگے اس سے صنعتی پیداوار اتنی بڑھ گئی کہ پیداوار میں یہ اضافہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کہلایا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے بیرون ملک ان کی تجارتی سرگرمیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔(۶) ان ایجادات نے یورپ کے اندر مادیت کے حصول کا وہ ذوق پیدا کیا کہ انہوں نے بھاپ انجن کو نہ صرف صنعتی یونٹ میں استعمال کیا بلکہ اسے بحری جہاز کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ دستی اسلحے کی جگہ انہوں نے بارودی طاقت کو استعمال میں لاتے ہوئے دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی طرف پیش قدمی کی۔

یورپی نشاۃ ثانیہ (فتوحات)

جب یورپ نے مادی ترقی میں اپنا لوہا منوالیا تو اب ان کے لیے سب سے اہم بات اپنی غیر معمولی پیداوار و مصنوعات کی فروخت کے لیے منڈیوں کی تلاش ٹھہری۔ لہٰذا اس کے لیے انہوں نے ایشیا، برصغیر پاک و ہند، انڈونیشیا، برما و ملایا وغیرہ پہنچے اور پھر وہاں پر اپنے قدم جمانے لگے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ملک میں ان کو تجارتی مسافر کے طور پر ٹھکانہ فراہم کیا، ان لوگوں نے انہی کو اپنے ملک و وطن سے بے ٹھکانہ کر کے ان کی سرزمین پر قبضہ کرلیا۔ اور مادی طاقت و قوت کے نشے میں حقوق کے علمبرداروں نے، امن کے دعویداروں نے دنیا کو اپنی مٹھی میں لینے کے لیے انسانیت کے حقوق چھینتے ہوئے، امن وسکون تباہ کرتے ہوئے انسانیت پر مظالم کا وہ سلسلہ شروع کیا تھا جو آج تک جاری ہے۔

۱۷۵۷ء سراج الدولہ کے خلاف جنگ:

۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں نواب بنگال کا انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق مرحوم کا پوتا سراج الدولہ ۲۵ سال کی عمر میں اس کا جانشین ہوا۔ سراج الدولہ نہایت بیدار مغز اور ہوشیار نواب تھا۔ اس نے یہ محسوس کرلیا کہ انگریز تجارت کے لئے ہندوستان میں آئے تھے لیکن اب وہ آہستہ آہستہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اگر صورت حال یہی رہی تو ایک وقت آسکتا ہے کہ انگریز پورے ملک پر قابض ہو جائیں، اس بنا پر اس نے انگریزوں کی مطلق العنانی کو روکنا چاہا۔ انگریز اسے کب برداشت کر سکتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ہوئی شروع میں ہی انگریز بری طرح پامال و پسپا ہوئے۔ لیکن اب انتقام لینے کے لیے انگریزوں کی طرف سے باقاعدہ تیاریاں ہوئیں۔ لارڈ کلائیو کے ماتحت ایک فوج ساز و سامان کے ساتھ ہندوستان روانہ کر دی گئی۔ کلائیو کے ساتھ شاہی بحری دستہ بھی تھا جس کی کمان امیر البحر وٹسن کر رہا تھا، یہ فوج دسمبر میں کلکتہ پہنچی اور یہاں اترتے ہی اپنی تمام نو آبادیات واپس لے لیں۔ سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ یہ جنگ اس درجہ لرزہ خیز تھی کہ جو قیامت کا نمونہ سراج الدولہ کی فوج میں قائم ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگوں کے دل قابو سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ آخر کار صلح ہو گئی لیکن انگریز کب چین سے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے سراج الدولہ کے خلاف بعض نامور امرائے دربار جن میں میر جعفر قائد افواج خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کو نواب کے خلاف سازش کرنے پر اکسا دیا اور اومی چند نامی ایک شخص کی وساطت سے انگریزوں اور ان غدار امیروں میں معاملات طے ہونے لگے۔ (۷) جب معاملات طے ہو گئے تو غداروں کی اس ٹولی کے سردار میر جعفر نے کلائیو کو اطلاع کی۔

ایواس (IVAS) لکھتا ہے:

"۱۲ جون کو میر جعفر اور دیگر غداروں نے اطلاع دی: وہ سب کام درست ہو چکے ہیں، قرعہ ٹھیک پڑے گا اور ۱۳ جون کو تمام فوج نے کوچ کیا۔

۲۳ جون کو بھاگیرتی ندی کے کنارے موضع پلاسی میں جنگ ہوئی تو نواب کی فوج کا بڑا حصہ جو میر جعفر، درلب رام اور یار لطف خاں کی زیر کمان تھا عین وقت پر علیحدہ ہو گئے اور صرف مہاراجہ موہن لال، میر مدن اور فرانسیسی افسر سان فریز مع تھوڑی سی فوج کے ساتھ رہ گئے۔ مگر اس تھوڑی سی فوج نے بھی کلائیو کی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ میر مدن اور موہن لال انگریزی توپ خانے کے قریب جا پہنچے۔ انگریزی فوجیں پسپا ہونے لگیں اور ایک آموں کے باغ میں پناہ لی۔ کلائیو یہ دیکھ کہ میر جعفر کے نمائندے پر برس پڑا: "تمھارے آقا نے کہا تھا کہ فوج اور سپہ سالا سب سراج الدولہ سے بگڑ گئے ہیں اور لڑائی شروع ہوتے ہی اس کا کام تمام کر دیں گے مگر مجھے تو اس کے برعکس نظر آتا ہے"۔

بدقسمتی سے اس دن سخت بارش ہوئی جس سے نواب کا تمام بارود بیکار ہوگیا۔ پھر بھی حملہ جاری رہا۔ لیکن عین اس وقت کہ جب بہادر میر مدن انگریزوں کے سر پر پہنچ چکا تھا ایک گولے سے زخمی ہو کر شہید ہو گیا۔ میر مدن کی شہادت نے نواب کو دل شکستہ کر دیا۔ شام ہو چکی تھی مگر بہادر موہن لال برابر موت کی طرح انگریزوں کے سر پر مسلط تھا اور قریب تھا کہ قسمت کا فیصلہ ہو جائے کہ غدار میر جعفر نے اسی وقت سراج الدولہ کو یقین دلایا کہ صبح کو وہ جنگ شروع کرے گا اس اس وقت فوج کو واپس بلا لیا جائے۔ دوسری طرف انگریزوں کو حملہ جاری رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔ (۸) پلاسی کی جنگ کے بعد اب انگریزوں نے میر جعفر کو اس کی نمک حرامی کا انعام یہ دیا کہ سراج الدولہ کی جگہ اس کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نواب بنا دیا۔ اس کے بعد میر جعفر نے نواب سراج الدولہ کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا..... لیکن بدبخت میر جعفر کی انتقام کی پیاس پھر بھی نہ بجھی اور اس نے مقتول نواب کی لاش کو ایک ہاتھی کے ہودج پر سوار کرا کر تمام شہر مرشد آباد میں گشت کرایا۔

جعفر از بنگال وصادق از دکن

ننگ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن! (۹)

۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے برصغیر میں سب سے پہلی بڑی کامیابی سراج الدولہ کے خلاف جنگ پلاسی میں حاصل کی۔ پلاسی کی لڑائی ہندوستان کی فیصلہ کن لڑائی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں۔

سراج الدولہ جیسے جیالے اور بہادر حکمران کو وہ صرف اس وجہ سے شکست دینے میں کامیاب ہو سکے کہ سامان جنگ میں انگریزوں کو فیصلہ کن برتری اور اپنوں کی غداری شامل حال تھی۔ اس جنگ میں کامیابی کے چند سال بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں نے بنگال کے سابق نواب میر قاسم اور نواب اودھ کو شکست دے کر الہ آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔

۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ:

سلطان فتح علی خاں جو تاریخ عالم میں ٹیپو سلطان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سن پیدائش میں مؤرخین کو اختلاف ہے۔ خود سلطان نے اپنی پیدائش کی تاریخ ۲۰ طلوعی لکھی ہے۔ اس حساب سے یہ تاریخ ۲۱ دسمبر ۱۷۵۱ء ہوتی ہے۔ (۱۰)۔ وہ والی میسور حیدر علی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

حیدر علی ریست میسور کی فوج میں رسالدار تھے۔ وہ بہت ہوشیار اور ذہین تھے انہوں نے رفتہ رفتہ قوت وطاقت حال کر کے ریاست کے حاکم بن گئے۔ اس وقت جنوبی ہند کی عجیب حالت تھی۔ سلطان اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد یہاں مغلوں کا رعب اور دبدبہ ختم ہو چکا تھا۔ مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا تھا، اور اپنی حکومت کو بڑھانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

ادھر نظام حیدر آباد بھی اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کی فکر میں تھا۔ ان کے علاوہ ایک نئی قوم بھی اس صورت حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ یہ نئی قوم انگریز تھی۔ جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے جنوبی ہند کے بعض علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی طاقت کو بہت بڑھا لیا تھا۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ سارے ملک پر قبضہ کر لیں۔ حیدر علی کی دور اندیش نگاہوں نے اس وقت اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بڑا سمجھدار تھا۔ اور چاہتا تھا کہ انگریزوں کی ہر چال کو ناکام بنا دے اور انہیں یہاں سے باہر نکال کر پھر اسلامی سلطنت قائم کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسے انگریزوں سے کئی بار لڑنا پڑا۔ (۱۱)

حیدر علی اپنی آخری سانس تک وطن دشمنوں سے جنگ کرتے رہے اور اس کے بعد ٹیپو سلطان نے اس جنگ کو جاری رکھا۔ ریاست میسور کا صدر مقام سرنگا پٹم چہار جانب سے زبردست حملہ آور فوجوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان افواج میں انگریزوں مرہٹوں اور نظام کی فوجیں شامل تھیں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے سہ فریقی معاہدہ کے تحت ان کی متحدہ افواج نے میسور پر حملہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے تو معاہدہ شکنی کی تھی۔ سلطان ٹیپو اس متحدہ افواج سے تن تنہا نمٹنے کے لئے کافی تھا، لیکن اس کی ریاست اور فوج کے اہم منصب داروں کی غداری نے اسے پیچھے ہٹ کر اپنے دار السلطنت سرنگا پٹم کے دفاع پر مجبور کیا۔ انگریزوں نے میسور کے اہم منصب داروں سے سازش کر کے اور انہیں جاہ و منزلت کے سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور سرنگا پٹم پر حملے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ منصوبہ کے مطابق اس دن غدار میر صادق نے جو ریاست کا وزیر اعظم تھا، فوجیوں کو تنخواہ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ٹھیک اس وقت جب میسور کے سپاہی تنخواہ لینے میں مصروف تھے۔ انگریزوں نے قلعہ کے مقرر کردہ حصہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ محافظ دستہ لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ اور سلطان کے مایہ ناز جانباز عبد الغفار نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ اس طرح اتحادی فوج سرنگا پٹم کے قلعہ میں داخل ہو گئی۔ سلطان اس وقت دوپہر کا خاصہ تناول کر رہا تھا۔ جب اسے اپنے اہم منصب داروں کی غداری اور اتحادی فوج کی قلعہ میں داخلے کی خبر ہوئی تو کھانے کو چھوڑ کر تلوار ہاتھ میں لے کر وہ قلعہ کے اس جانب لپکا۔ جہاں میسور کے سپاہی اتحادی فوجوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہاں وہ کافی دیر تک دست بدست جنگ کرتا رہا۔ اس دوران اسے انگریزوں کا باجگزار بننے کی پیش کش کی گئی۔ لیکن شیر دل سلطان نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا، اور اس نے جو جواب دیا وہ جرأت اور بہادری کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس نے کہا:

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ (۱۲)

تاریخ نے ایک بار پھر جنگِ پلاسی کا ڈرامہ سرزمین میسور پر دہرایا، میر جعفر اور ولب رام کی روحیں میر صادق اور پورنیا کی شکل میں نمودار ہو گئیں۔

اورپطن حیدرو فاطمہ (سلطان ٹیپو کی والدہ) سے جنم لینے والے مردِ مجاہد نے تن تنہا ان سب کا مقابلہ کرتے ہوئے ۴مئی ۱۷۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا، سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کا چراغ گل ہوگیا اور اب دشمنانِ وطن کو للکارنے والا مجاہد کوئی باقی نہ رہا تو وہ فرطِ مسرت سے چلا اٹھے کہ ...... "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔(۱۳) انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دے کر برصغیر میں دوسری بڑی کامیابی حاصل کی۔اس بے مثال جری و بہادر حکمران کے خلاف بھی انہیں کامیابی اسلحہ کی برتری اور اپنوں کی غداری کے ذریعے حاصل ہوئی۔اس طرح جنوبی ہند بھی ان کے ہاتھ آ گیا۔اور آہستہ آہستہ پورے برصغیر میں ان کا سیاسی اثر قائم ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی:

ایک غیر قوم نے ہندوستان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک پر تسلط جمانے کا موقع حاصل کر لیا تھا۔وہ ہندوستان کی دولت کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے سمیٹ کر انگلستان بھیجنے میں مستعدی کے ساتھ مشغول تھی اور اس کی نخوت و دعوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ ہندو، مسلمان کے مذہب کا احترام اس کے دلوں سے اٹھ گیا تھا۔ ہندوستان کے قانونی رئیس اور بادشاہ کی حیثیت سے بہادر شاہ کا فرض تھا نافرمانوں کو سزا دینا اور ناخواندہ مہمانوں کو ملک بدر کرنا۔اس لیے جس وقت ہندوستانی سپاہیوں نے کمپنی کے خلاف قدم اٹھایا، دہلی کے بادشاہ نے حق شناسی کا ثبوت دیا۔لیکن ہندوستان کی قسمت میں ابھی غلامی لکھی تھی۔تحریک ناکام یاب رہی اور ہندوستان غیروں کی حکومت سے آزاد نہ ہوسکا۔(۱۴)

اگر چہ اہل ہند نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو آخری ملک گیر جنگ لڑی اسے بھی وہ صرف اسی وجہ سے ہار گئے کہ ان کے اندر قومیت کے جذبے کا فقدان، سائنس و جدید بارودی اسلحہ و تکنیک کی کمی تھی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کا انگریزوں نے مسلمانوں سے بڑا سخت انتقام لیا۔دہلی میں ان کے محلے کے محلے اجاڑ دیئے اور ان کی جگہ ہندوؤں کو بسا دیا۔اس کے بعد انہوں نے تحریک مجاہدین کے خلاف کاروائی کی۔پٹنہ کے محلے صادق پور کے گھروں کو ڈھا کر زمینوں پر ہل چلا دیا۔اس لیے کہ ان کا تعلق ان مجاہدین سے تھا جو بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد سرحد کے پہاڑوں میں رہ کر ابھی تک انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے۔۱۸۶۴ء میں انبالہ میں مجاہدین پر مقدمہ چلایا گیا۔ہزاروں مسلمان کالا پانی بھیج دیئے گئے اور بے شمار علماء کو پھانسی دے دی گئی۔مسلمانوں کی جاگیریں چھین لی گئیں اور ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں مسلمان ہندوستان میں سب سے جاہل اور سب سے غریب ہوگئے۔(۱۵)

ریڈانڈین جنگ:

۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو کولمبس اپنے قیاف کے مطابق ایشیاء کے مشرقی ساحل پر لنگر انداز ہوا جبکہ حقیقتاً وہ شمالی امریکہ کے جزائر بہاماس (غرب الہند) میں آنکلا تھا...... گواناہانی میں ساحل پر قدم رکھتے ہی کولمبس کو جو چیز سب سے پہلے نظر آئی وہ وہاں کے مقامی باشندے آراواک قبائل کے امریکن انڈین تھے جو ریڈ انڈین کہلائے گئے۔ (گواناہانی اور اس کے قرب و جوا کے جزائر اب سان سالویڈور کے نام سے جانے جاتے ہیں) اراواک قبائل کے ان ریڈ انڈینز کا رویہ دوستانہ اور طور طریقے مختلف تھے۔ کولمبس نے اس امر کے باوجود کہ ان جزیروں میں پہلے سے ہی لوگ آباد ہیں اور وہ اپنے قاعدے قانون، رسم و رواج، مذہب اور ثقافت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں ان جزیروں پر سپین کی شاہی حکومت کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ اس علاقے کو سان سالویڈور کے نئے نام سے منسوب کیا اور مقامی آبادی کو "انڈیز" کہا گیا۔ مقامی لوگوں سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں کولمبس نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

"..... یہ لوگ سادہ، جفاکش اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ تو ہتھیاروں کے استعمال کا علم ہے نہ ہی یہ کسی ہتھیار سے مسلح ہوتے ہیں جب میں نے اپنی تلوار ان لوگوں کو دکھائی تو بیشتر نے اپنی انگلیوں اور ہاتھوں کو تیز دھار تلوار سے زخمی کر لیا۔ یہاں پر ابھی تک لوہے کا استعمال شروع نہیں ہوا ہے ان کے تیر کمان لکڑی، گنا اور بانس سے بنے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ بہترین خدمت گار اور اچھے غلام ثابت ہوں گے۔ ہم صرف پچاس لوگوں کی مدد سے تمام مقامی آبادی پر غلبہ حاصل کر کے انہیں با آسانی غلام بنا سکتے ہیں۔ (۱۶)

اس طرح سے اہل یورپ نے اپنی نشاۃ ثانیہ کے ذریعے جو مادی طاقت حاصل کی تھی اس میں سے بارودی اسلحے کے ذریعہ ایشیاء کے دوسرے خطوں پر قبضہ کیا۔ اسی طرح سے انہوں نے امریکہ کے سرخ ہندیوں (Red Indians) کے خلاف طویل جنگ جیتنے میں کامیاب ہوئے ورنہ یہ ناممکن تھا کہ یہ یورپ سے نکل کر آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ لیں گے۔

اسرائیل کا قیام و یہودی مقاصد:

فلسطین جو نبیوں کی سرزمین اور مسجد اقصیٰ جو مسلمانوں کا قبلہ اول ہے، مسلم امہ کے لیے بالخصوص بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عربوں کے دور میں فلسطین بھی علاقہ شام کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ سلاجقہ کے زوال کے بعد بارہویں اور تیرہویں صدی میں یہ خطہ ڈیڑھ سو سال تک مسلم اور عیسائی جنگ کا مرکز بنا رہا۔

اور حطین کے میدان جنگ میں صلاح الدین نے صلیبیوں کو شکست دے کر بیت المقدس کو آزاد کر دیا۔ جنگ عظیم اول سے پہلے فلسطین بھی لبنان اور اردن کی طرح عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ اگر چہ جنرل الینی نے اعلان کیا تھا کہ آج سے صلیبی جنگوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ یہ دھوکہ تھا۔ بارہویں صدی کی طرح سرزمین فلسطین آج بھی اسی طرح حق و باطل کی رزم گاہ بنا ہوا ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے موقع پر ترکوں کے خلاف عربوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے برطانیہ نے عربوں کو دھوکا دینے کے لیے آزاد عرب مملکت قائم کرنے کا جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ لیکن یہ وعدہ صرف ایک سیاسی مصلحت تھی اور پس پشت برطانیہ اور فرانس نے عرب علاقے آپس میں تقسیم کر لینے کا ایک خفیہ معاہدہ بھی کر رکھا تھا۔ اور دوسری طرف برطانیہ نے یہودی سرمایہ داروں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۱۹۱۷ء میں ایک خفیہ معاہدہ کیا جو اعلان بالفور (Balfour) کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں برطانیہ نے فلسطین کے یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔

صیہونی تحریک:

فلسطین میں یہودیوں کی واپسی کی خواہش نے ایک تحریک کو جنم دیا جو صیہونی تحریک کہلاتی ہے۔ صیہونیت سے مراد وہ تحریک ہے جس کا مقصود یہودیوں کی منتشر قوم کے لئے فلسطین میں ایک وطن کا قیام تھا۔ "اسرائیل" کی ریاست قائم ہو جانے کے بعد صیہونی تحریک کی اہمیت کم نہ ہوئی بلکہ دنیا بھر کے صیہونیوں سے مزید یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ اسرائیل کی تعمیر و استحکام کے لئے ضروری وسائل مہیا کریں۔ اپنے قیام کے وقت یہ یہودی ریاست ایک "عبوری ریاست" تھی۔ دنیا بھر کے یہودی اسے مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے پوری سرگرمی سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ صیہونیت ایک جامع اصطلاح ہے جس میں اس قسم کی تمام کارروائیاں آ جاتی ہیں۔ جیسا کہ یہودیوں کے پروٹوکول سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہودی تمام دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لئے صیہونیت کا مفہوم یہود کے عزائم سے گہرا رابطہ رکھتا ہے۔ (۱۷)

اسرائیل کا قیام:

اعلان بالفور جو کہ ایک خفیہ معاہدہ تھا اور یہودی سرمایہ داروں سے کیا گیا تھا۔ عرب اس معاہدے سے ۱۹۲۰ء تک بے خبر رہے لیکن جب اعلان بالفور شائع کر دیا گیا تو عربوں میں ہلچل مچ گئی۔

یورپ کے یہودیوں نے فلسطین میں انیسویں صدی ہی سے دوبارہ آباد ہونا شروع کر دیا تھا اور اس مسلسل نقل مکانی کے نتیجے میں ۱۹۱۴ء تک اسی ہزار یہودی فلسطین میں آباد ہو چکے تھے۔

برطانوی انقلاب کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی عام اجازت مل گئی۔ یہودیوں نے بڑی بڑی رقمیں دے کر غریب عرب کاشتکاروں سے وسیع پیمانے پر زمینیں خریدنا شروع کر دیں، چنانچہ ۱۹۳۱ء تک ۲۹ فی صد عرب اپنی زمینوں سے محروم ہو چکے تھے اور ۱۹۳۶ء تک یہودیوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی..... یہودیوں کی اس کھلی جارحانہ کاروائیوں اور برطانوی سرپرستی کی وجہ سے عربوں اور یہودیوں کے تعلقات روز بروز بگڑتے گئے اور دونوں قوموں میں مسلح تصادم ہونے لگے۔ جن کا سلسلہ ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔

لیکن عربوں اور یہودیوں کی یہ جنگ برابر کی جنگ نہیں تھی۔ اس جنگ میں یہودیوں کو عربوں پر بہت بڑی برتری حاصل تھی۔ اول یہ کہ یہودی آبادکار زیادہ تر یورپ سے آئے تھے۔ ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، ماہر سائنس دان اور دولت مند موجود تھے جبکہ عرب غریب، کم حیثیت اور بے بس تھے۔ دنیا کا پورا یہودی ساہوکارہ ان کی پشت پر تھا جس کی وجہ سے ان کے پاس سرمائے کی کمی نہیں تھی..... ۱۹۳۸ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے باقاعدہ تقسیم کی تجویز پیش کر دی اور اس طرح اس نے یہودیوں کے موقف کی کھل کر حمایت کر دی..... اس دوران میں برطانوی فوجوں کی فلسطین سے واپسی شروع ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہودیوں اور عربوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہو گئے یہودیوں نے اپنے علاقوں کی عرب اقلیت پر بے پناہ ظلم وستم توڑے جس کی وجہ سے ان عربوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بے خانماں ہونے والے عربوں کی تعداد جلد ہی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ عرب پوری طرح مسلح یہودی دستوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء تک اندرون فلسطین عربوں کی مزاحمت ختم ہوگئی۔ ۱۴ اور ۱۵ مئی کی درمیانی شب کو ۱۲ بجے برطانوی انتداب بھی ختم ہو گیا، اور اسی شب یہودیوں نے شہر تل ابیب میں اسرائیل کی نئی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ (۱۸) اردن کے تربیت یافتہ مجاہدوں نے وسطی فلسطین کے بیشتر حصہ اور بیت المقدس (یروشلم) کے قدیم شہر کو یہودیوں کے قبضے میں جانے سے بچالیا۔ اس دوران میں سلامتی کونسل کے حکم پر ۱۱ جون ۱۹۴۸ء کو طرفین نے جنگ بند کر دی۔ اس کے بعد جنگ شروع اور بند ہوتی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں عرب ملکوں کو اسرائیل سے علیٰحدہ علیٰحدہ جنگ بندی کے معاہدے کرنا پڑے اور اسرائیل کے وجود کو عملاً تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔

اسرائیل کے وجود میں آتے ہی، یہودی لیڈروں نے ان علاقوں پر اپنا حق جتانا شروع کر دیا۔ جنہیں وہ اسرائیل کی تاریخی حدود کہتے ہیں۔ ۱۳ اگست ۱۹۵۱ء میں یروشلم میں یہودیوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔

اس میں اس مسئلہ پر خاص طور پر بحث کی گئی، اور فلسطین کے نمائندوں نے کانفرنس پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسلان کر کے صیہونی اسرائیل کو تمام یہودیوں کے لئے ایک پناہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "اس مجوزہ تاریخی ریاست کی حدود کیا ہیں؟"۔

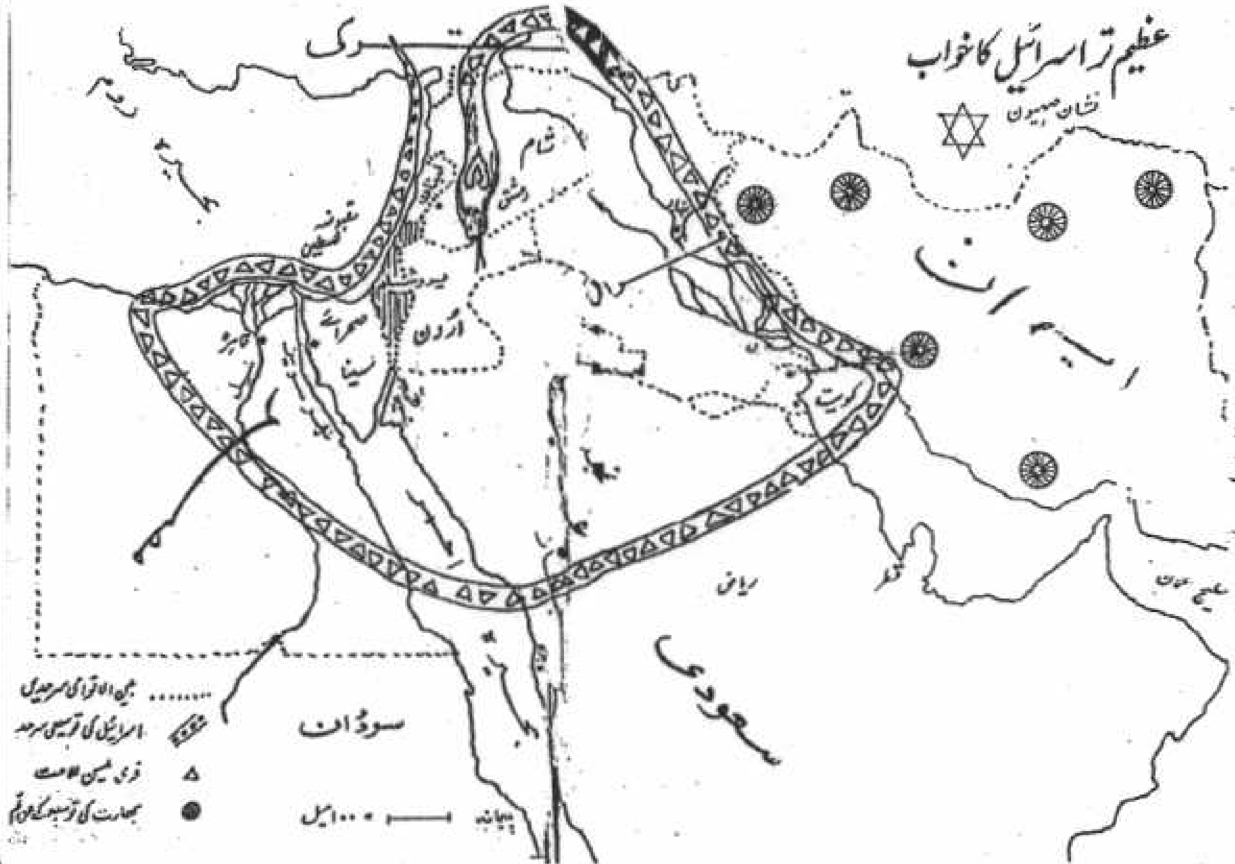
ڈاکٹر آری آک مین (Dr Arye Alkman) نے ۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو یروشلم میں ایک تقریر کرتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا:

"ایک عظیم تر اسرائیل ہی، جو عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہو۔ ایک ایسی طاقت ور ریاست ہو سکتی ہے مشرق وسطی میں اندرونی اور بیرونی حسن کی ضمانت دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو واضح الفاظ میں یہ بتا دیں کہ دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین میں جمع کرنے سے اسرائیلی حکومت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسرائیل کی سرحدیں وسیع کی جائیں۔ جو عراق سے لے کر سویز تک پھیلی ہوئی ہوں۔ صرف ایسی صورت میں اسرائیل مشرق وسطی میں جمہوریت کا ایک مضبوط حصار بن سکتا ہے اور اس پوزیشن میں ہوگا کہ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کر سکے"۔

یہودیوں کا نصب العین اور نعرہ یہ ہے۔

اسرائیلیو! تمہاری سرحدیں یوفریٹس سے لے کر نیل تک ہیں"۔ (۱۹)

یہودی اپنے مغربی اور اشتراکی سرپرستوں کی مدد سے اپنے ان جارحانہ عزائم کو یکے بعد دیگرے پورے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر حملہ کیا تو اسرائیل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۲۹ اکتوبر کو مصر پر حملہ کر دیا اور ایک ہفتے کے اندر اندر پورے جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا..... ۱۹۵۶ء کی جنگ کے بعد مصر کو روس نے وسیع پیمانے پر فوجی امداد فراہم کی جس کی وجہ سے صدر ناصر مصر کی فوجی طاقت اور روس کی حمایت کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، اور انہوں نے اسرائیل کو مٹانے کے لیے بلند بانگ دعوے کرنا شروع کر دیے۔ جس کی وجہ سے اسرائیل اور مصر کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ صدر ناصر کے مطالبے پر ۱۹ مئی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج بھی واپس بلا لی گئی، مصریوں نے غازہ کے علاقے اور شرم الشیخ کی بلندی پر قبضہ کر لیا اور آبنائے طیران کے راستے اسرائیلی جہازوں کی آمد و رفت بند کر دی۔ اس دوران میں اسرائیل امریکہ اور مغربی ملکوں کی امداد سے بہت مضبوط ہو چکا تھا اور وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ تمام عرب ملکوں کے خلاف فوجی کاروائی کر سکے چنانچہ ۵ فروری ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے اچانک مصر پر حملہ کر دیا اور پہلے ہی وار میں مصر کا ہوائی بیڑہ تباہ کر دیا۔


عظیم تر اسرائیل کا خواب
نشان صیہون
ترکی
ایران
شام
دمشق
اردن
صحرائے سینا
ریاض
سعودی
سوڈان
بین الاقوامی سرحدیں
اسرائیل کی توسیعی سرحد
پیمانہ
۱۰۰۰ میل


اس کے بعد چھ دن کے اندر اندر اسرائیلی فوجوں نے ایک بار پھر جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کرلیا، اور وہ نہر سویز کے کنارے تک پہنچ گئیں اور شرم الشیخ پر قبضہ کر کے آبنائے طیران کا راستہ اسرائیلی بحری جہازوں کے لیے کھول دیا، اسی دوران میں اسرائیلی فوجوں نے بیت المقدس اور فلسطین کے اس حصے پر بھی قبضہ کرلیا جو اردن کے قبضہ میں تھا اس کے بعد اسرائیلی فوجیں شام کے اندر بھی داخل ہوگئیں اور جولان کی پہاڑیوں تک ایک وسیع علاقہ پر قبضہ کرلیا، اس جنگ میں روس عرب دوستی کا یہ حال تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی کی رات روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ اسرائیل کی طرف سے کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیلی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ صرف پانچ ہزار تین سو مربع میل تھا۔ اور اس کی حدود میں پانچ لاکھ یہودی اور پانچ لاکھ چھ ہزار عرب آباد تھے۔ اب یہ رقبہ ساڑھے تینتیس ہزار مربع میل ہوگیا جو اصل فلسطین کے رقبے سے بھی جو دس ہزار مربع میل تھا تین گنے سے زیادہ ہے اگر ہم اسرائیل کے پہلے نقشے کو دیکھیں تو وہ چاقو کی طرح نظر آئے گا لیکن ۱۹۶۷ء میں یہ چاقو قصاب کی چاپڑ میں تبدیل ہوگیا۔

۱۹ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجد اقصیٰ میں آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا جس میں سلطان صلاح الدین کا بنوایا ہوا تاریخی منبر بھی جل گیا۔ اس واقعہ نے پوری اسلامی دنیا میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی اور اس حادثہ کو مسجد اقصیٰ دھانے کی دیواروں کے قریب ہیکل سلیمانی کے آثار معلوم کرنے کے لیے کھدائی شروع کی تو ان شبہات کو اور تقویت پیدا ہوگئی کہ یہودی مسجد اقصیٰ کو کسی نہ کسی بہانے سے گرا کر اس کی جگہ ہیکل سلیمانی از سر نو تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کا نقشہ بھی یہودی انجینیئروں نے تیار کرلیا ہے۔ (۲۰) فلسطین کو تقسیم کر کے اسرائیل کو قائم کرنا دنیا کی تاریخ کا انتہائی مکروہ اور سیاہ باب ہے۔ یہ ایک ایسا افسوسناک پہلو ہے کہ مغربی ملکوں اور روس نے قیام اسرائیل کے ذریعے نہ صرف اپنے ناپاک عزائم کو پروان چڑھایا بلکہ ایسے ظلم کی بناء ڈالی جو انسانیت سوز ہیں۔

فصل سوم

یورپی نشاۃ ثانیہ کے فکری و مادی مفسدات

فکری جائزہ:

انسان اور مشین دو الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں کی افادیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔ مگر بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اعتدال سے دوری اختیار کی جائے۔ یہی کچھ یورپی نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں ہوا۔ کیونکہ جب دولت اور طاقت کو سرمایہ حیات قرار دے دیا جائے اور اسی بنیاد پر زندگی کے تمام معاملات، اخلاقیات و اعتقادات کو پرکھا جائے تو پھر وہ کچھ ظہور پذیر ہوگا جس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے فوائد و برکات کا کوئی صاحب فہم و فراست ذرہ برابر انکار نہیں کر سکتا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات سے بھی کسی حقیقت پسند انسان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے بعد دنیا والوں کو بہت دکھ سہنے، بڑی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں اور عظمت انسانیت کو پامال کیا گیا۔ ان تکالیف کے پیش نظر حقیقت پسندانہ نظریہ یہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے مادی و فکری سطح پر بنی نوع انسان کو جو زخم لگائے وہ اس قدر گہرے ہیں کہ آج بھی اس زخم سے لہو رس رہا ہے اور انسانیت کراہ رہی ہے۔

مادی مفسدات:

یورپی نشاۃ ثانیہ اگرچہ ظاہری اعتبار سے برا نہ تھا بلکہ ایک ایسا انقلاب تھا جس نے ترقی کے دروازوں کو نہ صرف کھول دیا تھا بلکہ آسان زندگی کا پیش خیمہ نظر آتا تھا، کیونکہ علمی و مادی دونوں اعتبار سے ترقیاں اظہر من الشمس تھیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ اس مشینی دریافت نے مالداروں، کارخانہ داروں اور ٹھیکیداروں کو عظمت انسان سے دور کر دیا تھا اور وہ ان مزدوروں کو اپنے مال و زر میں اضافہ کے لیے مشین کا پرزہ سمجھ کر استعمال کرنے لگے اور یہی وہ باب تھا جس میں انسان کے بجائے سرمایہ سب کچھ سمجھا جانے لگا تھا اس فکر نے جبر و مشقت میں وہ تاریخ رقم کی جو نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کا ہولناک باب بن گیا ہے۔

Let us consider cotton, which was the most important example of early industrialization. In the Lancashire cotton mills (from which Marx and Engels derived their livelihood), children worked from twelve to sixteen hours a day; they often began working at the age of six or seven.

Children had to be beaten to keep them from falling asleep while at work; in spite of this, many failed to keep awake and rolled into the machinery, by which they were mutilated or killed. Parents had to submit to the infliction of these atrocities upon their children, because they themselves were in a desperate plight. Handicraftsmen had been thrown out of work by the machines; rural labourers were compelled to migrate to the towns by the Enclosure Acts, which used Parliament to make landowners richer by making peasants destitute; trade unions were illegal until 1824; the government employed agents provocateurs to try to get revolutionary sentiments out of wageearners, who were then deported or hanged. Such was the first effect of machinery in England. Meanwhile the effects in the United States had been equally disastrous. (21)

برٹرینڈ رسل نے یہاں یہی بات کہی ہے کہ دولت مندوں نے زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے صورتحال ایسی کردی کے مزدوروں کو طلوع آفتاب سے قبل کارخانے میں حاضر ہونا پڑتا اور رات گئے انہیں چھٹی ملتی۔ بچوں کے سوتے ہوئے یہ مزدور گھروں سے نکلتے اور جب جاتے تو ان کے بچے سو رہے ہوتے۔ آرام کی غرض سے کوئی چھٹی ہفتہ وار ہو یا ماہانہ ان کو نہ دی جاتی۔ کم عمر بچوں سے بھی بارہ سے سولہ گھنٹے زبردستی کام لیا جاتا اور ظلم وتشدد روا رکھا جاتا اور کئی بچے مشین سے زخمی یا ہلاک کردیئے جاتے۔ یہ تھا نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں انڈسٹریز کو پروان چڑھانے اور دولت کمانے کا نشہ۔

نشاۃ ثانیہ کی یہ لہر جب امریکہ میں پہنچی تو ہوس کے پجاریوں نے نہ صرف ان لوگوں سے زبردستی کام لیا بلکہ مزدور عورتوں کو بطور بیوی استعمال کرتے اور اس پر ستم یہ کہ ان سے پیدا ہونے والے بچوں کو زر کے لیے فروخت کردیتے۔

At the time of the War of Indepependence, and for some years after its close, the Southern States were quite willing to contemplate the abolition of slavery in the near future.

Slavery in the North and West was abolished by unanimous vote in 1787, and Jefferson, not without reasn, hoped to see it abolished in the South. But in the year 1793 Whitney invented the cotton gin,which enabled a negro to clean fifty pounds of fibre a day instead of only one, as formerly, "Labour-saving" devices in England had caused children to have to work fifteen hours a day; "labour-saving" devices in America inflicted upon slaves a life of toil far more severe than what they had to endure before Mr. Whitney's invention. the slave trade having been abolished in 1808, the immense increase in the cultivation of cotton after that date had to be made possible by importing negroes from the less southerly States in which cotton could not be grown. The deep South was unhealthy, and the slaves on the cotton plantations were cruelly overworked. The less southern slave States thus became breeding-grounds for the profitable southern graveyards. A peculiarly revolting aspect of the traffic was that a white man who owned female slaves could beget children by them, who were his slaves, and whom, when he needed cash, he could sell to the plantations, to become (in all likelihood) victims of hookworm, malaria, or yellow fever.(22)

غلاموں کی تجارت کا مذموم کاروبار یہاں سے امریکہ میں شروع ہوا۔ امریکہ میں آخرکار عظیم خانہ جنگی ہوئی اور وہ مزدوروں کا آوازِ حق بلند کرنا دراصل اس مفسدات کی طرف توجہ دلاتا تھا جو نشاۃ ثانیہ کے نشے میں شروع ہوئی تھی۔ امریکہ پر یورپ کے سفید فاموں کا قبضہ بھی نشاۃ ثانیہ کے مفسدات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جب ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور وہاں پر موجود آباد لوگوں کو جو اپنی رسم و رواج اور مذہب و ثقافت کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔

ان کو اسپین کی شاہی حکومت ملکہ ازابیلا کی ملکیت ٹھہرادی۔ یہی لوگ ریڈ انڈینز کہلائے۔ ان کی سادگی، محبت اور ہمدردی کے بدلے مادی مفسدات کا ایک مکروہ سوچ انہی ریڈ انڈینز کے متعلق کولمبس کے مقامی لوگوں سے پہلی ملاقات کے بارے میں روزنامچے میں لکھے گئے جملوں سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

"وہ ہمارے لیے رنگ برنگ پرندے، روئی کے گٹھے، کمانیں اور دوسری اشیاء لے کر آئے اور ہم سے بدلے میں بیلوں کی گردن میں ڈالنے والی گھنٹیاں اور شیشے کی لڑیاں لے گئے۔ یہ لوگ اشیاء کے بدلے اشیاء پر ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کے جسم مضبوط اور صحت مند ہیں۔ یہ لوگ سادہ، جفاکش اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ تو ہتھیاروں کے استعمال کا علم ہے نہ ہی یہ کسی ہتھیار سے مسلح ہوتے ہیں جب میں نے اپنی تلوار ان لوگوں کو دکھائی تو بیشتر نے اپنی انگلیوں اور ہاتھوں کو تیز دھار تلوار سے زخمی کر لیا۔ یہاں پر ابھی تک لوہے کا استعمال شروع نہیں ہوا ہے ان کے تیر کمان لکڑی، گنا اور بانس سے بنے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ بہترین خدمت گار اور اچھے غلام ثابت ہوں گے۔ ہم صرف پچاس لوگوں کی مدد سے تمام مقامی آبادی پر غلبہ حاصل کر کے انہیں با آسانی غلام بنا سکتے ہیں۔ (۲۳) خود کو برتر سمجھتے ہوئے دوسروں کو اتنا حقیر سمجھا گیا کہ کولمبس کے الفاظ ہیں کہ پچاس لوگ سب کو غلام بنا سکتے ہیں۔

دوسری جگہ ایک تحریری رپورٹ جو ملکہ ازابیلا کو پیش کی گئی یہ اسی کولمبس کی ہے جو امریکی ہیرو ہے۔ مگر جس کی نیت ظلم، انسانی حقوق وحرمت کی پامالی اور حرص وہوس سے آلودہ تھی۔ ۱۴۹۳ء کے رپورٹ میں کولمبس نے لکھا:

"ریڈ انڈینز اپنے دفاع کے قابل نہیں ہیں ان کے رسم ورواج میں ذاتی ملکیت کا تصور ناپید ہے۔ یہ لوگ سادہ اور بے ضرر ہیں ان کو دیکھے بغیر ان کی سادگی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ان سے جب بھی کچھ طلب کیا جائے تو وہ دینے سے انکار نہیں کر سکتے...... اگر ملکہ اور بادشاہ میری مدد کریں تو میں ان کے لیے اس نئی دریافت کردہ دنیا سے اتنا سونا لا سکتا ہوں کہ جو ضرورت سے سوا ہو اور اتنے غلام لادوں گا کہ جتنے کا حکم دیا جائے گا"۔ (۲۴)

بالآخر ایک دردناک اور ہولناک جنگ کے بعد یورپی نشاۃ ثانیہ کے طفیل بارودی اسلحہ اور بھاپ انجن، بحری جہازوں کی ایجاد کے جارحانہ استعمال سے ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ آگے چل کر یورپ میں بارودی قوت سے بم بنائے جانے لگے اور طیاروں کو، جو اب تک صرف سواری کا ذریعہ تھے، بمباری کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ طیاروں کے ذریعہ بمباری نے جنگ کی اخلاقیات (War ethics) کی تمام قدار کو خاک میں ملا دیا۔ جنگ کی اخلاقیات یہ تھی کہ عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کو نشانہ نہ بنایا جائے۔ تعمیرات کو برباد نہ کیا جائے۔

کھیتوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے مگر بمباری نے یہ تمام امتیازات اور تحفظات پامال کر دیئے اور وہ آج تک پامال چلے آ رہے ہیں۔

بعد میں آنے والے ادوار میں جنگی اخلاقیات کو تحفظ فراہم کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کے بجائے مزید ایسے ایسے آلات جنگ ایجاد کئے گئے جنہوں نے اخلاقیات کے تحفظ کے راستوں کو بند کر دیا۔ ۱۹۳۹ء میں آئن سٹائن کو تابکار عناصر (Radio-active elements) مثلاً یورینیم کے انشقاق (Fission) سے توانائی حاصل کرنے کا راستہ دکھائی دیا۔ یہ بلاشبہ اس سائنسدان کی ذہانت کی بہت عظیم کامیابی تھی۔ یورینیم کے انشقاق سے حاصل کردہ توانائی کو بنی نوع انسانی کے ناقابل بیان فوائد کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا مگر اس مفسد اور تخریب پسند سائنسدان کو اسے ہلاکت خیز ایٹم بم بنانے کے لئے استعمال کرنے کا راستہ نظر آیا۔ چنانچہ اس نے صدر امریکہ روزویلٹ کو ایک خط لکھ کر یہ راہ سمجھائی کہ وہ اس کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق ایٹم بم بنوائیں۔ اس نے اپنے خط میں لکھا کہ:

"صدر گرامی...... یورینیم کو توانائی کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بنایا ہوا صرف ایک بم کسی بندرگاہ پر گرایا جائے تو وہ پوری بندرگاہ اور اس کے گردونواح کے علاقے کو مکمل طور پر تباہ کر سکتا ہے"۔

امریکہ کو ان دنوں اسی قسم کے ہتھیار کی طلب تھی کیونکہ جنگ عظیم دوم میں جو ان دنوں جاری تھی وہ جرمنی اور جاپان کی قوت کے آگے عاجز نظر آنے لگا تھا۔ لہٰذا امریکی صدر روزویلٹ نے بلا تاخیر اس کام کے لئے رقم منظور کی۔ اس رقم سے بہت تھوڑے عرصہ میں ایٹم بم تیار کر لیا گیا جسے ۱۹۴۵ء میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرایا۔ ان بموں سے لاکھوں شہریوں پر مشتمل یہ دونوں شاد و آباد شہر جل کر خاکستر ہو گئے۔

ایٹم بم کی ایجاد کے بعد ہلاکت خیز اسلحوں کی تیاری کا سلسلہ ان ملکوں میں رک نہیں گیا بلکہ یکے بعد دیگرے زیادہ سے زیادہ تباہ کن اسلحے ایجاد ہونے لگے۔ ایٹم بم کے بعد ہائیڈروجن بم ایجاد ہوا۔ ایٹم بم کو طیاروں سے بھی زیادہ آسان طریقے پر گرانے کے لئے میزائل ایجاد ہوئے۔ زہریلی گیسیں تیار کی گئیں۔ یہاں تک کہ آج تباہ کاری کے سامان اس انتہا درجہ کے تیار ہو گئے ہیں کہ آپریشن روم میں صرف بٹن دبا دینے پر چند گھنٹوں میں اربوں انسانوں سے آباد یہ ہنستی کھیلتی دنیا مکمل طور پر نیست و نابود کر دی جا سکتی ہے۔ یورپ میں بھاپ انجن کی ایجاد کی وجہ سے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) جو آیا، اس نے کارخانوں کی پیداوار بڑھا دی۔ اسے کھپانے کے لئے نئی تجارتی منڈیوں کی تلاش میں اہل یورپ اپنے براعظم سے باہر نکلے اور دنیا کے بہت بڑے حصے کو غلام بنا لیا۔

حالانکہ ان ملکوں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا بلکہ جب وہ پہلی بار تجارتی وفود کی صورت میں ان ملکوں میں وارد ہوئے تھے تو ان کی بڑی فراخدلانہ مہمان نوازی کی گئی تھی۔ ان ملکوں کے بادشاہوں نے انہیں تحائف پیش کئے تھے۔ تجارتی کوٹھیاں بنانے کے لئے انہیں زمینیں عطا کی تھیں اور نقل وحمل کی سہولتیں فراہم کی تھیں۔ اس پذیرائی کا بدلہ یورپ کے ان ملک گیروں اور ہوس پرستوں نے یہ دیا کہ اپنے تجارتی جہازوں میں اسلحہ بھر بھر کے لے آئے اور ان کے زور پر ان ہی بادشاہوں اور سلطنتوں کا تختہ الٹ دیا جن کی فراخدلی کے سبب سے انہیں ان ملکوں پر قدم رکھنے کی اجازت حاصل ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر یورپ میں نشاۃ ثانیہ رونما نہ ہوئی ہوتی تو دنیا کو یہ روز بد دیکھنا نہ پڑتا۔ اور انسانیت کو انسانیت سوز زخم نہ کھانے پڑتے۔ (۲۵) چنگیز خان کی منگول فتوحات میں چونتیس ملین افراد تہ تیغ ہوئے تھے جبکہ ہلاکو خان کی خون آشامی چار ملین کے سر لے گئی تھی۔ امیر تیمور گورگان کی گردن پر چودہ ملین افراد کا بار ہے جبکہ نازی جرمنی کے ایڈولف ہٹلر پر اکیس ملین کے قتل کی ذمہ داری عائد ہے۔ اگر یہ قاتلین انسانیت جو مجموعی طور پر بہتر ملین افراد کے قتل پر ظلم و بربریت کا استعارہ بنے ہوئے ہیں تو سو ملین ریڈ انڈینز، ساٹھ ملین افریقی، دس ملین ویت نامی، دو ملین افغانی اور ایک ملین عراقیوں کے قاتل کو کیا کہا جائے گا؟... امریکہ کے اعلان آزادی ۱۷۷۶ء سے ۲۰۰۵ء تک امریکی مسلح افواج دو سو بیس مرتبہ اقوام عالم کے خلاف جارحیت کی مرتکب ہو چکی ہیں۔ ان دو سو تیس سالوں میں، دو سو بیس مرتبہ جارحیت کے ارتکاب کی یہ شرح کسی بھی ملک کی شرح جارحیت سے کئی گنا زیادہ اور بیشتر صورتوں میں کئی سو گنا زیادہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ تیئس ملکوں پر بمباری کا مرتکب ہو چکا ہے، ان ممالک میں چین (دو مرتبہ) گوئٹے مالا (تین مرتبہ) کوریا، انڈونیشیا، کیوبا، کانگو، پیرو، سوڈان، افغانستان، لاؤس، ویت نام، کمبوڈیا، گرینیڈا، لبنان، لیبیا، السالوڈور، نکاراگوا، پانامہ، عراق (دو مرتبہ) اور یوگوسلاویہ شامل ہیں۔ (۲۶) امن کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرنے والے جن کے کرتوت میں پہلے جوہری بم کے استعمال سے بیک وقت ڈیڑھ لاکھ سے زائد افراد قتل کر دینے سے عراق کے ابوغریب جیل میں بھیانک اور انسانیت سوز رویے وسلوک کرنے کے علاوہ دور جدید میں بھی عراق، افغانستان و پاکستان وغیرہ نے زہریلی گیسوں، وائرس و ڈرون حملوں کے ذریعے سے صرف اپنے مفادات عظمیٰ کے حصول کی خاطر ہزاروں بے گناہ افراد کی ہلاکت شامل ہے۔

فکری مفسدات:

یورپی نشاۃ ثانیہ نے نہ صرف مادی اعتبار سے مزدوروں بلکہ انسانیت کا استحصال کیا بلکہ فکر ونظر کو بھی الجھا کر رکھ دیا۔ فکری اعتبار سے جو نقصانات پہنچے وہ بھی کم الم انگیز نہ تھے۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو سب سے بڑی مصیبت بنی نوع انسان پر نازل ہوئی وہ یہ تھی کہ یورپ کے مفکرین اور سائنسدان ہر مسئلے کی تاویل وتوجیہہ الحاد اور انکار خدا کے زاویہ نظر سے کرنے لگے۔ ہر سائنسی تحقیق یا نظریئے کی تاویل وتشریح الحاد اور انکار خدا کے نقطۂ نظر سے کی جانے لگی۔ اس طرز فکر کا آغاز ۱۵۴۳ء میں ہوا جب کوپرنیکس (Copernicus 1473 - 1543) نے اس کلیسائی نظریئے کی تغلیط کر دی تھی کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ اس کے برعکس یہ دعویٰ کیا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گردش کرتی ہے۔ سکونِ زمین اور گردش آفتاب کے بارے میں مذکورہ کلیسائی نظریہ حقیقتاً بائبل میں کہیں مرقوم نہ تھا اور نہ ہی عیسائیت کی تعلیمات میں ایسا کوئی دعویٰ موجود تھا۔ یہ محض ایک یونانی ماہر فلکیات بطلیموس (Ptolemy) کا نظریہ تھا جو اس نے اپنی کتاب المجسطی (Almagest) میں پیش کیا تھا۔ یہ نظریہ بہت مقبول ہو گیا تھا اس لئے معروف عیسائی مصلح سینٹ آگسٹائن ۳۵۴۔۴۳۰ء نے اسے عیسائی مذہب کی وقعت بڑھانے کی خاطر اسے عیسائیت کا جزوعقیدہ بنا لیا تھا.... نیوٹن ۱۶۴۲ء۔ ۱۷۲۷ء نے جو نظریہ پیش کیا کہ کائنات (محض) طبیعی قوانین (Physical laws) کے تحت چل رہی ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کائنات کو خدا کی ضرورت کبھی اگر تھی تو صرف اس وقت تک تھی جب تک اسے بنانے اور چلانے کی حاجت تھی۔ اب یہ کائنات طبیعی قوانین کے تحت خود بخود چل رہی ہے۔ اس لئے اب دنیا کو خدا کے وجود کی ضرورت نہیں رہی۔ چاند، تارے، زمین، سورج سب کے سب طبیعی قوانین کے تحت خود بخود گردش کر رہے ہیں اور حیوانات اور پودے اپنی مرضی سے نسل رانی کر رہے ہیں لہٰذا اب کائنات کو اور اس میں بسنے والی مخلوقات کو اس کی کوئی حاجت نہیں رہی۔ یہ مذہب کی مخالف سمت میں اہل سائنس کا دوسرا مذموم قدم تھا۔

نیوٹن کے بعد اس کی صدی میں لیوائزے (۱۷۴۳ء - ۱۷۹۴ء) پیدا ہوا۔ اس نے مادہ (Matter) کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ غیر فانی ہے۔ یہ نظریہ فی نفسہ تو نہیں مگر اپنے مضمرات کے اعتبار سے نیوٹن کے نظریئے سے بھی زیادہ ملحدانہ ثابت ہوا کیونکہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ دنیا مادی ہونے کی بنا پر کبھی بھی فنا نہ ہوگی لہٰذا قیامت کبھی نہ آئے گی۔ ان سب ملحدانہ خیالات کو تائید مزید چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء - ۱۸۸۲ء) کے نظریہ ارتقائے فراہم کی۔ جس میں مختلف النوع حیوانات کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ یہ کسی خالق کے حسن کی تخلیق کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ محض جدوجہدو بقا (Struggle for existence) کے عمل کے شاخسانہ ہے۔ اگر حیوانوں کے مابین زندہ رہنے کے لئے جہد بقا نہ ہوتی تو دنیا میں حیوانوں کی اتنی ساری اقسام دیکھنے کو نہ ملتیں گویا اس دنیا میں اور پوری کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے محض طبیعی قوانین کے تحت ہو رہا ہے۔

مزید زیادتی یہ کی گئی کہ قوانین طبیعی کا اطلاق انسان کے افعال واعمال پر بھی کر دیا گیا اور یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، قوانین طبیعی کے تحت کرتا ہے۔ مجبور محض کی حیثیت سے کرتا ہے اس کے کرنے میں اس کے ترک واختیار کی آزادی (Free will) کو مطلقاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انسان کی آزادیء عمل کے انکار کا یہ نظریہ وہی نظریہ ہے جسے فلسفہء یونان کے متبعین نے یہودیوں میں پھیلایا تھا اور یہودیوں نے خلفائے بنوامیہ کے زمانے میں مسلمانوں میں پھیلایا تھا اور جس نے مسلمانوں میں فرقہ جبریہ پیدا کر دیا تھا۔ عذاب وثواب یا حشر ونشر سے انکار کے لئے خود ڈارون کے نظریہء ارتقاء نے بھی بہت کافی مواد فراہم کیا۔ اس نظریہ پر ایمان لانے والوں میں جب انسان کے ارتقاء (Human evolution) پر بحث چھڑی اور یہ بات انہیں باور کرائی گئی کہ انسان نسلِ آدم سے نہیں وجود میں آیا بلکہ غیر حیوان سے ارتقاء پذیر ہو کر وجود میں آیا ہے اور وہ ماضی قریب میں انسان نما جانداروں کے مدارج سے گزرا ہے مثلاً یہ کہ (Pithecanthropus Erectus) نامی حیوان ڈھانچے کا جو رکاز دستیاب ہوا ہے وہ حقیقتاً انسان کی جانب ارتقاء کی ایک کڑی ہے (Homo Pekiensis) اور (Pilt Down Man) بھی اسی ارتقاء کی زنجیریں کی کڑیاں ہیں جو موجودہ انسان سے مقابلتاً زیادہ قریب ہیں گویا انسان اور انسان نما حیوانوں کے درمیان کوئی حد فاصل (Demarcation line) نہیں ہے تو پھر یہ بحث چھڑی کہ ان انسان نما جانداروں پر عذاب وثواب اور حساب کتاب کا اطلاق ہو گیا یا نہیں؟ ہو گا تو کیونکہ وہ تو مکمل طور پر انسان نہیں تھے۔ نہیں ہو گا تو پھر انسان پر کیوں ہو گا جب کہ اس میں اور ان انسانوں نما جانوروں میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ جب یہ بحثیں چھڑیں تو آخر کار متبعین ڈارون نے انسانوں کے لئے عذاب وثواب اور حشر نشر کو خارج از مکان قرار دیا۔ گویا انسان کو بدعملی کی راہ پر ڈال دینے کے معاملے میں اس میں اور مذکورہ بالا نظریہ جبر میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ (۲۷) نظریہ ارتقاء کو جہد بقا (Struggle for existence) کا نام دیتے ہوئے افراد اور قوموں پر اس کا اطلاق اس طرح کر دیا گیا کہ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان زندہ رہنے کا حق طاقت ور کو ہے اور وہ سرمایہ دار ہے۔ اسی نشاۃ ثانیہ کے بعد سرمایہ داروں نے انسانیت کے ساتھ جو جانوروں سے بد تر سلوک کیا وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اسی طرح نظریہ ارتقاء میں یہ پیش کیا گیا کہ انسان جانداروں سے ارتقاء پذیر ہو کر اس حالت تک پہنچا ہے۔

لہٰذا ان کی اصل (باپ) ایک نہیں ہے اور جب اصل ایک نہ ہو تو تمام انسان برابر بھی نہیں ہیں۔ اسے سے نطشے (Nietzshce) نے فلسفہ فوق البشر (Super Man) پیش کر کے جرمن قوم کو سب پر بالا دست قرار دیا اور یہ بتایا کہ انہیں قدرتی حق حاصل ہے کہ دیگر اقوام پر وہ بالا دستی حاصل کر لیں۔

اور اس طرح جرمن قوم نے بالادستی کے حصول کے لیے جنگ عظیم دوم چھیڑی جو اسی نظریہ فوق البشر کی رو سے برپا کیا گیا تھا۔ مارکس کی اشتراکیت اگرچہ ہیگل کے نظریہ جدلی عمل (dialecgical process) کے شکم سے تولد ہوئی مگر اس کی شیر خواری بھی ڈارونی نظریہ ارتقاء نے کی کیونکہ دو باتوں میں ان دونوں کے مابین اشتراکِ فکر موجود تھا۔ ایک یہ کہ انسان ایک معاشی حیوان ہے اور دوسرا یہ کہ ان کے مابین حقوق زندگی کے لئے کشمکش باہم کا عمل ایک تاریخی اور آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔

اس مارکسزم کو روٹی کی امید میں دنیا کی ایک تہائی آبادی نے اپنایا۔ اس کو اپنانے سے روٹی کا مسئلہ تو حل نہ ہوا البتہ دنیا کی ایک تہائی آبادی اپنی آزادیوں سے محروم ہو گئی بہر کیف ڈارون ازم تو خیر دم توڑتی نظر آ رہی ہے، اس نظریہ پر خود اہل حیاتیات تنقیدوں کے بڑے تیر برسا رہے ہیں کیونکہ ایک حیاتی نظریئے کی حیثیت سے بھی یہ نظریہ اب خامیوں سے لبریز نظر آنے لگا ہے مارکسزم سے بھی دنیا اب دل برداشتہ نظر آنے لگی ہے فوق البشر کے فلسفے کا حشر بھی دیکھ لیا گیا۔ یہ سب علامات بڑی اچھی اور لائق تحسین ہیں مگر نشاۃ ثانیہ نے مادی فوائد و لذائذ کے ساتھ دین و دنیا کی تفریق کا یعنی دوئی کا جو تحفہ دیا ہے۔ اس اہل مغرب اب تک چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جب تک یہ تحفہ موجود رہے گا، یہ ڈارون ازم، مارکسزم اور فوق البشر جیسے فلسفے جنم دیتا رہے گا۔ گویا آج کا سب سے بڑا فکری مسئلہ یہ ہے کہ اس دوئی کی بیخ کنی کی جائے۔ ہم مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اس کا نام شرک ہے۔ اس شرک کا مزا ابنی نوع انسان نے اب خوب چکھ لیا۔ (۲۸) برصغیر میں انگریزوں کی حکومت مسلمانوں کی حکومت سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں نے برصغیر کو وطن بنا لیا تھا اور ان کی حکومت خود یہاں کے لوگوں کی حکومت تھی۔ مسلمان ہندوستان اور پاکستان کی دولت کو کسی دوسرے ملک میں نہیں لے گئے۔ انہوں نے تعمیر و ترقی کا جو کام انجام دیا اس سے یہاں کے باشندوں کو فائدہ پہنچا اور ملک کی خوشحالی میں ایسا اضافہ کیا کہ یورپ کے لوگ ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہنے لگے۔ لیکن انگریزوں نے اس کے برخلاف برصغیر کو اپنا وطن نہیں بنایا، انہوں نے انگلستان میں بیٹھ کر یہاں کے لوگوں پر حکومت کی، یہاں کے باشندوں سے امتیازی سلوک کیا اور یہاں کی ساری دولت لوٹ کر انگلستان لے گئے اور سونے کی اس چڑیا کو ایسا لوٹا کہ وہ دنیا کا سب سے پس ماندہ اور مفلس ملک بن گیا اور اس کی دولت سے انگلستان میں دولت کی ریل پیل ہو گئی اور وہ دنیا کے خوش حال ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

برصغیر میں انگریزوں نے مدرسے اور یونیورسٹیاں بھی اپنے مفاد کے لیے قائم کیں۔ انگریز یہاں کے باشندوں کو صرف وہ تعلیم دینا چاہتے تھے جو انگریزوں کے مطلب کی ہو۔ ان کا اصول تھا کہ اس برصغیر میں ایسی تعلیم دی جائے کہ یہاں کے

باشندے صورت اور شکل کے لحاظ سے تو پاکستانی یا ہندوستانی نظر آئیں لیکن ان کے سوچنے کا انداز انگریزوں جیسا ہو یعنی وہ انگریزوں کے مفاد اور فائدے کی بات تو سمجھ سکیں لیکن اپنے وطن کے مفاد اور فائدے کی بات ان کے ذہن میں نہ آسکے.....

ان مشن اسکولوں کی خود ایک انگریز نے اس طرح تعریف کی تھی:

"اگر چہ ہم ان مدرسوں کے طلبہ کو عیسائی نہیں بنا سکے لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ مسلمان، ہندو اور سکھ بھی نہیں رہ سکے" (۲۹)

غرض کہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں یورپ نے صرف وہ کام سرانجام دیئے جس سے وہ مادی، تعلیمی وفکری مفادات حاصل کر سکتے تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے تمام تر انسانی واخلاقی اقدار کو پامال کرتے ہوئے انسانیت کے ساتھ حیوانیت سے بھی بدتر معاملہ کیا۔

حواشی وحوالہ جات (باب چہارم)

(۱) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۱۸-۱۱۷

(۲) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۲۱

(۳) درانی، عطش ڈاکٹر: "تناظرات اسلامی سائنس" فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۰۷

(۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۱۳

(۵) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۲۲-۱۲۱

(۶) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۲۷-۱۲۶

(۷) اقبال، محمد، علامہ: "جاوید نامہ" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۱۶۶

(۸) رضوی، خورشید مصطفیٰ: "جنگ آزادی ۱۸۵۷" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۲-۳۱

(۹) اکبر آبادی، سعید احمد، مولانا: "مسلمانوں کا عروج وزوال" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۴۷ء، ص: ۳۱۲

(۱۰) بنگلوری، محمود: "ٹیپو سلطان" گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص: ۲۰

(۱۱) جامعی، محمد نصیر، سید: "مسلمان سپہ سالار اور فاتح" احسن برادرز، لاہور، ۱۹۵۹ء ص: ۱۱۸

(۱۲) جمیل احمد، خواجہ، "دلاوران اسلام" اردو اکیڈمی، کراچی، ص: ۲۰۴-۲۰۳

(۱۳) رضوی، خورشید مصطفیٰ: "جنگ آزادی ۱۸۵۷" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۴۷

(۱۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۰

(۱۵) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۲، ص:۳۷۳

(۱۶) حقی حق، ڈاکٹر: "ہوئے تم دوست جس کے" شفیق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۱۴۷

(۱۷) صابری، عنصر: "فتنہء یہود" اکرم تخلیق مرکز، لاہور، ص:۶۶-۶۵

(۱۸) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۳، ص:۴۳۱-۴۲۹

(۱۹) صابری، عنصر: "فتنہء یہود" اکرم تخلیق مرکز، لاہور، ص:۸۸-۸۷

(۲۰) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۳، ص:۴۳۵-۴۳۴

(21) Bertrand Russell "The Impact of Science on Society"
Gerorge Allen & Unwin Ltd, London, 1959, P-31

(22) As Above P-32

(۲۳) حقی حق، ڈاکٹر: "ہوئے تم دوست جس کے" شفیق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۱۴۷

(۲۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۵۱

(۲۵) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۴۸-۱۴۷

(۲۶) حقی حق، ڈاکٹر: "ہوئے تم دوست جس کے" شفیق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۴۴۸-۴۴۷

(۲۷) صدیقی، حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر: "مسلم نشاۃ ثانیہ؟" مطبوعات جاوید، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۵۱-۱۴۹

(۲۸) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۵۴-۱۵۳

(۲۹) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۳، ص:۷۴-۷۳

باب پنجم

بیداریٔ امت کا آغاز

باب پنجم

بیداریٔ امت کا آغاز

فصل اول

مساعی اصلاح اور تحاریک اسلامیہ

یہ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ کے عروج کا دور بھی ایسا نہ رہا کہ مصلحین کے اصلاحی وتجدیدی کارنامے سے خالی رہا ہو مگر اٹھارہویں صدی تک ان کے اصلاح کار کی نوعیت حفاظت ومدافعت دین کی تھی۔

اس لیے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو بہر حال اسلام نے جو تہذیبی اور عمرانی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار (Intact) تھا حتیٰ کہ شریعتِ اسلامی تمام مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظام عقائد واعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کردیں۔(۱)

اٹھارہویں اور انیسوی صدی مسلمانوں کے صرف سیاسی زوال کی صدیاں نہیں تھیں مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور علمی زوال کی صدیاں بھی تھیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مذہبی، علمی اور معاشرتی میدانوں میں مسلمانوں کا زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسلامی عقائد کے پیچھے جو روح کارفرما تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ اسلام نے ایک رواجی مذہب کی شکل اختیار کرلی تھی اور مسلمان حکمرانوں کے سامنے فتوحات اور ملک گیری، شہرت اور ناموری کے علاوہ کوئی اعلیٰ مقصد سامنے نہیں رہا تھا۔ عوام وخواص میں تلاش وجستجو کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ ریاضی، طب اور علم حکمت یعنی طبیعات اور سائنس سے مسلمان زوال بغداد کے بعد ہی دست بردار ہو گئے تھے، لیکن اب دینی علوم میں بھی اجتہاد کو ترک کردیا گیا اور علماء کا کام دور اول کے علماء کی کتابوں کی تشریح کرنا اور ان پر حاشیے لکھنا رہ گیا تھا۔ ذہنی جمود کا یہ عالم تھا کہ علماء اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ دور اول کے اہل علم جو کچھ لکھ گئے اب اس پر اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ سیر وسیاحت کا جذبہ جو قوموں میں زندگی کی علامت ہوتا ہے سرد پڑ چکا تھا۔

زوالِ بغداد سے پہلے ہمیں ایک سے ایک بڑے سیاح نظر آتے ہیں، لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ایک بھی قابلِ ذکر سیاح نظر نہیں آتا۔ چودہویں صدی میں ابن خلدون ہمارا آخری بڑا مفکر ہے۔ اس کے بعد ایک بھی ایسا مفکر نظر نہیں آتا جس نے علم و افکار کی دنیا میں کوئی اضافہ کیا ہو..... سب سے اہم بات یہ کہ اسلام جس کی بنیاد خالص توحید پر ہے اور جس میں شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں تصوف کے نظام کے زوال، اس کے اصل اسلام سے ہٹ جانے اور غیر اسلامی نظریات کی آمیزش کی وجہ سے اسلام شرک اور بدعت کا مجموعہ بنتا جارہا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں اسلامی دنیا اٹھارہویں صدی تک پوری طرح مبتلا ہو چکی تھی۔ شروع میں تو ان کمزوریوں اور خرابیوں کو اس لیے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی کہ مسلمانوں کو ہر جگہ سیاسی غلبہ حاصل تھا جس نے تمام کمزوریوں پر پردہ ڈال رکھا تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں جب سیاسی اقتدار کی عمارت دھڑام سے گر پڑی اور غیر اسلامی قوتوں نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا تو یہ تمام کمزوریاں نمایاں ہو گئیں اور مسلمان ان کمزوریوں کے اسباب اور ان کو دور کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اصل اسلام سے بہت دور چلے گئے تھے اور کتاب و سنت کو نظر انداز کر کے تقلید جامد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (۲)

حضرت مجدد الف ثانیؒ:

حضرت مجدد الف ثانی (۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء) کا نام احمد تھا۔ وہ سرہند میں پیدا ہوئے، اسی نسبت سے سرہندی کہلائے۔ آپ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ احمد نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر پوری کی۔ پہلے قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر حدیث و تفسیر اور معقولات کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے بعد تکمیل کے لئے نکلے اور اس زمانہ کے اکابر علماء کے پاس مختلف مقامات پر جا کر علم حاصل کیا۔ جس زمانہ میں شیخ احمد آگرہ میں حدیث و تفسیر کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ ابوالفضل اور فیضی نے جو شہنشاہ اکبر کے دستِ راست تھے۔ اُن کی ذہانت کا شہرہ سن کر انہیں اپنے حلقہ احباب میں داخل کرنے کی سعی کی۔ مگر یہ دوستی زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی، کیوں کہ ابوالفضل کے خلافِ اسلام عقائد شیخ پر بہت گراں تھے۔ (۳)

دسویں صدی میں اگرچہ اسلامی دنیا کے ہر حصے میں تاریکی چھائی تھی لیکن اس صدی کے آخر میں ہندوستان کی حالت سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ اکبری عہد میں کوئی فتنہ ایسا نہ تھا جو اسلام کے خلاف نہ اٹھایا گیا ہو، علماء سوء کی دراز دستیوں، عزوجاہ طلبیوں اور باہمی آویزشوں کی وجہ سے اکبر اسلام سے متنفر ہوا اور الحاد و زندقہ کو اپنا شعار بنالیا۔ اس زمانے میں اسلام کا ہر طرح مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ اسلام کے رسومات و عقائد کی مخالفت کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ختنہ، قربانی وغیرہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

اور سود شراب وغیرہ کو حلال کر دیا گیا، بغیر نکاح ہندو عورتوں سے شادی بیاہ کرنے کا طریقہ جاری ہوا۔ حج و زکوٰۃ وغیرہ ارکان اسلامی کو بند کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی۔ بادشاہ کے درشن اور اس کی زیارت کو باعث ثواب سمجھا جانے لگا۔ دربار میں بادشاہ کے سامنے جھکنے کی رسم جاری کر دی گئی اور دنیا طلب علماء نے اس کو سجدہ تعظیمی اور زمین بوسی سے تعبیر کر کے جائز قرار دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ "دین الٰہی اکبر شاہی" کے نام سے ایک جدا مذہب قائم کیا گیا جس میں سوائے اسلام کے ہر مذہب کی اچھی اچھی باتیں لے کر شامل کی گئیں جس کی رو سے اکبر کو خلیفہ اللہ تسلیم کیا گیا۔ غرض یہ کہ بدعات و توہمات کی کوئی ظلمت ایسی نہ تھی جو اسلام کو محیط کیے ہوئے نہ تھی۔ اکبری دور کا یہ فتنہ حملہ تاتار سے زیادہ نقصان دہ اور مضر ثابت ہوا۔ ملک میں شورشیں ہوئیں لیکن سب کو دبا دیا گیا۔ اکبر کے بعد جہانگیر کے عہد میں "ان برکتوں" کا بڑا حصہ باقی رہا۔ بادشاہ کے سامنے بر سر دربار سجدہ کرنے کی رسم اسی طرح ادا کی جاتی تھی جس طرح دور اکبری میں۔ (۴)

جب کوئی شخص اصلاح کا کام کرتا ہے تو اس کے بہت سے مخالف بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے اور انہوں نے جہانگیر سے جو اس زمانہ میں بادشاہ تھا مجدد الف ثانیؒ کی شکائتیں کیں، جس پر جہانگیر نے ان کو سرہند سے اپنے پاس بلوایا۔ اکبر کے زمانہ سے دربار میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ جب کوئی شخص بادشاہ کے سامنے آتا تھا تو تعظیم کے طور پر اس کو سجدہ کرتا تھا، لیکن مجدد الف ثانیؒ جب دربار میں پہنچے تو انہوں نے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ مجدد الف ثانیؒ ایک سال قلعہ میں قید رہے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ تبلیغ میں مصروف رہے۔ (۵)

حضرت امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ نے ہندوستان کی اصلاح کے لئے کس طبقہ کو چنا۔ یہ چیز آج بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرے گی۔ سب سے اول آپ نے ان غرباء و فقراء کی جماعت تیار کی جو عملی نمونہ بن کر لوگوں کے سامنے اسلامی روایات پیش کر سکیں۔ اس کے لئے آپ نے روحانی کمالات سے کام لیا۔ دوسرے درجہ پر آپ نے اہل علم اور سنجیدہ طبقہ کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کیا اور صحیح عقائد اسلامیہ ان تک پہنچائے۔ اس کے لئے آپ علم و استدلال کی طاقت حرکت میں لائے۔ تیسرے درجہ پر ان امراء کو جو خالص سنی المذہب تھے اور با اختیار تھے۔ اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کی تلقین کی اور ان کی عزت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں اپنے مکتوبات شریف سے نوازا اور ان کی تسلی و تشفی فرماتے رہے۔ چوتھے طبقہ پر بادشاہ جو کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ با اختیار تھا اس کی اصلاح کے لئے آپ کو مختلف قسم کی صعوبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ ایک نفیس نکتہ تھا۔

جس کی طرف حضور اکرم ﷺ کا اشارہ الناس علی دین ملوکھم ہے۔ پہلے تین درجوں میں حضرت امام ربانیؒ بہترین کامیابی حاصل کر چکے تھے اب صرف آخری درجہ باقی تھا۔ اوراس میں کامیابی کے لئے آپ نے قید وبند کی مصیبتیں اٹھائیں۔(۶) بالآخر آپ کی سعی نے مجرم صفات قیدیوں میں انقلاب پیدا کر کے صحیح مسلمان بنا ڈالا۔ اس چیز نے جہانگیر کو متاثر کیا اوراس نے نہ صرف آپ کی رہائی کا حکم دیا بلکہ آپ کی صحبت سے مستفید بھی ہوا۔ شاہ جہاں نے بیعت کی، جس کے نتیجے میں بدعات، سیئات اور توہمات کا خاتمہ ہوا۔ یہ شیخ کی محنتوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اکبر کی چوتھی نسل سے اورنگ زیب عالمگیر جیسا حق پسند حاکم پیدا ہوا، جسکی وجہ سے اسلام کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور اسلامی تعلیمات پروان چڑھیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے خطوط، کتابیں، رسالے لکھ کر اور وعظ وتقریر کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کا پرچار کیا دلائل کے ذریعے اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا۔ ان کی اس محنت شاقہ سے لاکھوں مسلمانوں کے عقائد صحیح ہوئے اور ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔

امام شاہ ولی اللہؒ:

اٹھارہویں صدی کے اہل علم حضرات میں سے وہ لوگ جنہوں نے امت مسلمہ کے زوال کے پہلو اور تدارک پر سوچا اور اصلاح کے لیے بیڑا اٹھایا۔

ان لوگوں میں عہد مغلیہ کے مشہور عالم اور مصنف شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۳ء کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مجدد الف ثانی اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا شاہ ولی اللہ نے اس کام کی رفتار اور تیز کر دی۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ مجدد الف ثانی چونکہ مسلمانوں کے عہد عروج میں ہوئے تھے، اس لیے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے پھیل گئی تھیں، لیکن شاہ ولی اللہ چونکہ ایک ایسے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بھی غور کیا اوراس کے علاج کے طریقے بھی بتائے..... مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت خراب تھی، بلکہ وہ اخلاقی حیثیت سے بھی زوال کی طرف جا رہے تھے۔ آرام طلبی، عیش وعشرت، دولت سے محبت، خودغرضی، بے ایمانی اور اسی قسم کی دوسری خرابیاں ان میں عام ہو گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف وتالیف اور اصلاح کا کام اسی نازک زمانہ میں شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ پھر سے ایک مضبوط سلطنت قائم کر دیں اور دوسری طرف وہ اپنی اخلاقی خرابیوں کو دور کر کے اور ان غیر اسلامی طریقوں اور رسم ورواج کو چھوڑ کر جو مسلمانوں میں عام ہوتے جا رہے تھے، دور اول کے مسلمانوں جیسی زندگی اختیار کر لیں۔

انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لیے بادشاہوں اور امراء سے خط و کتابت بھی کی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے اپنا مشہور حملہ جس میں اس نے پانی پت کی جنگ مرہٹوں کو شکست دی تھی، شاہ ولی اللہ کے ایک خط پر ہی کیا تھا۔(۷)

شاہ ولی اللہؒ نے نہ صرف سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور انہیں اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا درس دیا۔ اس کے علاوہ تصوف کی اور پیری مریدی کے طریقوں کی اصلاح کی۔

شاہ ولی اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ کیونکہ اس زمانے میں عربی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اور ملک کی عام زبان فارسی تھی۔ اس پر ملاؤں نے ہنگامہ برپا کر دیا اور اسے قرآن مجید کی بے ادبی قرار دیتے ہوئے تلواریں سونت لیں۔ بہر حال آہستہ آہستہ یہ طوفان تھما اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ قرآن مجید بغیر سمجھے تلاوت کی چیز نہیں۔ ضروری ہے کہ اس کے مطالب کو اچھی طرح سمجھا دیا جائے اور اس کی صورت ترجمے کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے علم تفسیر کے بارے میں کتابیں لکھیں اور علم و عرفان کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ (۸)

بلاشبہ شاہ ولی اللہ اپنی کوششوں کی وجہ سے اپنی صدی کے مجدد ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاک و ہند میں مسلمانوں کے زوال کے بعد جو بیداری پیدا ہوئی اور اس وقت جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان کے سرخیل شاہ ولی اللہ ہی ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے عالم مصلح اور رہنما تھے۔ اسی طرح ان کی اولاد میں ایسے ایسے عالم اور مصلح پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

سید احمد شہید (تحریک جہاد کے سرخیل)

اس میں شک نہیں کہ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے اور مسلمانوں پر ان کے بڑے احسان ہیں، لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ شہرت جس شخص کو حاصل ہوئی وہ بریلی کے ایک مجاہد سید احمد شہید ۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ ہیں۔ سید احمد شہید شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اس نازک دور میں جب کہ پاکستان اور ہندوستان پر غیر مسلموں کا غلبہ تھا، اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک زبردست تحریک شروع کی۔

سید احمد شہید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیمات سے خصوصاً جہاد کی طرف غافل ہو گئے ہیں۔

جس کی وجہ سے ان میں طرح طرح کی اخلاقی خرابیاں آ گئی ہیں..... مرہٹوں اور انگریزوں نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا ان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، لیکن ان علاقوں میں جن پر سکھوں کی حکومت قائم ہوئی، مسلمانوں کی اکثریت تھی، پھر سکھوں نے نہ صرف ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا بلکہ مسلمانوں پر ظلم بھی کیے۔ اس کے دور میں شاہی مسجد کا صحن گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مسقف حصے میں فوجی گودام تھا اور مرکزی محراب میں بیت الخلاء قائم تھا۔ نماز اور اذان پر پابندی تھی اور مسلمان عورتوں کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ سید احمد شہید کو جب سکھوں کے ان مظالم کا علم ہوا کہ پنجاب میں اذان اور نماز تک کی اجازت نہیں، مسجدوں میں گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی بیٹیاں جبراً چکلوں میں بٹھائی جاتی ہیں، تو انہوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ (۹)

حضرت سید احمد شہید اور اسماعیلؒ نے اپنی جہادی مہم کا آغاز سرحدی علاقے سے کیا۔ جذبہ جہاد اور نصرتِ الٰہی کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تحریک جہاد جاری تھی کہ علاقائی خوانین سازش کا شکار ہو گئے اور بغاوت شروع ہو گئی، چنانچہ سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہیدؒ اپنے رفقاء سمیت بالاکوٹ کے میدانوں میں شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہوئے۔ بعد میں باقی ماندہ مجاہدین نے لڑائی جاری رکھی اور یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء میں فیصلہ کن معرکہ ہوا، جس میں انگریزوں نے دہلی پر مکمل تسلط حاصل کر لیا اور برائے نام مغلیہ بادشاہت ختم کر دی گئی۔ (۱۰)

تحریک اصلاح (وہابی تحریک)

مسلمانوں کو اوہام و خرافات اور بدعات و غیر اسلامی رسم و رواج سے روکنے اور لوگوں کو توحید کی طرف مائل کرنے اور عقیدہ کی درستگی کے لیے ۱۷۴۴ء میں یہ تحریک اصلاح جزیرہ نمائے عرب میں وجود میں آئی۔ اس کے بانی مشہور مصلح محمد بن عبد الوہاب تھے۔ یہ تحریک اصلاح بعد میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ یوں تو اسلامی دنیا کا فکری زوال آٹھویں صدی ہجری کے اختتام پر اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ اجتہاد و نظر کے دروازے عرصہ ہوا بند ہو چکے تھے۔ متاخرین کے متون و حواشی اور منہیات علماء کے زیر درس تھے۔ عملی حالت اس سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی۔ لیکن بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں یہ انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ غیر مسلم بھی عہدِ صحابہ کے حالات سے اس دور کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے، تو انہیں تعجب و افسوس ہوتا۔ امریکی اہلِ قلم اسٹاڈرڈ کے بیان کے مطابق:

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔

مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے، اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے، جن کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی۔ کیوں کہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی طاعت بلا واسطہ ادا نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پسِ پُشت ڈال دی گئی تھی، بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ (مکہ و مدینہ) بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے۔ اور حج جس کو رسول اللہ نے فرائض میں داخل کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اگر محمد (ﷺ) پھر دنیا میں آتے، تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بُت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے"۔ (۱۱)

اس وقت باقی اسلامی دنیا کی طرح نجد اور عرب کے مسلمانوں میں بھی طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ قبروں پر جا کر مدد مانگنا اور ایسے کام کرنا جن کو شریعت نے روکا تھا، تیزی سے پھیل رہا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب تعلیم ختم کرنے کے بعد ان برائیوں اور بدعتوں کو ختم کرنے کے لیے میدان عمل میں اتر پڑے۔

محمد بن عبدالوہاب کئی سال تک وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کو کتاب و سنت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اس راہ میں ان کو طرح طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ان کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام کو جاری رکھا۔ آخر کار ۱۱۵۸ھ کے قریب نجد کے ایک شہر درعیہ کے امیر محمد بن سعود متوفی ۱۱۷۹ھ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے کا عہد کیا اور کتاب و سنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ امیر محمد بن سعود کی مدد سے ان کی تحریک سارے نجد میں پھیل گئی اور امیر کی حکومت بھی شہر درعیہ سے بڑھ کر سارے نجد میں قائم ہو گئی۔

محمد بن عبدالوہاب نے پچاس سال تبلیغ و اصلاح کا کام انجام دینے کے بعد ۱۷۹۲ء میں وفات پائی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں " کتاب التوحید" بہت اہم ہے۔ اس کتاب کی احیاء اسلام کی تاریخ میں وہی اہمیت ہے جو اسلامی ہند میں شاہ اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کی اور مغربی افریقہ میں عثمان دان فودیو کی "احیاء السنۃ" کی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اصلاح نے اسلامی دنیا پر گہرا اثر ڈالا۔ (۱۲)

اگرچہ وہابی تحریک خالص سیاسی معنی میں جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی تاہم روحانی طور سے اس کے قوی اثرات عالمِ اسلام کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اپنی رو میں بہا لے گئے۔ اس تحریک کی قابل تقلید مثال سے سنوسی تحریک، الاخوان المسلمون اور جماعتِ اسلامی کو حرکت ملی۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ بلکہ اس کی بقا کا دارومدار محمد بن عبدالوہابؒ ایسے مجدد دین کی روحانی اولاد ہی پر ہے۔ (۱۳)

سنوسی تحریک:

سید محمد الادریس کے جدامجد سید محمد ابن علی السنوسی الجزائر میں مستغانم کے قریب، ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ اسی سال وہابی تحریک کے موسس نے عرب میں وفات پائی۔ سید محمد ابھی دو برس کے بھی نہ تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ وہ ایک علمی اور خدا پرست خاندان میں پروان چڑھے..... جوان ہوئے تو مراکش چلے گئے۔ وہاں پہلے ضروری استعداد بہم پہنچائی اور پھر یونیورسٹی جامعہ قروین میں داخل ہو گئے، جہاں نامی گرامی اساتذہ سے قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی ان کے علم و فضل نے سلطان مراکش مولائی سلیمان کی نگاہِ توجہ ان کی جانب منعطف کرادی۔ سلطان نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کرنا چاہا، لیکن سید السنوسی نے جو کسی دنیوی اقتدار کے آگے جھکنے کے تصور ہی سے نفرت کرتے تھے، اس پیش کش کو رد کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے مراکش کو خیر باد کہا اور جہاں گشت علماء کی صف میں شامل ہو گئے۔ پہلے تونس گئے، پھر لیبیا اور مصر..... ۱۸۳۷ء میں انہوں نے پہلا زاویہ قائم کیا۔ یہ گویا اس تحریک کا آغاز تھا جو بعد ازاں سنوسی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ سنوسی تحریک کا مقصد خالص کتاب وسنت کی اساس پر عالم اسلام کا مکمل دینی احیاء تھا۔ اپنے اس کام میں السنوسی زیادہ تر امام احمد بن حنبلؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ اغلباً عرب کے مجدد محمد بن عبدالوہابؒ کی قائم کردہ نظیر بھی ان کے سامنے تھی۔ اگرچہ دونوں مجدد یکساں مقاصد، امنگیں اور نظریات رکھتے تھے تاہم تصوف کے بارے میں سنوسی تحریک کا رویہ وہابی تحریک سے بالکل مختلف اور زیادہ مؤدبانہ تھا...... وہ مقامی قبائل کی دیرینہ عداوتوں کو مٹانے اور بالآخر علاقے بھر کے خانہ بدوش قبائل کو مسلکِ اتحاد میں منسلک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جوں ہی اس علاقے میں امن وامان قائم ہوا جو زمانہء دراز سے عنقا تھا، انہوں نے اپنی توجہ افریقہ کے دور افتادہ گرم سیر خطوں میں اسلامی دعوت پھیلانے پر مرکوز کر دی۔ انہیں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی اس وقت ہوئی جب قبیلہ زویا نے استدعا کی کہ السنوسی ان کے ہاں تشریف لائیں، کفرہ میں زاویہ قائم کریں اور رہیں...... السنوسی نے اپنے معتمد مرید کفرہ بھیج دیئے۔ ہزاروں قبائلی جو نسلوں سے برائے نام مسلمان چلے آتے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ایک زبردست روحانی انقلاب نے ان کی زندگیوں کا رخ بدل دیا۔ ساتھ ہی ساتھ منطقہء حارۂ افریقہ کے بیشمار لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ (۱۴)

وہابی تحریک کے بعد سب سے زیادہ اثر عربوں میں اسی سنوسی تحریک کا ہوا۔ وہابی تحریک کے برخلاف چونکہ اس تحریک کا میدان دینی وسماجی امور کے علاوہ سیاسی بھی تھا۔

اس لیے اس تحریک کے لوگوں نے ترکوں کے ساتھ اٹلی کے خلاف ۱۹۱۸ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمی جنگ میں ان سنوسیوں نے لیبیا کو ایک طویل جدوجہد کے بعد اٹلی کے قبضہ سے آزاد کرایا۔ اس طرح اس تحریک نے عربوں میں اپنا اچھا اثر قائم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی اس کے اثرات عالم عرب میں پائے جاتے ہیں۔ (۱۵)

مہدوی تحریک:

اگرچہ مہدوی تحریک سوڈانی باشندوں کے ساتھ مصریوں کے ناروا سلوک پر سوڈانیوں کے شدید ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی مگر یہ ایک مکمل اصلاحی تحریک تھی جس کا آغاز محمد احمد بن عبداللہ مہدی نے سوڈان میں ۱۸۸۳ء میں کیا۔ ان کے پیروکار درویش کہلاتے تھے۔ اس تحریک کا اصل مقصد مسلمانوں کے اندر سامراجی طاقتوں کے خلاف جہاد کی روح کو بیدار کرنا اور عام مسلمانوں کو خرافات و بدعات سے روکنا تھا۔

مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی رہنما اور ایک حکومت کے بانی ہی نہیں تھے، بلکہ نائجیریا کے عثمان دان فودیوں کی طرح ایک مصلح بھی تھے۔ انہوں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی تھی اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مصر میں جمال الدین افغانی سے بھی ملاقات کی تھی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں۔ وہ اپنی تمام زندگی احکام اسلام کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سوڈان کے شہر بربرہ میں اپنے استاد کا پیش کیا ہوا کھانا محض اس وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا کہ اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے مرشد سے محض اس وجہ سے قطع تعلق کر لیا کہ شیخ نے اپنے بچوں کی ختنہ کی تقریب میں ناچ گانے کا انتظام کیا تھا۔

۱۸۸۰ء میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد مہدی سوڈانی تصوف کے سلسلہ سمانیہ کے سربراہ ہو گئے۔ انہوں نے کئی سال سے دریائے نیل کے ایک جزیرے آبا (ABA) میں رہائش اختیار کر لی تھی اور یہیں سے انہوں نے اپنی تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک ۲۹ جون ۱۸۸۱ء کو اس وقت شروع ہوئی جب مہدی سوڈانی نے سوڈان کے ممتاز لوگوں کو کتاب و سنت کی بالادستی قائم کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس مقصد کے لیے تیار رہنا چاہیے اور یہ کہ ان کے پیروؤں کو چاہیے کہ وہ ہجرت کر کے جزیرۂ آبا میں آ جائیں پس اس واقعہ کے بعد سے سوڈان کے مصری حکام اور مہدی کے حامیوں میں جھڑپیں ہونا شروع ہو گئیں جو بالآخر مہدی کی فتح پر ختم ہوئیں۔ مہدی سوڈانی نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد نیل کے مغربی کنارے پر خرطوم کے بالمقابل ام درمان کے شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ مہدی سوڈانی نے حکومت سنبھالتے ہی اصلاحات شروع کر دیں..... مہدی سوڈانی کا جانشین خلیفہ عبداللہ (۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۸ء) حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر درویشوں کا حملہ ناکام ہوگیا اور مصری فوج نے اپنے نئے انگریز سردار لارڈ کچز کی قیادت میں ۱۸۹۸ء میں سوڈان پر حملہ کردیا۔ درویشوں نے اگرچہ بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن جدید اسلحہ سے لیس فوج کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ خلیفہ عبداللہ نومبر ۱۸۹۹ء میں جنگ میں کام آیا اور سوڈان پر برطانوی تسلط قائم ہوگیا..... ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء میں درویشوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں، لیکن وہ کچل دی گئیں۔ انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروؤں کو اپنے دور میں بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اب سوڈان میں مہدی محمد احمد کو سوڈان کی تحریک بیداری کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔(۱۶)

الاخوان المسلمون:

اس تحریک کا آغاز مصر کے ایک مدرس حسن البناء (پیدائش ۱۹۰۶ء) نے مصر کے ایک شہر اسماعیلیہ میں ۱۹۲۷ء میں کیا۔ اس کا بنیادی مقصد عوام کی دینی و اسلامی خطوط پر اصلاح اور شرعی اصولوں پر اسلامی معاشرہ کا قیام تھا۔ جس تیزی سے یہ تحریک عرب ممالک میں مقبول ہوئی اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔(۱۷) جب قاہرہ میں امام حسن البنا نے یہ دیکھا کہ لوگ اسلام سے ناآشنا اور بے خبر ہیں تو انہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ اصلاح کا کام بالحکمة والموعظة الحسنه کے طرز پر کریں گے اور پھر انہوں نے قہوہ خانوں اور دیگر پبلک مقامات پر حکمت کے ساتھ وقت کو ضائع کرنے سے بچانے اور مقصد حیات کی طرف توجہ دلانے میں لگے رہے۔

امام حسن البناء ابتداء ہی سے ایک ایسی تحریک پیدا کرنا چاہتے تھے جو مکمل طور پر قوم و ملت کی رہنما ہو اور اس ملت کے تمام معاملات قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہوجائیں۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔

حسن البناء شہید نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ نہ صرف اسلام کے اصول و قواعد بتائے بلکہ اسلامی نظام حکومت و نظام سیاست کے خدوخال کو مدلل و اصلاحی انداز میں بیان کیا اور خواص و عوام تک یہ بات پہنچائی۔ لہٰذا ہر کسی نے یہ جان لیا کہ اسلامی نظام حکومت ہی مسلم امہ کی بقا کی ضامن ہے۔

تحریک کی اہم ترین سرگرمیوں میں اخوان تعلیم اور مختلف قسم کی درس گاہیں کھولنے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر مصری حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری اسکولوں میں دینی تعلیم رائج کریں اور نوخیز نسل کو اعلیٰ اخلاقی نظریات کی تعلیم دیں۔

اس پروگرام کے چار اہم مقاصد تھے: دینی اعتقادات کا فروغ، اعلیٰ اخلاقی معیار، قوم کے اسلامی ماضی کی میراث پر فخر وناز، سائنس کے تمام شعبوں میں متخصصین (Specialists) کی تیاری تا کہ ایک مضبوط و مستحکم بنیاد پر اسلامی نشاۃ نو کا دور شروع کیا جا سکے...... اخوان نے تعلیم کے فروغ واشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ مرکز میں ایک کمیٹی بنائی جس کا کام لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ابتدائی، ثانوی اور فنی مدارس قائم کرنا تھا، ایسے مدارس جن کی امتیازی شان اسلامی کردار ہو، ناخواندگی ختم کرنے کے لیے اخوان نے متعدد اسکول کھولے جن میں مزدوروں اور کسانوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی..... اخوان نے ملک کے ہر حصے میں مسجدیں تعمیر کیں، کچھ ارکان مسجد کے لیے قطعہ ءزمین دیتے باقی اس کی تعمیر کے اخراجات ادا کرتے۔ اخوان کی اکثر شاخوں کی اپنی مساجد تھیں...... اخوان نے اپنی تحریک میں خواتین کو روزِ اول ہی سے شامل کیا۔ "اخوات المسلمون" شاخوں کے بھی وہی نظریات تھے جو مردوں کے تھے۔ بس انہیں خواتین کی ضروریات کے مطابق بنالیا تھا۔ ان کا مقصد خواتین کو عزت، نیکی اور عصمت وعفت کے مدارج عالیہ سے ہمکنار کرنا تھا۔ "اخوات" کی سرگرمیاں تعلیم اور سماجی بہبود کے امور پر مرتکز تھیں..... اخوان کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاد کی زبردست اہمیت پر مسلسل زور دیتے تھے۔ جہاد کے بارے میں ان کا نقطہءنظر وہی تھا جو ابتدا ہی سے مسلمانوں کا رہا ہے۔ اسی نقطہءنظر کی وہ تبلیغ کرتے اور کسی قسم کی مرعوبانہ ذہنیت اور معذرت پسندانہ مصلحت سے کام نہ لیتے تھے اور نہ معذرت پسندوں کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت روا رکھتے تھے۔ (۱۸)

چنانچہ انہوں نے پہلے عوام کی ذہن سازی گاؤں گاؤں اور شہر شہر جا کر کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی سرکاری ملازمین فوج کالج و مدارس کے اساتذہ وطلباء کی ایک بڑی تعداد شیخ کی تحریک کی نہ صرف مؤید بلکہ ترجمان بن گئی۔ لیکن مصری حکومت نے جب اسلامی بیداری کے اس خطرہ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو منصوبہ بنایا کہ اس اسلامی بیداری کے اصلی محرک کا کام ہی تمام کردیا جائے۔ چنانچہ حسن البناء کو مصری حکومت نے ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء میں شہید کر دیا۔ جس کے بعد شیخ حسن ہیضی اس کے امیر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں مصری حکومت نے اس جماعت پر پابندی لگادی اور ۱۹۶۶ء میں اس کے ممتاز قائد اور اسلامی مفکر ومفسر قرآن سید قطب کو پھانسی پر چڑھا کر شہید کر دیا لیکن حکومت کا منصوبہ ناکام رہا اور اس کا اثر برابر بڑھتا گیا مصر میں اس تحریک کو دبایا گیا تو اس نے سوڈان، الجزائر، اردن اور فلسطین میں جا کر سر اٹھا دیا، اور آج حال یہ ہے کہ ہر عرب ملک میں قانونی یا غیر قانونی طور پر اس تحریک کا نمایاں وجود ہے۔ (۱۹)

تحریک دعوت وتبلیغ:

لوگوں کو دین کی دعوت دینے کی عالمی سطح پر ہونے والی جدوجہد میں بلاشبہ تحریک دعوت وتبلیغ کا کردار نمایاں ہے۔

ملت اسلامیہ کی اصلاح اس کی اخلاقی رہنمائی اور ایمان وعقیدہ کی پختگی کی دعوت کے ساتھ یہ خالص دینی ومذہبی غیر سیاسی تحریک ہندوستان کی آزادی سے ۲۰/۲۲ سال قبل وجود میں آئی، اس کا آغاز مصلح ملت حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ نے دہلی کے قریب میواتیوں میں اپنے تجربہ کے ساتھ کیا۔ ان کے اخلاص اور دینی تڑپ وکڑھن کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی یہ تحریک ملک کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی کی امارت میں اس کا دائرہ اثر بیرون ملک تک وسیع ہو گیا۔ اور آج نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے تقریباً ہر اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد موجود ہے وہاں اسکے دعوتی وفود پہنچ چکے ہیں اور عالم اسلام ایک بہت بڑا طبقہ اس سے نہ صرف متاثر بلکہ عملاً اس سے وابستہ بھی ہے۔ اس کا عالمی مرکز دہلی میں بنگلہ والی مسجد ہے۔ جہاں پوری دنیا کی سطح پر اس کام سے متعلق مشورے ہوتے ہیں اور دنیا کے مختلف ممالک میں دعوتی وفود روانہ کیے جاتے ہیں۔ (۲۰)

اس تحریک کی دعوت دین ہی کا نتیجہ ہے کہ غیر اخلاقی کاموں میں مشغول اہم شخصیات توبہ تائب ہو کر نہ صرف اس تحریک کا حصہ بن گئے بلکہ اخلاقی اعمال کی دعوت دینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ دعوت وتبلیغ کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا بھر سے ہزاروں غیر مسلموں نے اس تحریک کی دعوت کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو سمجھے اور اس تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

تحریک اسلامی (جماعت اسلامی):

جماعت اسلامی کی تحریک کا آغاز ۱۹۳۳ء سے ہوتا ہے جب مولانا مودودیؒ نے اپنے اردو ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں اسلامی نظامِ حیات کے موضوع پر باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ جدید مغربی تہذیب مسلمانوں پر جس طرح اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہو رہے تھے، "ترجمان القرآن" نے ان پر بطور خاص توجہ کی۔ مولانا نے اپنے پرزور استدلال اور واضح ادبی اسلوب سے اس مادہ پرستانہ فلسفے کی مؤثر تردید کی جو مسلمان نوجوان کے ذہن کو ماؤف کر رہا تھا۔ اس طرح بڑی کامیابی کے ساتھ اسلامی نظامِ حیات کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے..... ان مضامین کے ذریعے مولانا نے ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں اور ہندوستان کی دوسری قوموں سے جداگانہ تشخص رکھتے ہیں۔

تحریک کا یہ دور تقریباً آٹھ برس پر محیط تھا۔ اب اسلامی نظامِ حیات کے قیام کی اجتماعی جدوجہد کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ مولانا نے ان تمام لوگوں کو جو ان کے نظریات سے متفق تھے، دعوت دی کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور باقاعدہ تنظیم کی صورت اختیار کریں۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا مودودی اور ۷۵ دوسرے اصحاب لاہور میں جمع ہوئے اور جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ (۲۱)

اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی میں متعدد ایسی صفات جمع تھیں جو ان کو ذہنی قیادت کے منصب بلند پر پہونچا سکتی تھیں، ان کو قدرت کی طرف سے ایک سلجھا ہوا دماغ، پرزور قلم اور ایک طاقتور اسلوب ملا تھا، وہ مغرب کے جدید مکاتب فکر اور فلسفوں سے واقف تھے، دوسری طرف ان کو اسلام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کی صلاحیت پر عقیدہ تھا، مغربی تہذیب و افکار کی تنقید اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و ترجمانی میں ان کی تحریریں اعتماد اور طاقت سے پُر ہوتی تھی اور اس معذرت آمیز اور مدافعانہ لہجہ اور طرز سے پاک جو اس سے پہلے کے مسلمان اہلِ قلم اور مصنفین کا شعار بن گیا تھا۔ (۲۲)

جماعت کے دستور کے مطابق اقامت دین جماعت کا نصب العین، اسلامی اخلاقیات جماعت کا طریقہ کار اور اسلام کا شورائی نظام جماعت کا نظم ہے۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان و سری لنکا میں اسلامی افکار و تعلیمات کی نشر و اشاعت اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہن سازی میں اس نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسلامی لٹریچر کی نشر و اشاعت علاقائی زبانوں میں قرآن و حدیث کے تراجم مدارس کے قیام وغیرہ کا کام بھی بڑی ہی منصوبہ بندی و پلاننگ کے ساتھ کرتی ہے۔ (۲۳)

جماعت اسلامی واحد جماعت تھی جو مارشل لا کی پابندیوں سے برسرِ اقتدار طبقے کی مؤثر سیاسی حریف بن کر ابھری۔ اس نے نئے دستور میں ترامیم کرنے اور اس میں ۱۹۵۶ء کے دستور کی اسلامی و جمہوری دفعات شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ برسرِ اقتدار گروہ نے سرکاری اخبارات میں جماعت اسلامی کے خلاف جھوٹے پراپگنڈے کی مہم شروع کر دی اور جماعت کو ہر ممکن طریقے سے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ یہ مہم ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ جماعتِ اسلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور مولانا مودودیؒ اور جماعت کے اکثر رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ اس اقدام سے پہلے جماعت کے شدید ترین نقاد بھی یہ اعتراف کر چکے تھے کہ اس نے آج تک ملکی قانون کی خلاف ورزی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۳ء کو مولانا مودودیؒ نے اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا جو نوائے وقت اور لاہور کے دوسرے اخبارات میں شائع ہوا۔

اس بیان میں مولانا نے فرمایا تھا:

"میں اصولی طور پر تمام غیر قانونی، غیر دستوری اور خفیہ طریقہ ہائے کار کا مخالف ہوں۔ میری یہ رائے کسی مصلحت یا خوف کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے۔ سالہا سال کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد میں اس قطعی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قانون کا احترام بجائے خود کسی مہذب معاشرے کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے اور اگر کوئی تحریک یا جماعت ایک مرتبہ اس احترام کو پامال کر دیتی ہے تو پھر جب وہ خود برسر اقتدار آتی ہے تو اس کے لیے اس احترام کو بحال کرنا فی الواقع ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خفیہ جدو جہد کی فطرت ہی میں ایسے نقائص اور کمزوریاں ہیں کہ جو لوگ اس سے کام لیتے ہیں وہ خود ان لوگوں سے زیادہ خطرناک بن جاتے ہیں جن کو وہ الگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے ہمیشہ کھلے عام اور مروجہ دستور کے قانونی حدود میں رہتے ہوئے کیا ہے۔ حتیٰ کہ میں نے اُن قوانین کی خلاف ورزی بھی کبھی نہیں کی جن کے خلاف میں بڑی سخت جنگ لڑتا رہا ہوں"۔ (۲۴)

اس وقت اس تحریک کا وجود ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، افغانستان وغیرہ میں ہے اس کے علاوہ عرب و آزاد اسلامی ممالک و مسلم اقلیتی ممالک میں بھی اس کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لیے برابر سر گرم عمل و کوشاں ہے۔ اس طرح عالمی سطح پر اسلامی جماعتوں اور تحریکوں میں اس کا ایک نمایاں مقام بن گیا ہے۔ (۲۵)

فصل دوم

عالم اسلام اور اس کے وسائل

عالم اسلام پر ایک نظر:

اللہ رب العزت نے عالم اسلام کو ایٹمی، مالی، مادی، روحانی، طبیعی اور افرادی ذرائع و وسائل اور صلاحیتوں سے مالا مال کر رکھا ہے، جو اسلام کے روشن مستقبل کے لیے کافی ہے اور عصر حاضر کے مادی، سیاسی اور الحادی نظریات اور چیلنجوں کو قبول کرنے اور تمام عصری تقاضوں اور مطالبوں کو پورا کرنیکی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ اب عالم اسلام کے سوا کسی عالمی طاقت میں ہمت نہیں ہے کہ وہ وقت کے موجودہ دھاروں کو کوئی بہتر تعمیری موڑ دے سکے۔ الحمد للہ! تقریباً ستاون سے زائد اسلامی ممالک آج دنیا کے نقشے پر موجود ہیں۔ اسی طرح امت مسلمہ آج عددی اعتبار سے دنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہورہی ہے۔ اسلام جو امت مسلمہ کی بنیاد ہے ایک عالمی مذہب کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اگر ہم دنیا پر طائرانہ نظر بھی ڈالیں تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امت مسلمہ عددی، فوجی و مادی وسائل کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں ہے۔

رقبہ: دنیا کے جملہ ممالک کا مجموعی رقبہ ۱۴ کروڑ مربع کلو میٹر، مسلم ممالک کا مجموعی رقبہ ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ مربع کلومیٹر، رقبہ میں مسلم ممالک کا تناسب ۲۵%۔

آبادی پوری دنیا کی مجموعی آبادی ۵ ارب ۴۸ کروڑ، مسلم آبادی ۱ ارب ۲۷ کروڑ، دنیا میں تناسب مسلم آبادی ۲۳%

افواج دنیا کے جملہ ممالک کی افواج ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ (تقریباً)، مسلم ممالک کی جملہ افواج ۸۵ لاکھ، دنیا کی افواج میں مسلم افواج کا تناسب ۲۵%

پیداوار مسلم ممالک کی اہم پیداوار دنیا کی جملہ پیداوار میں

پٹرول ۸۴%، کولبائٹ (دھات) ۹۰%، ربڑ ۸۰%

ٹین ۵۳%، کھجور ۹۵%، باجرہ ۷۵%

ناریل ۸۰%، ریشمی روئی ۷۵% (۲۶)

اس کے علاوہ پٹرول پوری دنیا میں سب سے زیادہ خلیجی عرب ممالک میں ہوتا ہے اور مسلم امہ کو اس پر بھی فخر ہے کہ وہ بھی ایٹمی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کفر لرزہ براندام ہے۔ اب صرف اور صرف ضرورت اس بات کی ہے ان مادی وسائل و طاقت کو ایمانی طاقت کے تابع کر کے امت کی فلاح کے لیے استعمال کیا جائے اور اس بات کو نگاہ میں رکھا جائے کہ ہمارا دشمن بہت ہی چالاک وعیار ہے، وہ ہمارے وسائل و طاقت کو ہمارے ہی خلاف مختلف بہانے اور مسائل پیدا کر کے استعمال کرتا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم ان کی چالوں میں آجاتے اور فریب کاری کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ہم ایمانی طاقت اور اس کے تقاضے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے واضح کہہ دیا ہے کہ:

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝ (۲۷)

ترجمہ: یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہدو کہ راستہ بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد، جو تمہارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔

یقین جانیے کہ اگر آج بھی امت کے رہبروں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی مادی صلاحیتوں اور طاقتوں کو ایمانی طاقت میں باہم یکجا کر کے امت کی رہنمائی کریں گے تو پھر اسلام کے روشن مستقبل میں کوئی کلام رہنا ناممکن ہے۔ صرف اپنی حقیقت سے آشنائی ضروری ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کو جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو، راہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو (۲۸)

فصل سوم

مساعئ تعمیر واستحکام امت

ملت اسلام اور ملت کفر کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں کا نظر وفکر الگ الگ ہے۔ عروج و زوال بغیر اسباب کے نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کا ماضی اگرچہ بہت شاندار تھا لیکن اسباب زوال نے مسلم امہ کو بھی زوال کی طرف کھینچ لیا۔ مگر عروج کی حامل ملت کفر نے نہ صرف انسانیت اور اخلاقی قدروں کو پامال کیا بلکہ مسلم امہ کے ساتھ بغض وعناد اور اپنے مکر وفریب سے ان کو دبائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب مسلمان ممالک میں آزادی کی تحریکوں نے آزادی ملتِ اسلامیہ کا نعرہ بلند کیا تو ملت کفر نے پوری طاقت سے راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اول مسلمانوں کی آزادی سے انکار کیا۔ جب مجبوراً ایسا کرنا پڑا تو اسلامی معاشرے میں اپنا حلیف طبقہ پیدا کیا۔ اور اس کے ذریعے اسلامی معاشرے میں مختلف مسائل پیدا کر کے مسلمانوں کو ایمانی قوت سے محروم کرنے کی ہر کوشش پر اربوں ڈالر خرچ کر ڈالے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو غلامی کے دور میں اپنے مسائل ومشکلات کا اندازہ ہوا اور انہوں نے اتحادِ عالم اسلام کے لیے ہر سطح پر منظم کوششیں شروع کیں۔ (۲۹)

جس کا ایک مختصر جائزہ پیش نظر ہے:

مؤتمر العالم الاسلامی:

حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے وقت مسلمانوں کی مرکزیت آپ کی ذات تھی رسالت مآب ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں نے اجتماعی اعتبار سے خلافت کو اپنے لیے اتحاد کی علامت قرار دیا جب ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو عالم اسلام پر شدید ظلمت طاری ہونے لگی صاحب نظر مسلمانوں نے عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ علی برادران اور مفتی اعظم فلسطین کی کوششوں سے ۱۹۲۶ء میں عالم اسلام کے اتحاد کے لیے مکہ مکرمہ میں شاہ عبدالعزیز بن سعود کی سربراہی میں مسلمانوں زعماء کا اہم اجلاس ہوا اس میں انڈونیشیا سے عمر شوکر دمینوتو ہندوستان سے علی برادران مفتی کفایت اللہ علامہ سید سلمان ندوی۔ فلسطین سے الحاج سید امین الحسینی لبنان سے علامہ رشید رضا الحاج شیخ اسمٰعیل الحافظ مصر سے شیخ الازہر علامہ محمد طنطاوی ترکی سے ثروت بے اور جار جیا سے سعید نے شرکت کی اس اجلاس میں مؤتمر العالم الاسلامی کا قیام عمل میں آیا۔

عالم اسلام کی دوسری عالمی مؤتمر کانفرنس ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں منعقد ہوئی اس میں عراق سے اکبر آیت اللہ ایران سے ضیاء الدین طباطبائی جو بعد میں ایران کے وزیراعظم ہوئے شام سے شکری القواتلی جو بعد میں شام کے صدر چنے گئے لبنان سے ریاض الصلح جو بعد میں لبنان کے وزیراعظم منتخب ہوئے مصر سے سید علوبہ پاشا شیخ موسیٰ جاراللہ برصغیر پاک و ہند سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی اور مولانا غلام رسول مہر نے شرکت کی۔

موتمر العالم الاسلامی کا سیکرٹریٹ ۱۹۳۹ء تک بیت المقدس میں رہا بیت المقدس پر صیہونی قبضے کے بعد اس ادارے کی سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئیں...... اس کے اغراض و مقاصد میں سے یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہر قسم کی خدمات انجام دینا، کسی ملک کی سلیت و آزادی کو متاثر کیے بغیر عالم اسلام اور عام مسلمانوں کے مسائل کا حل تلاش کرنا، اسلامی ممالک میں رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود کی بنیاد پر ہونے والے متعصبانہ امتیازات کو ختم کرانا.... وہ تحریکیں جو دنیا کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام کر رہی ہیں ان کی معاونت کرنا، بین الاقوامی سطح پر قیام امن و سلامتی کے لیے ساز گار ماحول پیدا کرنا اور مندرجہ بالا اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے تمام مساعی سے کام لینا۔ مؤتمر العالم الاسلامی نے دو درجن سے زائد بلند پایہ کتب کی اشاعت کے علاوہ عالم اسلام کی حمایت کے لیے اقوام متحدہ میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم ہے اور موتمر العالم الاسلامی کی کوششوں سے اسلامی بنک، اسلامی نیوز ایجنسی، اسلامی تحقیقاتی ادارہ، فقہ اکیڈمی اور اسلامی نشریاتی ادارہ کے قیام میں مدد ملی۔ (۳۰)

رابطہ عالم اسلامی:

رابطہ عالم اسلامی دنیا میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت، دینی تعلیم کے جدید ذرائع روشناس کرانا، مسلمانوں کے درمیان باہمی اتحاد کو فروغ دینے اور آپس کے اختلافات کے ازالہ کے علاوہ دین کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے مسلم مبلغین و علماء و لیڈران کے درمیان رابطہ جیسے عظیم مقاصد کے حصول کے لیے اس کا قیام مئی ۱۹۶۲ء کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ میں عمل میں آیا اس کے تاسیسی ارکان میں آزاد مسلم ممالک کے علاوہ مسلم اقلیتی ممالک کے علماء و مفکرین اور ماہرین تعلیم بشمول ہندوستان سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ العالی شامل تھے۔

اس کا صدر دفتر مکہ مکرمہ میں ہے اور اس کے ذیلی دفاتر جو اب تک ۲۵ سے زائد ہو چکے ہیں ایشیاء، یورپ و امریکہ و افریقہ کے مختلف شہروں میں قائم ہیں۔ ہزار سے زائد علماء و مبلغین پر مشتمل اس کے دعوتی وفود اسلام کی اشاعت و ترجمانی جیسے اہم کام پر امریکہ، یورپ، ایشیاء و افریقہ کے مختلف ممالک میں مامور ہیں جن کے اخراجات خود رابطہ برداشت کرتی ہے۔

اس کی طرف سے دنیا کی مختلف علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم طبع ہو چکے ہیں چونکہ اس کے قیام میں حکومت سعودیہ کا زیادہ حصہ ہے اس لیے اس کے ۹۹% اخراجات وہی برداشت کرتی ہے البتہ ۱% اخراجات دیگر مسلم ممالک اور اہل خیر کے تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ رابطہ کی انتظامیہ جس کو مجلس تاسیس کا نام دیا گیا ہے۔ ۵۶ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جس کا ذمہ دار جنرل سکریٹری ہوتا ہے۔ شیخ محمد سرور الصبان (سابق وزیر مالیات حکومت سعودیہ) اس کے بانی اور اولین جنرل سکریٹری تھے۔ اس کے ذیلی شعبے اور ادارے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **عالمی مجلس برائے مساجد:** دنیا بھر میں مساجد کا قیام عہد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طرز پر مساجد کا احیاء اور اس کے لیے ائمہ مساجد کی تربیت کا انتظام اور دنیا میں قائم مختلف مساجد کی حفاظت اس کا بنیادی مقصد ہے اس کمیٹی کے تعاون سے دنیا کے مختلف علاقوں میں ہزاروں مساجد اب تک تعمیر ہو چکی ہیں۔

۲۔ **اسلامی فقہ اکیڈمی:** حالات کے تقاضوں کے تحت پیش آنے والے جدید فقہی مسائل کو قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کرنا دنیا کے سامنے اسلامی فقہ کی بالادستی کو ثابت کرنا اور اس کے لیے افراد تیار کرنا اس کا عین مقصد ہے اس کے ممبران میں علماء اور فقہا اور ماہرین معاشیات شامل ہیں۔

۳۔ **اسلامی تنظیمات کمیٹی:** یہ کمیٹی مختلف ممالک میں قائم اسلامی اداروں جماعتوں اور تنظیموں کے مابین اتحاد کی کوشش کرتی ہے۔ (۳۱)

۴۔ **سیکریٹریٹ:** رابطہ کا صدر دفتر مکہ مکرمہ میں ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے سیکریٹریٹ مکہ میں سیمینار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں مختلف ممالک اپنی نمائندگی کرتے ہیں۔ مسلم ورلڈ آرگنائزیشن کانفرنس کے ذریعے اسلامی ممالک کے اداروں میں قریبی تعاون کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں۔ رابطہ الاسلامی کے نام سے ایک مجلّہ شائع ہوتا ہے۔ اس میں اسلامی و تعلیمی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کی تقسیم پورے عالم اسلام کے ممالک میں ہوتی ہے۔ رابطہ کے ذریعے ہر ہفتے اخبار العالم نکالا جاتا ہے۔ ۱۹۷۳ء سے ایک رسالہ انگریزی میں شائع ہو رہا ہے، مزید دینی کتب کی اشاعت کے لیے تیاریاں کی جارہی ہیں۔ مجموعی طور پر عالم اسلام کو قریب لانے، ان میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے یہ ادارہ اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ (۳۲)

عرب لیگ:

عرب ممالک کے آپسی تعلقات کو استوار کرنے اور ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو دور کرنے اور آپس میں معاشی، سیاسی اور ثقافتی تعاون کو فروغ دینے کے لیے ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء میں مصر کی کوششوں سے اس کا قیام عمل میں آیا۔

گویا دوسرے الفاظ میں یہ وحدت عرب کی طرف پہلا قدم تھا۔ابتداء میں اس کے ارکان صرف سعودی عرب، عراق، مصر، شام، اردن اور یمن تھے۔بعد میں الجزائر، بحرین، کویت، لبنان، موریطانیہ، مراکش، عمان، فلسطین، قطر، صومالیہ، سوڈان جیبوتی، تیونس اور متحدہ عرب امارات اس میں شامل ہوگئے۔سربراہان مملکت اور وزراء خارجہ دونوں سطح پر اس کے سالانہ اجلاس مختلف ممالک میں منعقد ہوتے ہیں۔اس کا ذمہ دار جنرل سکریٹری ہوتا ہے اور اخراجات ممبر ممالک خود ادا کرتے ہیں۔پہلے اس کا مرکزی دفتر قاہرہ (مصر) میں تھا لیکن ۱۹۷۹ء میں مصر کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات کے قیام کے بعد اس کا صدر دفتر تیونس منتقل ہوگیا۔(۳۳)

اسلامی کانفرنس تنظیم:

۱۹۶۹ء میں قائم ہونے والا عالم اسلام کا یہ اہم ادارہ مسجد اقصیٰ میں اسرائیل کی طرف سے آتش زنی جیسے گھناؤنے اور مجرمانہ حرکت کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر مشترکہ موقف اپنانے کے لئے یہودی حملے کے ردعمل کے طور پر عمل میں آیا۔امت مسلمہ کے مسائل کے حل کے لئے اب تک کے قائم ہونے والے اداروں میں یہ سب سے بڑا سیاسی ادارہ ہے۔ستاون اسلامی ممالک اس کے رکن ہیں۔اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا مستقل دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم ہے۔اس وقت او آئی سی کے جنرل سیکریٹری اکمل الدین احسان اوغلو ہیں جن کا تعلق ترکی سے ہے۔

اس کے بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ مسلم ممالک کے درمیان اتحاد قائم کرنا۔

۲۔ ممبر ملکوں کے درمیان اقتصادی، دینی، سیاسی، ثقافتی اور علمی تعاون کو فروغ دینا۔

۳۔ مسلم ممالک کی آزادی اور اس کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرنا۔

۴۔ اسلام کے مقدس مقامات کی حفاظت کرنا۔

۵۔ مسلم ممالک کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو آپس میں مل بیٹھ کر حل کرنا۔(۳۴)

۲۲ سے ۲۵ ستمبر ۱۹۶۹ء تک مراکش کے صدر مقام رباط میں پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔اس اجلاس میں ۲۴ ممالک کے سربراہان نے شرکت کی۔اس میں عالم اسلام خصوصاً مشرق وسطیٰ کے مسائل پر غور کیا گیا اور اسلامی ممالک کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون پر زور دیا گیا اس کے بعد وزرائے خارجہ کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہے۔

اس سلسلے کی پہلی کانفرنس مارچ ۱۹۷۰ء میں جدہ میں منعقد ہوئی اس موقع پر اسلامی کانفرنس کو ایک مستقل ادارے کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ افغانستان میں روسی مداخلت پر غور کرنے کے لیے ۱۹۸۰ء میں اسلامی کانفرنس کا غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کی جارحیت کے خلاف موثر تعاون بڑھانے کے لیے مسلم ممالک کے سربراہان پاکستان تشریف لائے یہ پاکستان کے لئے بڑا اعزاز تھا۔ دوسری سربراہ کانفرنس ۲۲ سے ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء تک لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں چالیس اسلامی ممالک نے شرکت کی۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کا اسلامی ملت کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ (۳۵)

او آئی سی کا صدر دفتر جدہ (سعودی عرب) ہے۔ اس تنظیم کا ایک جنرل سکریٹری اور اس کے چار معاون سکریٹری ہوتے ہیں اس کے تین اہم شعبے ہیں۔

۱۔ سربراہان مملکت کی سطح پر ۲۔ وزراء خارجہ کی سطح پر ۳۔ سکریٹیریٹ

دستور کی روسے ہر تین سال میں مسلم ممبر ملکوں کے سربراہان کا اجلاس ضروری ہے.... تنظیم کا اپنا ایک دستور بھی ہے۔ جس کو اس کے ممبران نے ۱۹۷۲ء میں منظوری دی ہے۔ اس کے کئی ذیلی شعبے ہیں۔

۱۔ اسلامی بین الاقوامی عدالت ۲۔ مجلس فقہ اسلامی ۳۔ اسلامی ترقیاتی بینک

۴۔ اسلامی تجارتی واقتصادی شعبہ ۵۔ اسلامی خبر رساں ایجنسی ۶۔ اتحاد اسلامی کمیٹی وفنڈ

۷۔ ادارہ آثار اسلامی ۸۔ تحفظ بیت المقدس کمیٹی ۹۔ ادارہ برائے سائنس وٹیکنالوجی

۱۰۔ مسلم ممالک کی راجدھانیوں کی انجمن ۱۱۔ مرکز برائے مطالعہ اسلامی ثقافت واسلامی فنون

اس کے اخراجات عام طور پر ممبر اسلامی ممالک ہی فراہم کرتے ہیں جس میں سرفہرست خلیجی عرب ممالک ہیں۔ (۳۶)

خلیج تعاون کونسل:

جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں کے نظام معاشرت میں یکسانیت، زبان، ثقافت اور مزاج کی ہم آہنگی کے پیش نظر زندگی کے مختلف میدانوں میں تعاون کی خاطر اس کا قیام ۲۵ مئی ۱۹۸۱ء کو ابوظہبی (متحدہ عرب امارات) میں عمل میں آیا۔ اس کے ممبر ممالک میں سعودی عرب، بحرین، قطر، عمان، کویت اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔ جو اپنی خود مختاری کی بقاء کے ساتھ زندگی کے مختلف میدانوں میں یک جہتی و یکسانیت کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کونسل سفارتی سطح پر غیر وابستہ تحریک کی حمایت کرتی ہے۔ اس کا صدر دفتر ریاض (سعودی عرب) میں ہے۔

اس کے اخراجات ممبر ممالک مساوی طور پر برداشت کرتے ہیں۔اسی کونسل کے تحت آپسی صنعت وحرفت، تجارت و زراعت کے فروغ کے لیے خلیجی سرمایہ کاری کارپوریشن کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔اس کے شعبے مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ شعبہ سربراہان مملکت: ۲۔ شعبہ وزراء خارجہ ۳۔ شعبہ دیگر وزراء

۴۔ سکریٹریٹ (انتظامیہ)

ان سب کا ذمہ دار جنرل سکریٹری ہوتا ہے جو ممبر ممالک ہی سے منتخب کیا جاتا ہے۔(۳۷)

اسلامی ترقیاتی بنک:

یہ دراصل اسلامی کانفرنس تنظیم ہی کا ایک ذیلی ادارہ ہے لیکن اپنے مقاصد اور عملی میدان میں اس کی کامیابی ووسعت کے پیش نظر اس کی اپنی ایک الگ حیثیت وشناخت بن چکی ہے۔

پوری دنیا کے اندر اسلام کے اصولوں پر قائم غیر سودی بنیادوں پر تجارت کو فروغ دینا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس کا قیام ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا۔تب سے اس کا دائرہ برابر وسیع ہو رہا ہے۔اس کا مرکزی دفتر جدہ میں ہے۔اسلامی ممالک کے وزراء مالیات اس کے رکن ہیں۔ان سب خصوصیات کی وجہ سے یہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا بڑا اور کامیاب غیر سودی اسلامی بینک ہے جس کا سالانہ کاروبار کھربوں ڈالر سے بھی تجاوز کر چکا ہے۔یہ غریب مسلم ممالک کو ان کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضے اور مالی تعاون بھی فراہم کرتا ہے جو ایک اندازہ کے مطابق ۱۹۹۳ء تک ۱۲ارب ڈالر سے بھی تجاوز کر چکا ہے۔۵ ارب ڈالر کی جو امداد مسلم ممالک کو ان کی بیرونی تجارت میں اضافہ کے لیے دی گئی ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس بینک میں سب سے زیادہ سرمایہ سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات نے فراہم کیا ہے۔اس نے کم ترقی یافتہ مسلم ممالک کی پیداوار و برآمدات میں اضافہ کے لیے دسمبر ۱۹۹۳ء میں ۱۰۰ ملین ڈالر کا ایک فنڈ بھی قائم کیا ہے۔(۳۸) یہ بہت حوصلہ افزاء مرحلہ تھا کہ امت کے انتشار کو ختم کرنے، احساس بیداری کو اجاگر کرنے، امت کے مسائل کو حل کرنے کی کوششیں مختلف سطح پر کر دی گئیں تھیں۔مگر اس پر عمل درآمد کے لیے متفقہ طور پر ڈٹ جانے کا مرحلہ کمزور رہا جس کی وجہ سے ان مساعی کا خاطر خواہ فائدہ امت کو نہ ہوسکا۔لیکن ان مساعی جمیلہ نے یہ ثابت کر دیا کہ امت مسلمہ اس حالت میں ہے کہ وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات (باب پنجم)

(۱) اسرار احمد، ڈاکٹر: "امت مسلمہ کا عروج وزوال اور موجودہ احیائی مساعی کا جائزہ" شعبہ نشر واشاعت تنظیم اسلامی، لاہور، ص: ۱۵

(۲) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۲، ص: ۵۲۷-۵۲۶

(۳) فاروقی، برہان احمد، ڈاکٹر: "حضرت مجدد کا نظریہ توحید" مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص: ۲۰

(۴) عبدالوحید خان: "مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان"، دوست ایسوی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۸۳-۲۸۲

(۵) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۲، ص: ۳۱۴

(۶) توکلی، نظام الدین: "حضرت مجدد الف ثانی" سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ص: ۴۲-۴۱

(۷) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۲، ص: ۳۹۷-۳۹۶

(۸) عبدالسلام خورشید: "سید احمد بریلوی" قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص: ۱۲

(۹) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۲، ص: ۴۰۱-۴۰۰

(۱۰) محمد زاہد اقبال، مولانا: "عصر حاضر میں غلبہء دین کا نبوی طریقہء کار" ادارہ نشریات محمود حسن، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۴-۲۳

(۱۱) ندوی، مسعود عالم: "محمد بن عبدالوہاب" مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ص: ۲۰-۱۹

(۱۲) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج: ۲، ص: ۵۲۹-۵۲۸

(۱۳) مریم جمیلہ:"اسلام ایک نظریہ-ایک تحریک" محمد یوسف خان، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص:۱۷۱

(۱۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۷۷-۱۷۵

(۱۵) ندوی، محمد الیاس:"مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۷۰

(۱۶) ثروت صولت:"ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ج:۲، ص:۵۲۳-۵۲۱

(۱۷) ندوی، محمد الیاس:"مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۷۲

(۱۸) مریم جمیلہ:"اسلام ایک نظریہ-ایک تحریک" محمد یوسف خان، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص:۲۵۹-۲۵۷

(۱۹) ندوی، محمد الیاس:"مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۷۳-۷۲

(۲۰) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۷۴

(۲۱) مریم جمیلہ:"اسلام ایک نظریہ-ایک تحریک" محمد یوسف خان، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص:۳۵۰-۳۴۹

(۲۲) ندوی، ابوالحسن، سید:"مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص:
۱۲۸-۱۲۹

(۲۳) ندوی، محمد الیاس:"مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۷۵

(۲۴) مریم جمیلہ:"اسلام ایک نظریہ-ایک تحریک" محمد یوسف خان، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص:۳۵۶-۳۵۵

(۲۵) ندوی، محمد الیاس:"مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۷۵

(۲۶) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۵-۱۳

(۲۷) القرآن (۲:۱۲۰)

(۲۸) اقبال، محمد، علامہ:" کلیات اقبال" نویدا ے شیخ، لاہور، ص:۱۷۷

(۲۹) سیال، عمر حیات عاصم:" آج کی اسلامی دنیا" یونائیٹڈ پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص:۱۰۴

(۳۰) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۱۰-۱۰۸

(۳۱) ندوی، محمد الیاس:"مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۶۲-۶۱

(۳۲) سیال، عمر حیات عاصم:" آج کی اسلامی دنیا" یونائیٹڈ پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۳

(۳۳) ندوی، محمد الیاس: "مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص: ۶۴

(۳۴) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۵۹

(۳۵) سیال، عمر حیات عاصم: "آج کی اسلامی دنیا" یونائیٹڈ پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۱۳

(۳۶) ندوی، محمد الیاس: "مسلم دنیا ماضی اور حال" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص: ۶۰

(۳۷) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۶۵

(۳۸) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۶۶

باب ششم

امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کے مدارج

فصل اوّل : عالم اسلام کو ضرورتِ قیادت

فصل دوم : وسائل کے استعمال اور مسائل کے حل کے لیے مسلم اقوام متحدہ کا قیام

فصل سوم : خیر امت کے تقاضے کی ادائیگی

فصل چہارم : اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

فصل پنجم : مذہبی قیادت کا اتحاد اور احیائے خلافت کا اہتمام

فصل ششم : مساجد (سطحی مجالس) اور حج (سالانہ کانفرنس) بطور ورثہ محمد ﷺ

فصل ہفتم : شعوری بیداری

فصل ہشتم : امید کامل اور جذبہ جرأت و قربانی کو پروان چڑھانا

فصل نہم : اسلامی و جدید علوم پر تحقیق

فصل دہم : لسانی روابط اور مؤثر ذرائع ابلاغ کی صلاحیت

باب ششم

امت مسلمہ کے نشاۃ الثانیہ کے مدارج

فصل اول

عالم اسلام کو ضرورت قیادت:

موجودہ عالمی تناظر میں میرے نزدیک عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ نڈر اور بے باک قیادت کا فقدان ہے۔

قیادت کی اہمیت اسی طرح ہے جیسے جسم انسانی میں دل ودماغ، جو پورے جسم کو خون پہنچانے اور غور وفکر کا کام انجام دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح قیادت پوری قوم وملت کی بقا کا علمبردار ہوتا ہے۔ سرور دو عالم ﷺ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جنہوں نے عرب کی ساری زمین ہلا دی، سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ آنحضرت ﷺ کی رحلت تمام صحابہ کرامؓ کے لیے سب سے بڑا سانحہ تھا، حالت غم میں ہونے کے باوجود قیادت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سب سے پہلے قیادت کا انتخاب کیا۔ عالم اسلام کی اس وقت اضطرابی کیفیت اور دگرگوں حالت قیادت سے خالی ہونے کی وجہ سے ہے۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظام او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است (۱)

ابھی تک آسمان ٹیڑھی چال چل رہا ہے۔ ابھی تک یہ قافلہ (مسلمانوں کا) اپنے اصل مقام سے دور ہے۔
میں اس کی زندگی کے بے ترتیب کام سے متعلق کیا کہوں۔ تو جانتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا کوئی رہنما نہیں ہے۔

امت مسلمہ کو ایک ایسی فکری قیادت کی ضرورت ہے جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور قوت اجتہاد کے ساتھ سامنا کرے اور تحقیق کے مرحلہ سے گذر کر مشاورت سے ایک نیا راستہ تلاش کرے جو اسلامی نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہو۔

اگر امت کو قیادت مل جائے تو اس کے سارے مسائل با آسانی حل ہو سکتے ہیں۔ میری نگاہ میں اسلامی بلاک میں دو بلاک ایسے ہیں جن کی اہمیت نہ صرف پورے عالم اسلام میں مسلّم ہے بلکہ ملت کفر بھی ان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے۔ وہ دو بلاک سعودی عرب و پاکستان ہیں ملت اسلامیہ کا مرکز دین، قبلہ و کعبہ، جس طرف مسلمان قرب الٰہی کیلئے رخ کیے رہتے ہیں، وہ سعودی عرب ہے، جس سے ایک دینی لگاؤ عالم اسلام کے ہر فرد کو ہے۔ دوسری طرف پاکستان ہے جسے نہ صرف عالم اسلام میں سب سے بڑی فوج رکھنے کا شرف حاصل ہے بلکہ ایٹمی طاقت بھی ہے۔ بلاشبہ ملت اسلامیہ کو اس پر فخر بھی ہے۔ اسطرح سعودی عرب امت مسلمہ کے لئے روحانی اور پاکستان مادی حیثیت کا حامل ہے اگر یہ روحانی و مادی طاقتیں مل کر امت کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں تو پھر وہ وقت دور نہیں جب سسکتی عالم انسانیت کو قرار واقعی حاصل ہو جائے گا۔

انسانیت کی مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عالمگیر قیادت اور زندگی کی جہاز رانی ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر جنھوں نے انسانیت کے قافلہ کو غرق کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے، ان امانت دار، فرض شناس، خدا ترس، تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جو انسانیت کی جہاز رانی کے لئے روز ازل سے بنائے گئے ہیں، نتیجہ خیز کارآمد انقلاب صرف یہ ہے کہ دنیا کی رہنمائی اور انسانیت کی سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ، امریکہ، روس اور انکی حاشیہ بردار مشرقی اور ایشیائی قومیں ہیں، اور جس کی زمام قیادت مترفین اور اکابر مجرمین کے ہاتھوں میں ہے، منتقل ہو کر اس امت کے ہاتھ میں آجائے، جس کی قیادت انسانیت کے معمار اعظم رحمت عالم سید اولاد آدم محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہے، اور جو اس دنیا کی تعمیر نو اور انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے محکم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے، اور جس کا ایمان دنیا کو اس وقت کی جاہلیت سے اسی طرح نکال سکتا ہے، جس طرح اس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نکالا تھا۔ (۲) امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ اور دنیا کی رہنمائی کا یہ فریضہ ان دونوں ممالک کے کندھوں پر زیادہ عائد ہوتا ہے۔ لہذا اس کی اہمیت کو سمجھا جائے اور المسلم اخو المسلم اور من لم یھتم بامر المسلمین لیس منا کی روشنی میں جسم واحد کا کردار ادا کیا جائے تو میری رائے میں اصلاح امت و بقائے امت کا بقیہ اہم کام یعنی مسلم اقوام متحدہ کا قیام اور مذہبی قیادت کا اتحاد و احیائے خلافت اور عالمی کانفرنس حج سے استفادہ واستعمال با آسانی ممکن ہو جائے گا۔ بظاہر یہ کام مشکل ہے، مگر مسلمان سب کچھ اپنے رب کی استعانت اور اسی پر بھروسے کے ساتھ شروع کرتا ہے، پس سفر شروع کرنیکی ضرورت ہے۔ راستے بنانا اور منزلیں آسان کرنا اس خالق کائنات نے اپنے ذمہ لے کر اس کا انتظام کیا ہوا ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے (۳)

اور اس کام کے نتیجے میں دنیا سورۃ النصر کی نوید "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کی عملی تفسیر ایک بار عصر حاضر میں دیکھ سکیں گے۔

آسمان ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائیگا پیغام سجود

پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے (۴)

فصل دوم

وسائل کے استعمال اور مسائل کے حل کے لیے

مسلم اقوام متحدہ کا قیام:

مسلم امہ کو آج استحکام وتقویت کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں قدرت کی طرف سے جو وسائل میسر ہیں اسکا احساس کریں، کیونکہ صحیح معنوں میں ہمیں حاصل وسائل کا صحیح ادارک نہیں ہے اور دوسری طرف اس کی قدر بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی دنیا کے پاس آج کی سب سے اہم ضرورت ایٹمی صلاحیت بھی موجود ہے، اس کے علاوہ قدرتی وسائل سے بھی مالا مال ہیں۔ اس دور میں سب سے اہم دولت "تیل" ہے۔ تمام دنیا کی اس دولت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیں اور اسلامی دنیا کی اس دولت "تیل" کو دوسرے پلڑے میں تو اسلامی دنیا کا پلڑا کہیں بھاری ہوگا۔ دنیا بھر میں پٹرولیم کے ذخائر کا ۷۰% حصہ مسلم ممالک کے پاس ہے۔ اس دولت کے علاوہ کون سا قدرتی وسیلہ ہے جو اسلامی ممالک کو اللہ تعالیٰ نے نہ دیا ہو۔ مثلاً پٹ سن ۹۲% گوند میں ۸۹% قدرتی ربڑ میں ۷۳% کپاس میں ۳۶% ٹن میں ۵۲% فاسفیٹ میں ۳۳% گرم مصالحہ جات میں ۲۸% امت مسلمہ کے پاس ہے۔ مجموعی طور پر دنیا بھر کے وسائل اور معدنیات کے ۳۵% حصے مسلم ممالک کے پاس ہیں۔ اس کے باوجود اسلامی ممالک کو اقتصادی مسئلہ درپیش ہے اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ممالک تین کھرب ۸۳ ارب ڈالر کے مقروض ہیں، اس کے بھی کئی وجوہ ہیں۔

سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اسلامی دنیا کی یہ دولت غیروں کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس دولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسی دولت کے ذریعہ یورپ کے کارخانے چل رہے ہیں اگر یہ دولت (تیل) یورپ کی طرف جانا بند ہو جائے تو یورپ کے تمام کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو جائے گا۔ کتنی بد قسمتی ہے۔ یہ دولت مسلمان کی ہے لیکن فائدہ یورپ اٹھا رہا ہے خصوصاً امریکہ جب تک اسلامی ممالک خدا کی دی ہوئی اس نعمت کو واگزار نہیں کر لیتے اس وقت تک اسلامی ممالک کو اقتصادی مسئلہ درپیش رہے گا۔

دوسری وجہ خود کفالت کے فقدان کی ہے۔ اکثر اسلامی ممالک سے اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرضے لیتے ہیں۔ وہ قرضے نہیں دراصل وہ غلامی کی زنجیریں ہیں۔ کسی ایک ملک کی مثال نہیں ملے گی جس نے ان اداروں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے قرض لیا ہو پھر اس کی حالت بہتر ہوئی ہو۔ اس کے برعکس اس کی حالت زیادہ ہی ابتر ہوئی ہے۔

معاشی مسئلہ درپیش ہونے کی تیسری وجہ ٹیکنالوجی اور ماہرین کی کمی ہے۔ ٹیکنالوجی اور ماہرین کی دست یابی سے صرف علم سے ہوتی ہے۔ جو ملک علم کی روشنی سے محروم ہے وہاں ٹیکنالوجی اور ماہرین کہاں سے آئیں گے۔ جب تک اسلامی ممالک تعلیم کو سستا نہیں کرتے اس وقت تک نہ ٹیکنالوجی میسر آئے گی اور نہ ماہرین پیدا ہوں گے۔

معاشی مسئلہ کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ نئے عالمی رجحانات بدل چکے ہیں۔ تمام دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس لیے ترقی یافتہ ممالک نے اس قسم کی منصوبہ بندی کی ہے کہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک ان معاشی منصوبہ کی وجہ سے مقابلہ نہ کر سکیں اور ترقی یافتہ ممالک کی پیداوار کی منڈیاں ہی بنی رہیں۔ اسلامی ممالک کے سربراہوں کی اہم ذمہ داری ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں تا کہ ترقی یافتہ ممالک کے ان معاشی منصوبوں کا توڑ سوچیں۔ اگر بروقت مقابلہ کرنے کا ٹھوس منصوبہ نہ بنایا گیا تو پھر اسلامی ممالک صرف خام مال ہی پیدا کر کے برآمد کر سکیں گے اور مہنگے داموں اپنے ہی خام مال سے بنی ہوئی چیزیں خرید کریں گے۔(۵)

موجودہ ادارہ اقوام متحدہ کی تعصب، تنگ نظری اور مسلم کاز سے عدم دلچسپی جو کہ پوری دنیا پر عیاں ہے اس سے قطع نظر مسلم اقوام متحدہ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے بلکہ مسلم امہ کے لئے آج کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ مسلم اقوام متحدہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ امت مسلمہ کے فلاح و بہبود و مسائل کے حل کے لئے پہلے سے قائم ادارے صحیح معنوں میں فعال ہو سکیں گے اور انکی نگرانی و جائزے کا بھی اہتمام ہو سکے گا اور بالخصوص آج کی مسلم دنیا کے انتظامی و اقتصادی مسائل جو گھمبیر صورت اختیار کر چکے ہیں اس سے باآسانی نجات مل جائے گا۔ اور دنیا کو یہ پیغام بھی مل جائے گا کہ آج بھی انسانیت کے لئے فلاح وکامرانی کا خزینہ عالم اسلام کے پاس ہے۔

فصل سوم

خیر امت کے تقاضے کی ادائیگی

اسلام کے بنیادی احکام میں سے اہم کام اصلاح کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔تمام انبیاء کے بعثت کا مقصد اولی یہی تھا اور اب اس امت مسلمہ یعنی خیر امت کی ذمہ داری یہ ہے کہ خاتم الانبیاﷺ کے بعد اس کار نبوت کو انجام دیتے رہیں۔امت مسلمہ کی فضیلت کی وجہ بھی اسی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ساتھ مشروط ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۲)

ترجمہ: "تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

نبی مہربانﷺ نے فرمایا:

بلغوا عنی و لو آیة (۷)

ترجمہ: "میری طرف سے پہنچاؤ اگر چہ ایک ہی آیت ہو"۔

جب نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا **فلیبلغ الشاھد الغائب** تو اس حکم کی تعمیل میں صحابہ کرامؓ نے اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے قریہ قریہ بستی بستی پھیل کر اس دعوت حق کو پہنچایا اور جب تک مسلمان اپنے اس کام کو فرض سمجھتے ہوئے ادا کرتے رہے ان کے اخلاق واعمال نہ صرف صحیح رہے بلکہ اس دعوت حق کے نتیجے میں ان کے اندر وہ خوبیاں پروان چڑھتی رہیں جو فلاح وعروج کی طرف گامزن کرنے والی تھیں۔معاشرے کے ارباب حل وعقد کے ذہنوں کو دعوت اور صرف دعوت کے ذریعے سے مفتوح کر لینے کی جدوجہد اگر چہ اس زمانے میں لوگوں کے لیے بہت کچھ اجنبی ہو چکی، لیکن حق یہ ہے کہ پیشِ نظر مقصد کے لیے، ان سب صورتوں میں اگر کوئی صورت دین وشریعت کی رو سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور نتائج کے لحاظ سے مؤثر ترین ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔

اللہ کے نبیوں نے اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ اسے ہی اختیار کیا ہے، وہ جب بھی اٹھے اور جس دور میں بھی اپنی دعوت لے کر کھڑے ہوئے اس کے سوا کوئی طریقہ انہوں نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی دعوت رد بھی ہوئی، وہ جلا وطن بھی ہوئے اور بارہا قتل بھی کر دیئے گئے، لیکن کامیابی کے لیے کسی دوسرے راستے پر دو قدم چلنا بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ ان کے پروردگار نے انہیں ہمیشہ یہی ہدایت کی کہ وہ اس پر ثابت قدم رہیں، ان کا کام یہی ہے، وہ جس منصب پر فائز ہوئے ہیں، وہ تعلیم وتذکیر کا منصب ہے۔ وہ اپنی قوموں پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے پیغمبر اس دنیا میں اپنا انقلاب اگر کبھی برپا کر دینے میں کامیاب ہوئے ہیں تو ہمیشہ اسی طریقے سے ہوئے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اپنی قوم میں اسی طرح کامیابی کی منزل تک پہنچی، سیدنا یونس علیہ السلام کی قوم اور اس کے ارباب حل وعقد نے اسی طرح اس کے آگے سر تسلیم خم کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یثرب میں رسالت مآب ﷺ کی حکومت ٹھیک اسی طریقے سے قائم ہوئی۔(۸)

دنیا بھر میں اسلام کی اشاعت درحقیقت ہمارے بزرگوں کے ذوق تبلیغ کی مرہون منت ہے۔ دشمنان دین کا پروپیگنڈا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ روشن ضمیر مسلمانوں کی بے لوث تبلیغ اور رفعت کردار اس کا باعث ہوئی ہے۔ اگر اسلام کی اشاعت تلوار کے بل پر ہوتی تو اسلام تلوار ہی سے معدوم ہو جاتا۔ اب تک اس پر تلوار کے کئی حملے ہوئے ہیں جو اسے فنا نہیں کر سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی مرتبہ تلوار سے مغلوب ہو کر اس نے تبلیغ سے فتح حاصل کی ہے...... جن ایام میں بغداد میں قتل عام جاری تھا، ان ہی ایام میں تلوار کی طاقت کے بغیر سماٹرا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ جس زمانہ میں قرطبہ اور صقلیہ سے مسلمانوں کو مٹایا جا رہا تھا، اسی زمانہ میں جاوا میں اس کا علم بلند ہو رہا تھا۔ اور اگرچہ تاتاری فوجیں مسلمانوں پر مسلسل فتح حاصل کرتی جا رہی تھیں، اسلام خود ان کے دلوں پر فتح حاصل کرتا جاتا تھا۔ یہ سب تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فتح تھی۔ اسلام کی وہ فتوحات جن کو شمشیری فتوحات کہا جا سکتا ہے، دنیا سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ سپین، صقلیہ اور یونان سے شمشیری فتوحات ختم ہو گئی ہیں۔ مگر وسط افریقہ، جاوا، سماٹرا، چین اور جزائر ملایا میں وہ بدستور موجود ہے جہاں وہ صرف تبلیغ کی برکت سے پھیلا ہے! اس طرح اسلام کی نشر واشاعت دین کی سادگی، انسان دوستی، عبادات کی دلکشی اور فطرت سے ہم آہنگی اور مبلغین کی سادگی، بے لوثی، دلنوازی اور کردار کی بلندی کی بدولت عمل میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی اشاعت اسلام میں ممد ومعاون ہوئی ہے کہ اسلام نے بے شمار قوموں کو قعر مذلت سے اٹھا کر آسمان عز وشرف تک پہنچا دیا ہے۔ اور انسانی مساوات کا عملاً ثبوت پیش کیا ہے۔(۹)

دین کی دعوت کا یہ عظیم الشان کام امت کے مرد و عورت دونوں نے سرانجام دیئے ہیں۔حقیقت بھی یہی ہے کہ دین کی دعوت کا فریضہ مسلم مرد و عورت دونوں پر عائد ہوتا ہے اپنے اپنے دائرے میں یہ عمل تابناک مستقبل کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مسلم خواتین نے دعوت دین کا فریضہ سرانجام دیا تو سر فخر سے بلند کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خونخوار تاتاریوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنانے کا سہرا خواتین کے سر ہے۔ان خواتین نے جن کو تاتاری مسلم ممالک سے لونڈیاں بنا کر لے گئے تھے، یہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔جس کے نتیجے میں تاتار کے صنم خانوں سے کعبہ کو پاسبان مل گئے تھے۔اور چنگیز خان کی ساری قوم نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ان خواتین میں پیش پیش ہلاکو خان کی مسلمان بیوی قرۃ ہے جس کی منظم اور مسلسل کوشش سے یہ حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی ہے۔اسی طرح حبشہ میں بھی خواتین ہی نے اشاعت اسلام کا کام کیا ہے۔متعدد حبشی رئیسوں کو ان کی مسلمان بیویوں نے اسلام میں داخل کرایا۔سنوسی مبلغین نے تو وسط افریقہ میں مستقل طور پر اشاعت اسلام کے لئے خواتین کے ادارے قائم کئے تھے۔(۱۰)

شریعت نے جہاں انفرادی طور پر اس کام کے جاری رکھنے کی تلقین کی ہے وہاں پر باقاعدہ اجتماعی طور پر اسے جاری رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ (۱۱)

ترجمہ: "اور تم میں ایک جماعت ضرور ایسی موجود رہنی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دیتے رہیں اور منکر سے روکتے رہیں اور یہی لوگ دراصل کامیاب ہیں۔"

نیکی کا حکم اور منکرات سے روکنا یہ وہ کام ہے جو نبیوں کا مشن رہا ہے اور اسی کی وجہ سے معاشرے میں نیکی پروان اور برائی دور ہوتی رہتی ہے۔اس کے برعکس اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ ہو رہا ہو تو داعی اعظم ﷺ کی اس وعید پر غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ذلت و خواری اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔

داعی اعظم ﷺ نے فرمایا:

والذی نفسی بیده لتامرن بالمعروف و لتنهون عن المنکر او
لیوشکن الله ان یبعث علیکم عذابا من عنده ثم لتدعنه و
لا یستجاب (۱۲)

ترجمہ: "اس ذات کی قسم جسکے قبضے میں میری جان ہے تم لازماً نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ عنقریب اللہ تم پر ایسا عذاب بھیج دے گا کہ پھر تم پکارتے رہو گے اور کوئی شنوائی نہ ہوگی"۔

پس آج امت مسلمہ کی حالت یہ ہے کہ ان پر ذلت وخواری کا عذاب مسلط ہو چکا ہے۔ اور وہ پکار رہے ہیں مگر ان کی شنوائی نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہم اپنے فریضہ سے غافل ہو چکے ہیں اور اسے مخصوص لوگوں کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن نے خیر امت اسی لیے تو کہا تھا کہ ہم برائی سے روکتے اور نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ مگر ہمارا حال اسی طرح کا ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو ان کے باشندوں سمیت الٹ دو تو حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ میرے پروردگار، اس شہر میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے، جس نے ایک لحہ بھی تیری نافرمانی نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اقلبها عليه و عليهم فان وجهه لم يتمعر فى ساعة قط (١٣)

اصلاح امت کے فریضہ کو ادا کرتے ہوئے حکمت وبھلائی کے پہلو کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ (١٤)

ترجمہ: "اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیجئے، حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور مباحثہ کیجئے تو ایسے طریقے پر جو انتہائی بھلا ہو"۔

نبی مہربان ﷺ نے اسی نرم خوئی، حکمت وبھلائی کے کردار سے ان عربوں کو جو ہر طرح کی برائیوں سے لبریز تھے، پستی و ذلت کی زندگی گزار رہے تھے، انکو اعلیٰ وارفع مقام عطا کر کے ممتاز کر دیا تھا۔ اور جب تک اللہ رب العزت کی بندگی کی طرف امت مائل نہیں ہوتی عروج ناممکن ہے۔ لہذا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے ویسی ہی تڑپ پیدا کرنی ہوگی۔ جس طرح داعی اعظم ﷺ نے اپنی کیفیت کو اس حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

"میری مثال اس شخص کی سی ہے جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو یہ کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے۔ اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو روک رہا ہے۔ لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوشش کو ناکام بنائے دیتے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں (اسی طرح) میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو"۔ (١٥)

کیونکہ معاشرے کے افراد کی اصلاح کے ذریعہ ہی عروج کی طرف گامزن ہوا جاسکتا ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا (۱۶)

آج امت مسلمہ عروج کی طرف تیزی سے سفر اسی صورت میں کرسکتی ہے کہ قرآن وسنت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ اور پستی ونکبت کے اثرات کو دور کیا جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اور تقریباً اسلامی ممالک قرآن وسنت کی حاکمیت سے خالی ہیں اور اگر کسی جگہ حاکمیت الٰہی کو عمل دخل ہے تو صرف دستور تک اور اگر کہیں نافذ العمل ہے تو صرف چند احکام پر عمل درآمد ہے بقیہ کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اسی حقیقت کو علامہ ماہر القادریؒ نے نظم "قرآن کی فریاد" میں لکھا ہے۔

دل سوز سے خالی رہتے ہیں، آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں ایک ایک جلسہ میں، پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے، سچائی سے بڑھ کر دھوکہ ہے
ایک بار ہنسایا جاتا ہوں، سو بار رلایا جاتا ہوں
یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں (۱۷)

امت مسلمہ کی کھوئی ہوئی عزت دلانے کے لیے اور ذلت وپستی کی اس چکی سے نکالنے کے لیے ہمیں قرآن وسنت کی بالادستی قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اور یہ امت کے افراد کے تزکیہ نفس سے ہی ممکن ہے۔

نبی محترم ﷺ نے فرمایا:

فان هذا القرآن سبب طرفه بيدالله و طرفه بايديكم
فتمسكوا به فانكم لن تضلوا ولن تهلكوا بعده ابدا (۱۸)

"قرآن کا ایک سرا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اسکا دوسرا سرا تمھارے ہاتھ میں ہے پس قرآن کو مضبوطی سے تھامو تو تم سیدھی راہ سے کبھی نہیں بھٹکو گے اور نہ اسکے بعد ھلاکت سے دوچار ہوگے"۔

دوسری جگہ نبی مہربان ﷺ نے فرمایا:

"ان اللہ یرفع بھذ الکتاب اقواما و یضع بہ اخرین" (۱۹)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ بہت سی قوموں کو بلندیاں عطا فرماتا ہے اور اسکی وجہ سے دوسروں کو ذلت وپستی میں دھکیل دیتا ہے"

قرآن تو شاہ کلید۔ جیسا کہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں!

میں قدیم وجدید فلسفہ سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو با خدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے۔ میری اصلی محسن بس یہی ایک کتاب ہے اس نے مجھے بدل کر رکھ د، حیوان سے انسان بنا دیا تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی۔ ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے انگریزی میں اس کنجی کو (MASTER KEY) کہتے ہیں۔

جس سے ہر قفل کھل جائے سو میرے لئے قرآن ''شاہ کلید'' ہے مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکر ادا کرنے میں میری زبان عاجز ہے۔ (۲۰)۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن وسنت سے روگردانی نے امت کو ناکامی وذلت سے دوچار کیا ہے۔ اور واپسی عروج وبلندی بھی اس کو تھامنے اور اسی کو اپنا امام بنانے سے ہو سکتی ہے۔

فصل چہارم

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ:

تمام انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں جس دعوت کا پرچار کرتے رہے ہیں وہ اسلام ہے۔ اور اسلام ہی نے وحدت ومحبت کی بنیاد رکھی ہے اور وحدت واخوت کی وہ فضاء قائم کر کے دکھائی جو کہ ناممکن تھا اور ایسی وحدت و بھائی چارگی پیدا کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسلام کے پیغام وحدت نے بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر، ٹوٹے ہوئے دلوں کو ایک قالب اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نسلوں اور قوموں کو ایک امت بنا دیا تھا۔ مگر اس وقت جہالت، نفرت وتعصب کے ہاتھوں وہ اختلاف ونزاع، گروہ بندی، بے راہ روی کے گرداب میں پھنس چکا ہے۔ مذہب کے چند جزئی مسائل میں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے راہ اعتدال سے دوری نے جو طوفانِ نفرت وعداوت ہنگامہ عظیم برپا کر رکھا ہے اس کے نتیجے میں پوری امت فرقوں اور مسلکوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ حال یہ ہے کہ ہر کوئی اتباع حق کا دعوے دار ہے۔ مگر اخلاص کے ساتھ سچائی کو تھامتے ہوئے، اسلام کی سربلندی کے لیے عزم کے ساتھ قرآن وسنت کی شاہراہ پر چلنے کے بجائے تقلید کے جذبات کی لہروں میں بہہ رہا ہے۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمایا جسکو امام ترمذی نے عدی ابن حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

" آنحضور ﷺ نے آیت **اتخذو احبارهم و رهبانهم ارباباً من دون الله** پڑھکر فرمایا یہود اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت تو نہیں کیا کرتے تھے مگر انکا حال یہ تھا کہ جس چیز کو انکے علماء اور مشائخ حلال کہہ دیتے اسے وہ (بغیر کسی شرعی دلیل کے) حلال مان لیتے تھے۔ اور جس شئے کو وہ حرام قرار دیتے تھے اسے وہ حرام سمجھ لیتے تھے"۔ (۲۱) اس سے معلوم ہوا کہ اپنے دینی پیشواؤں کو تشریع دینی کا حق دے دینا، یعنی اس بات کا حق دے دینا کہ وہ جو کچھ اپنے خواہش اور رائے سے ٹھہرا دیں، اس کی بلا چوں وچرا تقلید واطاعت کرنی چاہیے، قرآن کے نزدیک انہیں رب بنا لینا ہے۔ کیونکہ اس بات کا حق اللہ کے سوا اور اللہ کی وحی کے مبلغ کے سوا اور کسی کو نہیں۔ پس جب دوسروں کو بھی یہ حق دے دیا گیا تو گویا وہ خدائی میں شریک کر لیے گئے۔ عیسائیوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہوا جس نے پوپ اور اس کے مقرر کیے ہوئے فادرز کو خدا سمجھا ہو، اور نہ یہودیوں نے کبھی اپنے رسول کو ایسا سمجھا۔

لیکن ان کے عمل کو یہی حال رہا۔ گویا حق و باطل، حلال وحرام، عذاب وثواب اور جنت ودوزخ کی تقسیم کا سارا اختیار انہی کے قبضے میں ہے۔ وہ جو حلال کر دیں حلال ہے، جو حرام کر دیں حرام ہے۔ جسے چاہیں بخشش کا پروانہ دے دیں اور جسے چاہیں محروم ومردود کر دیں۔ جنت کی کنجی بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ دوزخ کا داروغہ بھی انہی کے زیر حکم، وہ ایسے مقدس ہیں کہ کوئی بات ان کی غلط نہیں ہو سکتی۔ (۲۲) حضرت عبداللہ بن مبارکؒ مشہور تابعی ہیں۔ آپ کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔ **وهل افسد الدين الا الملوك و احبار سوء و رهبانها** ۔ یعنی دین کو بگاڑنے والے یا تو بادشاہ ہیں جو اپنی طاقت اور مال ودولت کے بل بوتے پر دین کو اپنی مرضی کا بناتے ہیں یا پھر برے عالم اور برے درویش ہیں جنہوں نے دین میں بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اگر بادشاہ بگڑیں گے تو مسلمانوں کی معیشت تباہ ہوگی۔ اگر عالم بگڑیں گے تو دین تباہ ہوگا اور اگر پیر صاحبان بگڑ جائیں گے تو اخلاق تباہ ہو جائے گا۔ اگر یہ تینوں طبقے بگڑ جائیں تو پھر قوم تنزل کی گہرائیوں میں جا گرے گی۔ چنانچہ یہ بگاڑ ہماری امت میں بھی آ چکا ہے۔ مسلمانوں کے اکثر فتنے ان تین گروہوں کے پیدا کردہ ہیں۔ (۲۳) اسی لیے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری!
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری (۲۴)

حالانکہ تمام آئمہ ومجتہدین نے اخلاص کے ساتھ اسلام کی سربلندی کے لیے قرآن وحدیث کو سامنے رکھتے ہوئے رائے دی ہے یا اصول مقرر کیے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سب انسان تھے اور اجتہاد میں غلطی کا ہو جانا عین ممکن ہے لیکن کسی شخص کا صرف اپنے امام کے قول یا رائے کو صحیح ماننا دوسرے امام کے قول کو غلط سمجھنا اسکو غلط ثابت کرنے کے لیے کوشش کرنا ارباب حق کا طریقہ نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو اسے میرے قول پر فتوی دینے کا کوئی حق نہیں خود امام موصوف جب کوئی فتوی دیا کرتے تو کہتے یہ نعمان ابن ثابت کی (یعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنے علم وفہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اس کی رائے صائب اور حق سے زیادہ قریب ہوگی" ......

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے:

"ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ لے لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل۔ صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات معصوم ہے"۔

حاکم اور بیہقی نے امام شافعیؒ سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایہ صحت کو پہنچ جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو۔ ایک دوسری روایت میں امام صاحب کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو احادیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔ ایک روز امام مزنیؒ سے آپ نے فرمایا کہ ابراہیم میری ہر بات کی کورانہ تقلید نہ کرو بلکہ بذاتِ خود اس میں غور کرلیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ: "اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو وقعت حاصل نہیں۔ تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی۔ جس طرح انہوں نے کتاب وسنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی تم بھی حاصل کرو۔ کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں۔ تاوقتیکہ وہ تمام آئمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو"۔ (۲۵)

واقعہ یہ ہے کہ گروہ بندی، تفرقہ پسندی اور باہمی اختلافات ونزاع سے بڑھکر کوئی آزمائش مسلمانوں پر نہیں آئی۔ یہی چیز ہے جو اس امت کو کھا گئی۔ اگر مسلمان ذلیل وپامال ہوئے تو اسی کے ہاتھوں ہوئے اور اگر کسی دور میں فتح ونصرت سے ہمکنار ہوئے تو صرف الفت ومحبت اور باہمی اخوت کی برکت سے ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کی فروعات میں اختلاف ناگزیز ہے۔ فروعی احکام اور اجتہادی مسائل میں یک رائے ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ ذہن مختلف ہوتے ہیں، عقلیں متفاوت ہوتی ہیں، قوت استنباط میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ دلائل کی گرفت، معانی کے فہم وادراک اور چیزوں کے باہمی ربط وتعلق کو سمجھنے میں خاصا اختلاف ہوتا ہے اور دین تو عبارت ہے آیات واحادیث اور کچھ نصوص سے اور عقل وذہن زبان ولغت کی روشنی میں انہی کی تفسیر وتشریح کرتے ہیں۔ پھر اختلاف کے بغیر چارہ کہاں؟ علاوہ ازیں کسی کا علم وسیع ہوتا ہے کسی کا محدود کسی تک ایک بات پہنچتی ہے تو دوسرے تک نہیں پہنچتی۔

حالانکہ فقہائے ملت بھی اس کا خیال رکھتے تھے کہ امت کو کسی بھی ایک فرد کی تحقیق وخیالات کا پابند نہ کیا جائے جیسا کہ امام شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے:

جب منصور عباسی نے حج کیا تو امام مالک سے کہا میرا مقصد یہ ہے کہ تمہاری مصنفہ کتابوں کو لکھوا کر سب اسلامی شہروں میں ان کا ایک ایک نسخہ بھیج دوں اور لوگوں کو حکم کروں کہ انہی کے مسائل پر عمل کریں ان کے علاوہ اور کسی جانب رخ نہ کریں۔ انہوں نے فرمایا اے امیر المؤمنین ایسا نہ کرو۔ لوگوں میں پہلے ہی سے اقوال مشتہر ہوگئے ہیں۔ وہ احادیث سن چکے ہیں۔ روایت کو نقل کر چکے ہیں۔ جو مسائل معلوم ہوگئے ان پر انہوں نے عملدرآمد کرلیا ہے لوگوں میں اختلافات ہوگئے ہیں۔ اسی واسطے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو جو انہوں نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے اسی پر رہنے دو۔

یہ قصہ بعض نے ہارون رشید کی طرف منسوب کیا ہے اس نے امام مالک سے مشورہ کیا تھا کہ مؤطا کو کعبہ میں لٹکا دینا چاہتا ہوں۔ تمام لوگوں کو اسی پر عمل کرنے کی ترغیب دوں گا۔ امام مالکؒ نے کہا ایسا نہ کرو رسول ﷺ کے صحابہؓ نے فروع مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ بلاد اسلامی میں وہ متفرق ہو گئے احادیث مشتہر ہو چکیں۔ ہارون رشید نے کہا وفقک اللہ یا ابا عبد اللہ ۔ (۲۶)

اسی طرح ایک راوی کسی امام کے نزدیک ثقہ اور قابل اعتماد ہوتا ہے مگر وہی راوی کسی دوسرے امام کے نزدیک مجروح ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کے بارے میں اس کی معلومات مختلف ہوتی ہے۔ پھر دلائل کے اعتبار میں بھی اختلاف ہوتا ہے کسی امام کے یہاں عمل صحابہؓ کو ترجیح حاصل ہوتی ہے جبکہ دوسرے امام کے یہاں خبر احاد کی موجودگی میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ دین کی فروعات میں اجماع ناممکن ہے۔ بلکہ یہ بات تو دین کے مزاج کے منافی بھی ہے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ یہ دین اسلام ہمیشہ قائم و دائم اور زندہ جاوید رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن اسلام بڑا ہی نرم، آسان اور لچکدار ہے اس میں ذرا بھی جمود و تشدد نہیں۔

صحابہ کرامؓ بھی تو آپس میں اختلاف کرتے تھے ایک دوسرے سے مختلف فتوے دیا کرتے تھے مثال کے طور پر بنی قریظہ میں نماز عصر کے ادا کرنے کا واقعہ جب کہ آپ ﷺ غزوہ خندق سے واپس ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اعلان کرنے کے لئے ایک منادی بھیجدیا جس نے آپ ﷺ کا یہ حکم لوگوں کو سنایا اور پہنچایا، لا یصلین احد ن العصر الا فی بنی قریظۃ ، ''یعنی کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک کہ بنو قریظہ میں نہ پہنچ جائے۔ ''صحابہ کرام سب کے سب اس دوسرے جہاد کے لئے فوراً تیار ہو کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں عصر کا وقت آیا تو بعض حضرات نے حکم نبوی کے ظاہر کے موافق راستہ میں نماز عصر ادا نہیں کی، بلکہ منزل مقرر بنو قریظہ پہنچ کر ادا کی، اور بعض نے یہ سمجھا کہ آنحضرت ﷺ کا مقصد عصر کے وقت میں وہاں پہنچ جانا ہے، ہم اگر نماز راستہ میں پڑھ کر عصر کے وقت میں وہاں پہنچ جائیں تو یہ حضور کے منافی نہیں ، انھوں نے نماز عصر اپنے وقت پر راستہ میں ادا کر لی۔ رسول اللہ ﷺ کو صحابہ کرام کے اس اختلاف عمل کی خبر دی گئی، تو آپ ﷺ نے دونوں فریق میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی، بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی، اس سے علماء امت نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ علمائے مجتہدین جو حقیقۃً مجتہد ہوں اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کے اقوال مختلفہ میں سے کسی کو گناہ اور منکر نہیں کہا جا سکتا ، دونوں فریقوں کے لئے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں ثواب لکھا جاتا ہے۔ (۲۷)

مگر اس واقعہ نے انکے دلوں میں کوئی نفرت و بیزاری پیدا نہ کی کیونکہ منشاء دونوں کی تھی ایمان کی پیروی اور رب کی رضا جوئی اسی لیے رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے کسی پر عتاب نہیں فرمایا۔ اسی طرح انکی وحدت میں کوئی دراڑ پیدا نہ ہوا۔ جب ان پاک نفوس میں اختلاف ہوا، حالانکہ وہ نبوت اور دور نبوت سے قریب تر تھے اور احکام کے پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔

اگر ان اختلافات کی اصلیت پر غور کیا جائے جن پر فرقہ بندیوں کا محاذ جنگ قائم ہو رہا ہے اور یہ دیکھا جائے کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے آئمہ سلف نے ہمارے لیے کون سا اسوہ چھوڑا ہے؟ ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے بعض لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو قئے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اسکی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اختلافات موجود تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے کسی نے کسی کی اقتداء سے کبھی انکار نہیں کیا۔ امام ابوحنیفہؒ اور انکے تلامذہ اور امام شافعیؒ وغیرہ مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے حالانکہ اہل مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے، نہ آہستہ اور نہ زور سے۔ امام ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کے پیچھے نماز پڑھی حالانکہ اس نے حجامت (پچھنے لگوانے) کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی جب کہ امام ابو یوسفؒ کے مذہب میں پچھنوں کے بعد تجدید وضو لازم ہے۔ مگر امام مالکؒ کے مذہب میں لازم نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ حجامت اور نکسیر کو ناقض وضو مانتے ہیں لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد وضو نہ کیا ہو تو آپؒ نے جواب دیا، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ امام مالکؒ اور سعید بن المسیب کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)

روایت ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ عیدین میں خلیفہ ہارون کی رعایت سے حضرت ابن عباس کے مذہب کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔

امام شافعیؒ نے مقبرۂ امام ابوحنیفہؒ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب سے دعاء قنوت کو ترک کر دیا اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔ (۲۸)

انہی جزئی مسائل کو بنیاد بنا کر ان آئمہ کے ماننے والے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں جبکہ ان آئمہ کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔

دوسری طرف قرآن نے تو ان مسئلوں کو بھی جو اختلاف کا سبب بنتے یا بن سکتے ہیں یہ کہہ کر حل کر دیا ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِکَ خَیْرًا وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ٥(٢٩)

ترجمہ: "پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔"

یہ زریں قانون اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ دینی اختلاف، اختلاف نہ رہے بلکہ ردّ الی اللہ والرسول کی وجہ سے حکم منصوص ہی کا رنگ اختیار کر لے اور اس طرح اس اختلاف میں پھر ایک شان وحدت پیدا ہو جائے۔ سیرت طیبہ پر نظر ڈالیں تو نبیؐ نے بھی اپنے عمل سے یہی درس دیا ہے کہ امت کے افراد کے ساتھ ہمدردی و بھلائی کا سلوک کیا جائے لہٰذا ہر اس فعل سے بچا جائے جو دین سے متنفر کرنے کا سبب ہو یا تنگی کا باعث بنے۔

عن انسؓ قال بینما نحن فی المسجد مع رسول اللہ ﷺ اذا جآء اعرابی فقام یبول فی المسجد فقال اصحاب رسول اللہ ﷺ مہ مہ فقال رسول اللہ ﷺ لا تزرموہ دعوہ فترکوہ حتی بال ثم ان رسول اللہ ﷺ دعاہ فقال لہ : ان ھذہ المساجد لا تصلح لشیء من ھذا البول و القذر و انما ھی لذکر اللہ والصلوۃ و قراءۃ القرآن او کما قال رسول اللہ ﷺ قال: وامر رجلا من القوم فجاء بدلو من مآء فشنہ علیہ (٣٠)

ترجمہ: "حضرت انسؓ فرماتے ہیں ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں تھے۔ اچانک ایک دیہاتی آیا اور مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا آپ ﷺ کے صحابہ اسے کہنے لگے ٹھہر جا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے پیشاب سے مت روکو بلکہ اس کو کرنے دو۔ جب اس دیہاتی نے پیشاب کر لیا تو آپ ﷺ نے اس کو بلایا اور فرمایا کہ مسجدیں اس قسم کی گندگی اور پیشاب کرنے کے لئے مناسب نہیں ہیں۔

یہ تو صرف اللہ کے ذکر اور نماز اور تلاوت قرآن کے لئے ہیں یا اس کے مثل فرمایا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے مجلس میں سے ایک شخص کو حکم دیا جس نے پانی کا ڈول اس پیشاب پر بہادیا۔

نبی ﷺ کو امت کا کتنا درد والفت تھا اور پھر امت کو بھی یہی درس دیا کہ آخری امت ہونے کے ناطے کار انبیاء کو سر انجام دینے والے، انبیاء کی طرح لوگوں کے لیے آسانی نکالو اور لوگوں کو سختی میں نہ ڈالو۔ لہٰذا تمام مسائل میں اگر نگاہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو اور اختلاف میں انہی کی طرف رجوع کا جذبہ موجود ہو تو پھر ان کی امت سے نفرت کیونکر ہو گی۔ مسئلہ تو اس وقت ہو گا جب خواہش نفس اور اتباع ہوئی کی تکمیل ہو رہی ہو۔ لہٰذا دردامت کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اختلافی مسائل میں اعتدال کی طرف گامزن ہونے کے لیے یہی زادراہ ہے۔

اہم ہے ہر ایک یوں تو حکم شریعت	مگر ان میں افضل تریں دردامت
ادا ہو اگر درد امت کی سنت	تو ثابت ہو اپنی، نبیؐ سے محبت
جو شمع رسالت کا پروانہ ہے	وہ امت کا بھی ان کی دیوانہ ہے
یہ فرقوں کے جھگڑوں کو چھوڑو خدارا	یہ نفرت کے ایوان توڑو خدارا
محبت ہی دیں ہے محبت ہی ایماں	یہی روح سنت، یہی روح قرآں
یہی ہے حقیقت میں راہ نجات	یہی مرد مومن کی ہے کائنات
اسی کے توسل سے ہو گا وفاق	اسی سے چھٹے گا غبار نفاق
محبت اگر دل میں بیدار ہو گی	تو تسخیر عالم نہ دشوار ہو گی (۳۱)

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہر اختلاف مذموم ہے، یا کوئی اختلاف غیر مذموم بھی ہے، جواب یہ ہے کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے، بلکہ مذموم وہ اختلاف ہے کہ جس میں اپنی اہواء اور خواہشات کی بناء پر قرآن سے دور رہ کر سوچا جائے، لیکن اگر قرآن پر مجتمع رہتے ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کی تشریح وتفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری استعداد اور دماغی صلاحیتوں کی بناء پر فروع میں اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فطری ہے، اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا، صحابہ وتابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف اسی قسم کا اختلاف تھا، اور اسی اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا، ہاں اگر انہی فروعی بحثوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ وجدل اور سب وشتم کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے۔ (۳۲)

طاغوتی قوتیں تو یہی چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنے ہی عقائد و مسلک جزیات میں الجھے رہیں اور دنیا پر وہ اپنا نظام مسلط کیے رہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ابلیس کے خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے (۳۳)

پس اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ کو اپناتے ہوئے "اپنی مسلک کو مت چھوڑ واور دوسروں کے مسلک کو مت چھیڑو" پر عمل کرنا اور دوسروں کو اس کی دعوت سے ہمکنار کر کے ہی امت تفرقوں میں بٹنے اور نفرتوں میں گھرنے سے بچ سکتی ہے اور یہی وہ مطلوبہ کردار ہے جس کو اپنا کر امت کو عروج کی طرف گامزن کیا جا سکتا ہے۔

فصل پنجم

مذہبی قیادت کا اتحاد اور احیائے خلافت کا اہتمام

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۳۴)

ترجمہ: "کہہ دیجئے کیا علم والے اور بغیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں۔"

بلاشبہ علم والے فضیلت رکھتے ہیں لیکن اسی طرح ان پر ذمہ داری بھی ہے۔ لہٰذا تمام اہل علم افراد بالخصوص مذہبی قیادت کی ذمہ داری نبھانے والے افراد کے لیے آج کے حالات کے تناظر میں یہ ذمہ داری ہے کہ امت واحدہ کے تصور کو قائم رکھتے ہوئے اس کی سیاسی قیادتوں، ملکوں اور علاقوں کی موجودہ صورتحال کو ایک عارضی کیفیت کی حیثیت سے تسلیم کر لیں اور اصولوں، منزل مقصود اور اہداف کے اعتبار سے ایک ہی دینی اور مذہبی قیادت کے اصولوں کے تحت متحد ہو جائیں۔ اس کام کو مثبت اور علمی اعتبار سے قابل قبول بنانے کے لیے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اسلامی خلافت کے احیاء سے کام کا آغاز کریں، اس ادارہ کو از سر نو زندہ کریں اس لیے کہ خلافت کے بغیر ہم وہ جسم رہیں گے جس کا سر نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ جسم تب ہی حرکت کر سکتا ہے جب اس کا سر موجود ہو....... گذشتہ صدیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود و استحکام کی حفاظت کے سلسلہ میں ادارہ خلافت کا بڑا زبردست کارنامہ رہا ہے۔ مسلمان ادارہ خلافت کو ہمیشہ احترام کی نظروں سے دیکھتے رہے اور اس کو مسلمانوں کا مرکز سمجھتے رہے۔ اگرچہ یہ ادارہ عملاً صرف دمشق، بغداد، قاہرہ اور استنبول تک محدود رہا لیکن اس کے باوجود کسی مسلمان بادشاہ یا حکمران نے خلیفہ وقت کے مقابلہ میں اپنی خلافت کا دعویٰ کرنے کی جرات نہیں کی۔ حالانکہ ایک طرف خلافت کے منصب کو کبھی مذہبی تقدیس نہیں دی گئی اور دوسری طرف اکثر و بیشتر خلیفہ کی سیاسی حیثیت خاصی کمزور رہی۔ یہ بات ہمیں بغداد کی عباسی خلافت کے آخری دور کے خلفاء میں، قاہرہ کے عباسی خلفاء میں حتیٰ کہ استنبول کے عثمانی خلفاء میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود دنیا بھر کے مسلمان منصب خلافت کو تعظیم و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، خلیفہ وقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے اور اس منصب کے بارے میں اس سے عموماً اختلاف نہیں کرتے تھے۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ خلافت کو مذہبی اعتبار سے مقدس شے سمجھتے تھے یا خلیفہ کی قوت وہیبت سے ڈرتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ اور خلافت کا وجود لوگوں کو دین پر متحد رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد خلافت کے حوالہ سے ''عالمی خلافت کی نوید'' میں ایک سبق آموز واقعہ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن مدنی کا درج کیا ہے:

دوران اسیری انگریز کمانڈنٹ آپ کی درویشی سے متاثر ہوگیا۔آپ نے اس سے پوچھا کہ آپ لوگ ہماری خلافت کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ یہ تو ایک مردہ خلافت ہے،اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ اسنے جواب دیا''مولانا آپ اتنے سادہ نہ بنیں! آپ بھی جانتے ہیں اور ہم کو بھی معلوم ہے کہ یہ گئی گزری خلافت بھی اتنی طاقتور ہے کہ اگر کہیں دارالخلافہ سے جہاد کا اعلان ہوجائے تو مشرق سے مغرب تک لاکھوں مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئیں گے!!''(۳۵)

اس وقت دنیا میں ستاون کے قریب اسلامی حکومتیں ہیں مگر آزادی ءرائے سے محروم، غیر مسلموں کے دستِ نگر ہیں۔ تمام اہم امور انہی کے مشورے سے انجام پاتے ہیں۔حالانکہ جب خلافت اپنے عروج پر تھی، تو کسی کو مسلمانوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، مگر جب سے خلافتِ ترکی کا خاتمہ ہوا ہے مسلمانوں کا وقار ختم ہوگیا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ مسلمان ہر جگہ غیر مسلموں کے تختہء مشق بنے ہوئے ہیں اور جسم (امت مسلمہ) کے دوسرے حصے اس تکلیف پر بے چین و بے خوابی میں مبتلا نہیں ہو رہے ہیں۔اس کا ایک ہی حل ہے کہ خلافت کا ادارہ تشکیل دیا جائے۔

خلافت کیلئے اگر فرد واحد کا انتخاب ممکن ہو تو بہتر ہے، مگر مذہبی قائدین پر مشتمل ایک ادارہ ''خلافت'' بنالیا جائے تو یہ سب سے بہترین ہے۔یہ ادارہ خلافت کوئی سیاسی یا علاقائی سرگرمیوں پر مشتمل نہیں بلکہ عمومی نوعیت کا ایک دینی کام ہوگا۔یہ ادارہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرنے اور انہی اصولوں پر چلنے کا پابند ہوگا جو شریعت کے مطابق ہو۔اور اس ادارہ کی ذمہ داری نہ صرف مذہبی معاملات میں رہنمائی کرنے کا ہو بلکہ مسلمانوں کے تمام معاملات چاہے وہ معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی یا کوئی اور ہوں، بہتری کے اقدامات کریں اور اللہ نے جو انکو نعمت علم وحکمت عطا کی ہے اس سے ملت اسلامیہ کو عروج کی طرف گامزن کرنے کا سبب بنیں۔اسلام ایک ایسا دین ہے جو مسلمانوں کے امور کی تنظیم دنیا اور آخرت کی سعادت وکامرانی کے ساتھ کرتا ہے۔

وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۳۶)

ترجمہ: "اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کرو۔ احسان کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت دونوں کے لیے کام کرنے کی ترغیب دی ہے بشرطیکہ انسان حسن عمل سے کام لے اور مفسد نہ بنے۔ لہذا مسلم امہ کا درد رکھتے ہوئے **یهتم بامر المسلمین** یعنی مسلمانوں کے معاملہ میں دلچسپی لینا بھی ایمان کا تقاضہ ہے۔

فصل ششم

مساجد (سطحی مجالس) اور حج (سالانہ عالمی کانفرنس)

بطور ورثہ محمد ﷺ

اسلام دین ہے۔ جو زندگی کے جملہ امور میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ انسان کے داخلی معاملات ہوں یا خارجی معاملات، معاشی معاملات ہوں یا سیاسی معاملات، تمام تر معاملات میں رہنمائی محمد ﷺ کے نسبت سے امت مسلمہ کو دین اسلام میں ملتی ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر با و نر سیدی تمام بو لہبی است (۳۷)

حضور ﷺ کی اتباع کرو۔ اگر وہاں تک رسائی نہ ہوئی تو تم ابولہب کے

پیرو بن جاؤ گے اور تمہارا ہر قدم تمہیں آگ کی طرف لے جائے گا۔

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں کہ وہ صرف سربسجود کرنے کی طرف نشاندہی کر کے اسے دیگر معاملات میں بے یارومددگار یا خود مختار چھوڑ دے۔

اس حقیقت کو جان لینے کے بعد ہمیں یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ مرسل برحق حضور ﷺ کا امت مسلمہ کے لئے سب سے بڑا عطیہ مسجد ہے۔ یہ وہ حصنِ حصین ہے کہ جس میں مسلمانانِ عالم ارضی وسماوی آفات سے مصئون و مامون ہو جاتے ہیں۔ لیکن مسجد کا استعمال اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح خود حضور اکرم ﷺ اور آپؐ کے بعد اکابر صحابہؓ نے کر کے بتایا ہے۔

آج ہم نے دینی رُخ سے مساجد کا استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم انہیں اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح غیر مذاہب والے اپنی عبادت گاہوں کا کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بھی مساجد کے لئے دین اور دنیا کی دو اصطلاحیں وضع کر لی ہیں۔ ہم ان میں رسمی اور قولی عبادات کے سوا اور کوئی کاروائی سرانجام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حالانکہ حضور اکرمؐ مسجد ہی میں جلوہ افروز ہو کر مقدمات کے فیصلے فرمایا کرتے تھے، لوگوں کے دکھ سکھ سنا کرتے تھے، جنگوں کے لئے نقشے تیار کیا کرتے تھے، سفارتی امور سرانجام دیا کرتے تھے اور ہر طرح کی مجالس مشاورت منعقد فرمایا کرتے تھے..... عصری تقاضے یہ ہیں کہ ہمیں مساجد کو بہت جلد دینی بنیادوں پر منظم کر لینا چاہئے۔ مذہب نے ان پر بہت عرصہ راج کر لیا۔ اور اپنوں کے روپ میں غیروں نے ان سے بہت فائدے اٹھا لیے۔ اور دین میں وہ رخنے پیدا کر دیے ہیں کہ انہیں دور کرنے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہو گی۔ اگر آج ہم مساجد کو دینی بنیادوں پر منظم کر لیں تو کوئی مسلمان چار پانچ گھنٹے سے زیادہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی جماعتی مسئلہ ایک دن سے زیادہ حل طلب نہیں رہے گا۔ آج تک دنیا کی کوئی ایسی تحریک پیدا نہیں ہوئی جس کے پاک وصاف ماحول میں خدا کی رحمتوں کے سایہ میں بیٹھ کر ایک دن میں پانچ اجلاس (Five Meetings) ہوتے ہوں، اور جماعت کے ہر چھوٹے بڑے فرد کو اپنے اور جماعتی مسائل کو حل کرنے کا موقع ملتا ہو۔ مساجد کی نبوی تنظیم یہ ہے کہ ہر فرد محلے کی مسجد، ہر مسجد جامع مسجد، ہر جامع مسجد عید گاہ اور ہر عید گاہ کعبہ سے جڑی رہے۔ (۱۶)

اسی طرح مساجد بحیثیت دار المطالعہ کے علاوہ پنچایتی اداروں کے طور پر بھی استعمال میں لانے چاہئیں۔ حضور نبی کریم ﷺ اور مسجد نبوی میں طے پانے والے معاملات اس بات کی عکاس ہیں کہ مسلمانوں کا معاملہ مسجد کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے تنازعات کے لئے باقاعدہ عدالتوں کے چکر میں پڑنا کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ چھوٹے معاملات میں جو تادیبی کارروائیاں ہوا کریں گی ان سے خود بخود اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح مسجد کی سطح پر بیت المال کا انتظام کیا جائے تو صحیح معنوں میں حق دار کی دادرسی ہو سکے گی اور معاشرے میں باہمی اتحاد و یگانگت کا منظر قابل دید ہو گا اور یقین چاہیئے کہ اس سطح پر بیت المال کا صحیح استعمال نہ صرف غربت کے خاتمے کا سبب بنے گا بلکہ دنیا بہت جلد یہ دیکھ لے گی کہ زکوٰۃ لینے والا حق دار کوئی نہ ملے گا۔ اور رفتہ رفتہ دینی فضا قائم ہو کر شریعت کے نفاذ کے لیے ماحول پروان چڑھ جائے گا۔

بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ نہ صرف تمام مساجد کا مرکز ہے بلکہ مسلم امہ کے وحدت کا مظہر بھی ہے۔ درحقیقت مساجد کے ذریعہ پانچ اوقات مسلمانوں کی سطحی مجالس اور کعبہ میں مسلمانوں کی سالانہ عالمی کانفرنس نے مسلم امہ کو جوڑنے کا سامان فراہم کیا ہوا ہے۔ لیکن آج ہم اس تصور سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔ جن ذرائع سے دین نے ہمیں ایک لڑی میں پرویا تھا ہوشیار شاطروں نے اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے اپنوں کا روپ دھار کر دین کو مذہب سے تبدیل کر ڈالا اور انہی ذرائع سے اس لڑی کے ہر دانے کو بکھیر کے رکھ دیا۔ اب کوئی فرد اپنی ضروریات کے لئے محلے کی مسجد کی طرف نہیں دیکھتا، کوئی محلے کی مسجد خواہ وہ ڈیڑھ اینٹ ہی کی کیوں نہ ہو اپنی جامع مسجد سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔

کوئی جامع مسجد اپنی عیدگاہ سے وابستہ نہیں ہے، اور اسی طرح کسی ملک کا کوئی مندوب کعبہ میں بیٹھ کر جماعت کو اپنا دکھ درد نہیں سنا سکتا۔ اور سنائے بھی تو کسے، کوئی سننے والا بھی تو ہو۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ والی کیفیت ہے۔ تمام اسلامی حکومتیں اپنے تمام امور خدا کی رحمتوں سے بیگانہ رہ کر اپنے سیاسی ایوانوں میں انجام دیتی ہیں، اور اپنے فیصلے خدا کی مخلوق کو اپنی رعیت سمجھ کر اس پر تھوپتی رہتی ہیں۔ (۳۹)

اسی طرح باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہونے والا عظیم الشان اجتماع جو حج کی صورت میں مسلم امہ کو حاصل ہے، دنیا کے کسی مذہب میں ایسا نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے رب کائنات کی طرف سے نعمت عظمیٰ ہے، جو مسلمان کے لیے عظیم ترین سالانہ اسلامی کانفرنس کے لیے حاضر ہونا آسان بناتا ہے۔ کانفرنس، جسے کوئی شاہ، کوئی رئیس، کوئی حکومت یا کوئی تنظیم نہیں بلاتی بلکہ اس کی دعوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جس نے مسلمانوں پر اس کا سالانہ انعقاد فرض کیا ہے۔ مسلمان وہاں پر دنیا کے تمام براعظموں کے بھائیوں، جو مختلف ممالک، مختلف رنگوں اور مختلف زبانوں والے ہوتے ہیں، کو پاتا ہے جو ایک ترانہ الاپتے ہیں: لبیک اللھم لبیک۔ انہیں ایمان اور اسلام کے رشتے نے جمع کر دیا ہوتا ہے۔

اس کانفرنس کے کئی معنی ہیں اور کئی محرکات ہیں۔ وہ مسلمان میں امید کو زندہ کرتی ہے اور مایوسی کے عوامل کو ہٹاتی ہے، وہ ہمت بڑھاتی ہے اور عزم کو پختہ کرتی ہے۔ اجتماع ہمیشہ قوت کی روح پھونکتا ہے اور خوابیدہ امیدوں کو بیدار کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بھیڑیا ریوڑ سے بھٹکی ہوئی بکری کو ہی کھاتا ہے۔

یہ عظیم ترین کانفرنس مسلمانوں کو اپنے مسلم بھائی کا حق یاد دلاتی ہے، اگر چہ ان کے دیار دور در دور ہوں۔ وہ اسلامی اخوت اور رابطہ ایمان کی تذکیر کا بڑا ذریعہ ہے۔ وہ ایک ایسی بھٹی ہے جس کی حرارت میں قومی و وطنی جھگڑے تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس میں جملہ شعار اور نسلیں چھپ جاتی ہیں، سوائے ایک کے اور وہ شعار ہے انما المؤمنون اخوۃ اس کانفرنس میں اصحاب علم، اصحاب اصلاح و اصحاب سیاست باہم ملتے ہیں اور وہ ان کے لیے کتنا موزوں موقع ہے۔ جب وہ ایک ہی مقصد کے لیے ملتے ہیں، کہ باہم متعارف ہوں، ایک دوسرے کو سمجھیں، اچھی پلاننگ کی تدبیر اور عمدہ وسائل میں باہم تعاون کریں تاکہ اہداف کو حاصل کریں اور امیدوں کو بر لائیں۔

رسول کریم ﷺ نے اس کانفرنس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے جب آپؐ نے اہم فیصلوں اور پیغامات کے اعلان کے لیے، جن کا تعلق عوام کی حکمت عملی سے تھا، منبر کو اختیار فرمایا۔

چنانچہ حج کے پہلے سال جس میں مسلمانوں نے حضرت ابو بکرؓ کی امارت کے تحت حج کیا تو نبی ﷺ نے ان کے پیچھے حضرت علیؓ کو بھیجا تا کہ وہ لوگوں میں ان معاہدات کی منسوخی کا اعلان کریں جو آپ ﷺ اور ان مشرکین کے مابین تھے جنھوں نے بدعہدی کی۔ اور یہ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ اور نہ کوئی برہنگی کی حالت میں بیت اللہ شریف کا طواف کرے۔

اور اگلے سال جب کہ نبی کریم ﷺ نے خود حج کیا تو عوام الناس کے سامنے وہ خطبہ "البلاغ" یا "الوادع" ارشاد فرمایا جس میں آپ ﷺ نے اسلام کا دستور اور اس کے اصول بیان فرمائے۔

علمائے اسلام نے اس کانفرنس کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے آراء کا باہم تبادلہ کیا۔ ایک دوسرے کے افکار سے واقف ہوئے ہیں اور احادیث کی روایات پر گفتگو کی ہے۔

اسی طرح سے اس عالمی اجتماع کی اہمیت کے پیش نظر خلفاء نے اسے اپنے اور دور دراز کی مسافتوں سے آنے والے عوام کے درمیان اور اپنے اور مختلف علاقوں کے عمال کے مابین کھلی کچہری بنایا۔ لوگوں میں سے اگر کسی پر کوئی ظلم ہوا ہوتا یا کوئی شکایت ہوتی تو وہ بذات خود بلا واسطہ اور بلا حجاب خلیفہ کو پیش کرتا۔ وہاں پر خلیفہ کے آگے عوام گورنروں کا سامنا بلا خوف و بلا تحفظ کرتے، داد خواہ کی فریاد رسی کی جاتی اور مظلوم کے ساتھ انصاف ہوتا اور حق بحق دار رسید کو یقینی بنایا جاتا، اگر چہ یہ حق کسی والی یا خلیفہ سے قابل وصول ہوتا!!

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ نے جملہ اسلامی علاقہ جات کی طرف ایک چٹھی ارسال کی جس میں لکھا: میرے پاس ہر حج کے موسم میں میرے عمال یعنی والیان آتے ہیں اور میں امت پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے مقرر ہوں۔ لہٰذا میرے یا میرے عمال میں سے کسی کے خلاف کوئی دعویٰ کیا جائے گا تو میں اس کا ازالہ کروں گا۔ میرے اور میرے عمال کے کسی حق کو رعیت کے حق پر ترجیح نہیں سوائے اس کے جو ان کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اور اہل مدینہ نے میرے سامنے یہ بات رکھی ہے کہ لوگوں کو گالیاں دی جاتی ہیں اور مارا جاتا ہے۔ اس قسم کا جہاں بھی جس کسی کا میرے یا میرے عمال کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو وہ حج کے موقع پر پیش کرے اور اپنا حق وصول کرے یا معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو بہتر بدلہ دیتا ہے۔ (۴۰)

آج مسلم امہ نے اس نعمت کی قدر کھو دی ہے اور یہ کانفرنس، مساوات، اتحاد و اصلاح امت کے بجائے ایک مذہبی فریضے کا رخ اختیار کر گیا ہے۔ اور امت کا یہ اجتماع جمرات پر کنکریاں مارنے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے، اور یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کی زمین پر جو فساد پھیل رہا ہے وہ بھی شیطانی عمل ہے، لیکن یہ سب کچھ روح سے خالی ہے۔

یہ نعمت ہمیں کیوں ملی ہے؟ ہم آخر کیوں جمع ہوتے ہیں؟ ہماری عبادت کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں؟ اور کیا ہم نتائج حاصل کر پا رہے ہیں؟۔ یقیناً اس کا جواب لاعلمی یا نہیں میں ہے۔ کیونکہ ہماری عبادات رسماً پوری ہو رہی ہیں۔

ہے طواف وحج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام! (۴۱)

ایک طرف توحق کے ماننے والوں اور توحید کے پرستاروں کی یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل ہی نہیں بلکہ ورثہ محمدؐ بھی بڑی چابکدستی سے لے اُڑے ہیں۔ انہوں نے صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کی طاقت کا راز معلوم کر لیا تھا، وہ محمود کے مقابلے میں ایاز کی اہمیت کو سمجھ چکے تھے۔ بالفاظِ دیگر انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ فرد کی اہمیت جماعت کے مقابلے میں کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گرجہ (Church) میں بہت معمولی سے تصرف کے ساتھ وہی تنظیم پیدا کر لی جو مساجد میں تھی۔ اور ساتھ ہی پوپ کی صورت میں اپنی مرکزیت بھی قائم کر لی۔ صلیبی جنگوں کے بعد دنیا کی بڑی سے بڑی عیسائی حکومتوں کے سربراہ اس طرح پوپ کے فیصلوں کو اہمیت دینے لگے جیسے سلطان نور الدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان محمود غزنوی، ملک شاہ سلجوقی اور ہند اور دوسری اسلامی سلطنتوں کے سلاطین خلافتِ اسلامیہ کے فیصلوں کو دیا کرتے تھے۔ اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ تثلیث کے مشرکانہ نظریے کو جو اصولاً بالکل غیر حقیقی ہے اسلام کے صحیح معاشرتی اور دینی اصول برت کر نہ صرف فروغ ہی دیئے چلے جاتے ہیں بلکہ اُسے مسلمانوں کی معاشی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان پر تھوپتے چلے جاتے ہیں۔ اور توحید کا بیٹا جس کے پاس مذہب کے رُخ سے حقیقت کا نور ہے اتنا قابل رحم ہو چکا ہے کہ بقول شخصے بربریت کو بھی اس پر ترس آنے لگا ہے۔ چنانچہ ایک اسلام دشمن کٹر ہندو یہ کہتا ہے: "مسلمان بتدریج ختم ہونے والی طاقت بن چکے ہیں، انہوں نے اپنے امتیازات گنوا دیئے ہیں"۔ (۴۲) پس امت کو اس جاری نعمت عظمیٰ کے مقاصد کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ اور یہ جان لینا چاہیۓ کہ کفر مسلمانوں کے اس اجتماع سے کتنا خوفزدہ ہے۔

مسیحی مشنریوں میں سے ایک نے اپنی سالانہ رپورٹ میں جو ہمارے اسلامی ممالک اور بالخصوص مصر میں اپنی تبلیغ کی افادیت کے دائرہ کار سے متعلق لکھا ہے: اسلام ایک سخت چٹان کی صورت میں رہے گا جس کے ساتھ مسیحی تبلیغ کی کشتیاں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہیں گی۔ جب تک کہ اس کے یہ چار ستون قائم ہیں: القرآن.... اور الازہر.... اور ہفتہ وار اجتماعِ جمعہ..... اور سالانہ اجتماع حج"۔ (۴۳)

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں (۴۴)

اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن کو سینے سے لگائے اس کی تعلیم حاصل کر کے اپنی اجتماعیت صالحہ کے ذریعے اس کانفرنس سے کما حقہٗ استفادہ کریں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ قدرت کے اس انمول تحفے (مساجد و بیت اللہ) اور اس نعمت عظمیٰ (اجتماعیت) کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔اسلام کا تو درس یہ ہے کہ:

اذا خرج ثلثة فی سفر فلیومرو احدھم (۴۵)

ترجمہ: "جب تم میں سے تین آدمی (بھی) سفر کے لیے نکلیں تو چاہیے کہ ایک کو اپنا امیر بنالیں"۔اور یہاں امیر (امام مساجد و بیت اللہ) بھی موجود ہیں اور اجتماعیت بھی ہے مگر ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم نے امامت صغریٰ یعنی چھوٹی امامت (مساجد و بیت اللہ) کو امامت کبریٰ یعنی بڑی امامت (خلیفہء اسلام) سے الگ کر کے اول الذکر کو دین اور مؤخر الذکر کو دنیا سے جوڑ دیا ہے۔حالانکہ دنیا تو دارالعمل ہے اور آخرت دارالجزاء ہے۔دونوں لازم و ملزوم ہیں۔لیکن آج دونوں امامتیں الگ الگ کر دی گئی ہیں۔اسلام مذہب نہیں ہے کہ وہ صرف عبادت کے لیے پیمانہ مقرر کرے، اسلام دین ہے، وہ مسجد سے باہر بھی مکمل رہنمائی کرتا اور امت پر وہی ذمہ داری ڈالتا ہے جس طرح امامت صغریٰ کے انتخاب کے لیے امت کوشاں رہی اسی طرح امامت کبریٰ کے لیے بھی محنت ضروری ہے۔

فصل ہفتم

شعوری بیداری

ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم مرحلہ شعور کی بیداری سے تعلق رکھتا ہے۔سب سے پہلے نفسیاتی اور روحانی طور پر تیاری کرنے کا مرحلہ ہے۔اس لیے کہ اگر کسی کے اپنے پاس ہی کوئی شے موجود نہ ہو تو وہ دوسرے کو کیا دے گا۔یہ مرحلہ انسان کی زندگی میں ہر چیز کی بنیاد ہوتا ہے۔اگر خود انسان میں وہ صفت موجود نہ ہو جس کی وہ دوسروں کو دعوت دے رہا ہے، اس میں وہ اخلاق ہی ناپید ہوں جو وہ دوسروں میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کی ساری کوشش ناکام اور بے اثر رہے گی.....اس حقیقت کے باوجود کہ آپ ﷺ معصوم پیدا کیے گئے تھے، اخلاق عالیہ آپ ﷺ کی فطرت میں ودیعت کر دیئے گئے تھے، آپؐ میں سچائی، امانت، سخاوت، کرم، پاکیزگی، عفوو درگزر، صبر، بہادری اور ان جیسی وہ سب صفات بدرجہ اتم موجود تھیں.... ان سب صفات کے باوجود رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی بہت زیادہ عبادت فرماتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ روحانی اور نفسی کمالات کے مرتبہ تک پہنچ سکیں۔(۴۶) یہ حقیقت ہے کہ نبی ﷺ اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے لہٰذا انہیں اس پہلے مرحلے سے گذرنے کی ضرورت نہ تھی۔مگر تقویت کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے اس میں مزید اضافہ کیا اور پھر اس دور میں اس طرح ان کے شعور کو بیدار کیا اور ایک ایسی امت تشکیل دی کہ تاریخ دنیا میں ان کی مثال مشکل ہے۔آج ہمیں اس پہلے مرحلے یعنی اپنی اصلاح نفس و تزکیہ نفس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں بھی ان چیزوں کا اہتمام ضروری ہے۔لہٰذا بچے کی تربیت کا کام اس کی پیدائش کے بعد نہیں بلکہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب بچہ ماں کے پیٹ ہی میں ہوتا ہے۔لہذا حلال و حرام کا خیال رکھنا ضروری ہے۔اسی طرح بچوں کو صحیح اور صاف ستھری تربیت اور پاکیزہ درس گاہ فراہم کرنا ضروری ہے، جہاں وہ علم کے ساتھ ساتھ مکارم اخلاق کی تعلیم بھی حاصل کرے، ورنہ اگر ہم اس کو نامناسب ہاتھوں میں دے دیں گے تو وہ اس کو اپنے فاسد، ناپاک اور متعفن ماحول کا خوگر بنالیں گے۔اور یہ اس کا حصہ بن کر معاشرے کے بگاڑ کو بڑھانے کا سبب بنے گا۔

ہم قافلہ انسانیت میں آج بہت پیچھے ہیں، اس لیے کہ ہم نے عمل کو نظر انداز کر کے صرف قول پر اکتفا کر لیا ہے، ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ اپنے ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ ہیں۔ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو خواب میں کھانا کھا کر اپنا پیٹ پالنا چاہتا ہو۔

ہم اس دیوالیہ انسان کی طرح ہیں جو لوگوں کو اپنی سابقہ دولت مندی کی داستانیں سناتا پھرتا ہو..... اسلام کی طرف ہم اس وقت لوٹیں گے جب ہم اپنی خود پسندی اور جہالت سے دستکش ہونے کو تیار ہوں، ہم یہ اقرار و اعتراف کریں کہ ہم اب ایک پسماندہ قوم ہیں جو بہت پیچھے رہ گئی ہے، قافلہ انسانیت ہم سے بہت آگے جا چکا ہے۔ ہم خود کو طالب علم سمجھ کر اپنے اندر جو کمی ہے اس کو پورا کریں اور جو نہیں آتا وہ سیکھیں، ہم یہ محسوس کرلیں کہ آج جب کہ ترقی و اقبال مندی کے تمام وسائل و اسباب بسہولت میسر ہیں اب پسماندگی کا کوئی جواز نہیں۔ جب ہم اس حقیقت کا اعتراف کرلیں گے تو ہم میں اپنی اصلاح کرلینے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی، ہم اٹھ کر ترقی یافتہ قوموں کی برابری بھی کرنے لگیں گے۔ یاد رکھیئے واقعیت کا ادراک کرلینا اور موجودہ پسماندگی کا اعتراف کرلینا کوئی عار کی بات نہیں بلکہ عار کی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنی خود پسندی اور جھوٹے غرور میں مسلسل مبتلا رہیں اور یہ دعوی کرتے رہیں کہ ہم آج بھی اقوام عالم کے اس لیے قائد ہیں کہ ہمارے باپ دادا بڑے عظیم لوگ تھے۔

اس زمانے میں دنیا کی کسی دوسری قوم کو ایک اعلی اور برتر زندگی کے وہ اسباب وعوامل میسر نہیں جو ہم مسلمانوں کو عموماً ہر زمانہ میں اور بالخصوص آج میسر ہیں، ہم کو آج بھی درج ذیل خصوصیات حاصل ہیں:

۱۔ ہمارے پاس ایک ایسا آسمانی نظام حیات موجود ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور نظام نہیں کرسکتا، یہ وہ نظام ہے جو بیداری، عمل اور آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے، یہ وہ نظام ہے جو زندگی کی ضروریات اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ترقی پذیر ہے، اس ضمن میں مشہور فقہی کلیہ ہے: لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان
زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ احکام کی تبدیلی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ آسمانی نظام ہے جو انسان کو کسی بھی خیر و بہتری کے حاصل کرنے سے نہیں روکتا۔

۲۔ ہم ایک کثیر التعداد امت ہیں جس کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے اور جس کے ارکان دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۳۔ ہم ایک ایسی امت ہیں جو کہ کرہ ارض کے دور دراز اور وسیع مقامات پر تصرف رکھتی ہے۔ ہمارے ممالک مشرق سے مغرب تک ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں یہ ممالک اپنے محل وقوع، زرخیزی اور مٹی کے اعتبار سے دنیا کے بہترین علاقے ہیں۔

۴۔ ہمارے ممالک میں وہ تمام خزانے بھرے پڑے ہیں جو آج کی اکثر صنعتوں میں بطور خام مواد استعمال ہوتا ہے، اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود پٹرول ان عظیم خزانوں کا محض ایک معمولی حصہ ہے۔

۵۔ ہم دنیا کی دولت مند ترین قوم یا کم از کم دولت مند ترین قوموں میں سے ایک ہیں، لیکن ہم نے نہ تو اپنی دولت کا بہترین استعمال کیا اور نہ اس کو صحیح طرح سے تقسیم کیا۔

۶۔ ہم میں نہایت جلیل القدر علماء، پختہ کار عقلاء، عالی ہمت زعماء اور نادر الوقوع صلاحیتوں والے لوگ موجود ہیں جن میں ان سب چیزوں کے ساتھ قربانی اور فدائیت کا اعلیٰ جذبہ بھی موجود ہے۔ لیکن اس علمی و فکری دولت کا بڑا حصہ جان بوجھ کر یا ناواقفیت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

۷۔ ہم سب ایک ایسی امت ہیں جو ایک کتاب پر ایمان رکھتی ہے اور ہم سب اس کتاب کو ایک ہی زبان میں پڑھتے ہیں۔ (۴۷)

ہم سب ایک ہی دین کے ماننے والے اور ایک ہی نظریہ پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ دنیا میں اتنی بڑی تعداد کو ایک نظریہ پر ایمان رکھنے پر ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ پس اس احساس کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ امت مسلمہ ہی وہ صلاحیت رکھتی ہے جس سے دنیا کو حقیقی معنوں میں امن و سکون اور احترام انسانیت حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دین اسلام کے احکام چاہے وہ مذہبی، سماجی، معاشرتی یا سیاسی ہوں اس کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ چھوڑ دیں اور اپنی تعلیمات اسلامیہ پر اضطراب کے بجائے ہر ایک مسلمان کو دنیا میں اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہیے۔ اس کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ باقی دنیا سے مختلف اور ممتاز ہے جس پر اس کو فخر کرنا چاہیے اور اس فرق کو ایک قیمتی وصف کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ معذرت کرنے اور دوسری ثقافتوں میں اس کو ضم کرنے کی بجائے اس قیمتی وصف کا پوری جرأت سے اعلان کرنا چاہیے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان بیرونی دنیا سے بالکل ہی بے تعلق ہو جائیں، البتہ انہیں اپنی تہذیب ترک کیے بغیر وقتاً فوقتاً بیرونی تہذیب کے نئے اور مثبت اثرات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک مثال یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یورپ نے کتنی جلدی عربوں کے علمی اثرات کو قبول کر لیا لیکن یورپ نے عربوں کی وضع قطع اور عرب ثقافت کی کبھی نقالی نہیں کی اور اپنی دانش اور جمالیاتی آزادی کو قربان نہیں کیا۔ یورپ نے عربوں کے اثرات کو استعمال کیا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں روحانی دولت میں اضافہ ہوا اور ایک نئی اور توانا تہذیب نے جنم لیا جو اعتماد سے بھرپور اور پروقار تھی۔ کوئی بھی تہذیب اپنا وقار کھو کر اور ماضی سے رشتے کاٹ کر پھل پھول نہیں سکتی بلکہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ (۴۸)

فصل ہشتم

امید کامل اور جذبہء جرأت وقربانی کو پروان چڑھانا

کسی بھی قوم یا گروہ کو جب باطل قوتیں پستی میں گرانا چاہتی ہیں تو وہ مایوسی و بزدلی کو عام کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کرتی ہیں اور جو بھی قوم مایوسی کا شکار ہو جائے تو اس کے اندر سے امید کی حرارت ختم ہونے لگتی ہے جس کے نتیجے میں وہ قوم اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے کے بجائے مزید مایوسی کی افواہوں کو ہوا دینے میں مصروف عمل ہو جاتی ہے۔ اسلام کے خلاف مغربی سازش ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ مسلم اقوام دوبارہ اپنے سر کو نہ اٹھا سکیں اور نہ ہی دنیا میں کوئی مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ لہٰذا سیاسی معاملہ ہو یا تعلیمی ہر معاملہ میں مسلم امہ کو پیچھے رکھنے کی سازشی منصوبہ بندی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اور ان سازشوں میں کامیابی کے لیے انہوں نے امت مسلمہ کے اندر مایوسی واحساس کمتری کو پھیلایا۔ اور ان کی یہی کوشش رہی کہ قدرت کی طرف سے مسلم امہ کو عطا کردہ نعمت افرادی و مادی اور ایٹمی طاقت ہونے کا ان کو احساس نہ ہونے دیا جائے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود کفر کی ہیبت نے اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے اور مسلم امہ نے والیٔ غرناطہ کو الحمراء کی چابی دینے سے، اپنے برادر ملک افغانستان پر حملے کے لئے لاجسٹک سپورٹ کے لیے اپنی سرزمین استعمال کرنے دینے تک، صرف ایک دھمکی آمیز فون پر کہ پتھر کے دور میں لوٹا دیئے جاؤ گے، کفر کے آگے قیام کے بجائے سجدہ ریز ہونے کا دلخراش منظر دیکھ چکی ہے:

یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا (۴۹)

مسلمان جنہیں دوست سمجھ رہے ہیں اور جو خود کو مسلمانوں کا دوست بتاتے نہیں تھکتے وحیِ الٰہی نے اسکی وضاحت کر دی ہے کہ وہ مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں اور نہ ہی وہ مسلمانوں سے محبت و ہمدردی رکھتے ہیں:

هَاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ (۵۰)

ترجمہ: "سن لو تم لوگ ان کے دوست ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ امت مسلمہ کے کسی بھی فرد کو کفر کی مادی طاقت، ظاہری جسامت اور شان وشوکت دیکھ کر مضطرب نہ ہونا چاہئے کیونکہ ایک مسلمان کے لیے قوت کا اصل سرچشمہ ذات باری ہے۔ ابو العباس احمد ابن محمد المقری نے طارق ابن زیاد کے اصل الفاظ قلم بند کیے ہیں:

ایھا الناس، این المفر؟ البحر من ورائکم، و العدو اما مکم، و لیس لکم و اللہ الا الصدق و الصبر ۔(۵۱)

ترجمہ: "اے لوگو! بھاگنے کے لیے یہاں کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہارے پیچھے سمندر ہے اور تمہارے سامنے دشمن، میں اللہ پر قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے پاس صرف اخلاص ہے یا صبر۔"

طاغوتی قوتیں تو یہی چاہتی ہیں کہ مسلمان امید ورجاء سے دور ناامیدی اور احساس کمتری کا شکار رہیں۔

چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں! (۵۲)

سچ تو یہ ہے کہ مغرب اپنے طاقت کے اس اصل سرچشمہ کو کھو چکا ہے، جو مسلسل اور دائمی طور پر انسان کو قوت فراہم کر رہا ہوتا ہے۔ جس طرح اجرام فلکی میں سے کوئی عظیم جسم جب کسی جلتے ہوئے ستارے سے جدا ہوتا ہے تو بہت دیر نہیں گذرتی کہ وہ بجھ کر رہ جاتا ہے اسکی روشنی مدھم اور تپش ختم ہو جاتی ہے۔ اگر چہ اس کا ظاہری جسم عظیم الشان ہو لیکن اس کے برعکس ایک حقیر ذرہ بھی اپنی قوت اور روشنی کے اصل منبع سے جڑا ہوا ہو تو وہ اس سے مسلسل حرارت اور روشنی حاصل کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایمان والے اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہوئے یہ یقین رکھتے ہیں کہ

وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۵۳)

ترجمہ: "دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔"

مومن تو ناامید نہیں ہوتا وحی الٰہی میں اسلاف کی عملی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَـكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا ۖ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ○ (۵۴)

ترجمہ: "جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے"۔

آج بھی مسلم امہ اپنے تعلق کو خالق سے جوڑ لے جو کہ طاقت وقوت کا مالک ہے تو ایسی ایمانی قوت اور یقین کامل عود آئے گی جس کے سامنے باطل خش وخاشاک کی طرح بے حقیقت نظر آئے گا۔ جسکا اظہار ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس طرح کیا ہے: اگر آپ اس کی صحیح پیروی کریں اور اپنے قول اور عمل سے اس کی سچی شہادت دیں اور آپ کے اجتماعی کردار میں پورے اسلام کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ ہونے لگے تو آپ دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخ رو ہو کر رہیں گے۔ خوف اور حزن، ذلت اور مسکنت، مغلوبی اور محکومی کے یہ سیاہ بادل جو آپ پر چھائے ہوئے ہیں چند سال کے اندر چھٹ جائیں گے۔ آپ کی دعوت حق اور سیرت صالحہ دلوں کو اور دماغوں کو مسخر کرتی چلی جائے گی۔ آپ کی ساکھ اور دھاک دنیا پر بیٹھتی چلی جائے گی۔ انصاف کی امیدیں آپ سے وابستہ کی جائیں گی۔ بھروسہ آپ کی امانت ودیانت پر کیا جائے گا۔ آئمہ کفر کی کوئی ساکھ آپ کے مقابلہ میں باقی نہ رہ جائے گی۔ ان کے تمام فلسفے اور سیاسی ومعاشی نظریئے آپ کی سچائی اور راست روی کے مقابلے میں جھوٹے ملمع ثابت ہوں گے اور وہ طاقتیں جو آج ان کے کیمپ میں نظر آرہی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام کے کیمپ میں آتی چلی جائیں گی۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا۔ سرمایہ دارنہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہوگی۔ مادہ پرستانہ الحاد خود لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہوگا۔ نسل پرستی اور قوم پرستی خود برہموں اور جرمنوں میں اپنے معتقد نہ پا سکے گی اور یہ آج کا دور صرف تاریخ میں ایک داستان عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر وجہاں کشا طاقت کے نام لیوا کبھی اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔ (۵۵) مسلمانوں کے سارے نقائص کے باوجود یہ حقیقت اب بھی اسی طرح باقی ہے، جاہلیت دنیا کے لئے جو نقشہ رکھتی ہے، اور جس نقشہ پر وہ آج دنیا کو چلا رہی ہے، اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے اگرچہ مسلمان خود اسکو بھولے ہوئے ہیں لیکن یہ نقشہ ابھی ضائع نہیں ہوا اور نہ کبھی ضائع ہو سکتا ہے۔

مسلمان اپنے دین کے رو سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں، جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب ہوگا، انھیں کے خاکستر میں وہ چنگاری دبی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی دن بھڑک کر جاہلیت کے خرمن کو جلا کر خاک کردے گی۔(۵۶)

یقین افراد کا سرمایہء تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے (۵۷)

اسی طرح ترقی کا راستہ اسی وقت کھلنا شروع ہوتا ہے جب یقین کامل کے ساتھ اس کے لیے جدوجہد کی جائے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (۵۸)

ترجمہ: "اور جو لوگ ہمارے راستے کی طرف جدوجہد کریں گے ہم انہیں ضرور اپنے راستے دکھائیں گے۔"

غلبہ وعروج کے لیے لازم یہ ہے کہ دعوت کے ساتھ جرأت وشجاعت کی روح اور صبر واستقلال اور قربانی کا جذبہ وشوق بھی وابستہ ہو، اگر حالات کا تقاضا ہو تو خطرات میں کود پڑنے کی ہمت اور طاقت بھی رہنی چاہئے کیونکہ انسانوں کی فطرت ہے کہ وہ قوی ایمان، بے مثال جرأت وشجاعت اور خطرات میں بے خطر کود پڑنے کے جذبہ کی بہت قدر کرتے ہیں، وہ ایسی چیزوں کو بڑی عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جو خود ان کے اندر نہ ہوں اور اسلام کی تاریخ حیرت انگیز شجاعت اور خطرات کو گلے لگانے کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔(۵۹)

فصل نہم

اسلامی وجدید علوم پر تحقیق

اعلیٰ اخلاقی تہذیب اور مسلمانوں کے شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے دور عروج اور کے غلبہء اسلام میں عالم انسانی یہ محسوس کرتی تھی کہ تہذیب وتمدن اور فکر وعلم ہے تو مسلمانوں کا ہے۔ مگر دور انحطاط میں خود مسلمانوں کی یہ صورتِ حال ہوگئی ہے کہ کوئی تہذیب وتمدن اور علم وفن ہے تو اہلِ مغرب کا ہے۔ جمود کے اثرات یہ ہوئے کہ مسلمان مغرب کے افکار وفلسفے اور ان کی تہذیب وتمدن سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

جمود دراصل انحطاط کی راہ سہل بنانے کا ذریعہ ہے اور جب انحطاط کا عمل پروان چڑھنے لگتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ مغلوبیت کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے اور جس قدر انحطاط زیادہ ہوگا مغلوبیت کا اثر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ زوال کا شکار کیوں ہے؟ اس کے جوابات تو بہت دیے جاسکتے ہیں مگر ان میں سے اہم ترین جواب یہ ہے کہ جب سے مسلمانوں نے علم سے روگردانی کی ہے اس وقت سے ان کا زوال شروع ہوا ہے اور جب تک ہم نئے سرے سے علم کی طرف توجہ نہیں کریں گے اور اپنی سوچ کو شریعت اور حقائق حیات کے مطابق نہیں بنائیں گے اس وقت تک ذلت وپستی سے نکلنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔(۶۰)

نشاۃ الثانیہ کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ ہم نئے سرے سے علمی وتحقیقی کاموں کی درجہ بندی کریں اور اس ساری کاوشوں کیلئے منصوبہ بندی کریں اور مقصود متعین کریں اور تحقیقی مراحل کو اسان بناتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ بہترین فکر و نظر کا اظہار ہو سکے اور ہماری تحقیقات، تحرکات کا سبب بنیں اور یہ مساعی غلبہء اسلام کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔

علمی وتحقیقی کاموں کی درجہ بندی میں اس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کس قسم کی علمی تحقیقات ہمارے منزل ومقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔ ایک تو وہ ریسرچ ہے جو مغربی محققین ہم کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایک بے مقصد اور بے رنگ ریسرچ ہے۔ وہ محض ریسرچ برائے ریسرچ ہے۔ مثلاً کتابوں کو ایڈیٹ کرنا، ان کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے ان کی عبارتوں کا فرق پرکھنا اور مصنفین کے سنینِ وفات و پیدائش کو جمع کرنا اور اسی قبیل کی جو ریسرچ ہے، یہ بے مقصد اور بے معنیٰ ریسرچ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ علوم وفنون میں مددگار ہوتی ہے، لیکن بجائے خود یہ وہ ریسرچ نہیں ہے جو کسی قوم کو زندگی کی حرارت عطا کرتی اور حیات میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ یہ ٹھنڈی اور بے معنی ریسرچ ہے۔ اہل مغرب ایک ریسرچ اور بھی کرتے ہیں۔ وہ محرک قسم کی ریسرچ ہے، وہ اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ ان کے پاس وہ طاقتیں فراہم ہوں جوان کو دنیا پر غالب کر سکیں۔ ایک اور قسم کی ریسرچ ہمارے ہاں بھی شروع کی جارہی ہے کہ ریسرچ تو اسلام کی کی جائے، مگر اس غرض کے لیے کہ ایک نیا اسلام تصنیف کیا جائے جو تمام مغربی افکار و اقدار کے بالکل مطابق ہو یعنی جو کچھ مغرب میں حلال ہے، وہ حلال ثابت کیا جائے اور جو کچھ مغرب کی نگاہ میں حرام ہے اسے حرام ثابت کیا جائے اور اسلام کو کسی نہ کسی طرح ڈھال کر ایسا دکھایا جائے کہ گویا یہ بھی مغربی تہذیب وتمدن کا ایک دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ ریسرچ بھی ہمارے کسی کام کی نہیں ہے۔ یہ محض مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی ہے۔ (۶۱)

لہذا مقصود علمی تحقیقات کی طرف ہم پیش قدمی کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم اس سحر سے نکلیں جو مغربی فکر نے ہمارے ذہنوں کو سحر کر رکھا ہے۔ معقول اور مدلل علمی تنقید کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کریں کہ مغربی علوم وفنون میں جو دلائل، حقائق اور واقعات ہیں، علمی اعتبار سے سب کا حق اس پر ہے مگر جو خمیر اس مرکب سے تیار کیا گیا ہے وہ قطعی باطل ہے۔ لہذا ہمیں ان لوگوں کی تحقیق کے محور میں گھومنے سے بچنا چاہیے جس میں بغض و تعصب کا عنصر موجود ہو۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین لکھتے ہیں:

مستشرقین کی تحقیق کا سبب نہ اسلام کی محبت ہے اور نہ مسلمان علماء اور فضلا کی قدردانی، بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان مستشرقین کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بالعموم ایک شدید قسم کا تعصب موجود ہوتا ہے۔ لہذا جب بھی وہ اپنے میکانکی کام سے ذرا ہٹ کر مسلمانوں کے معتقدات اور نظریات کی توجیہہ کرنے لگتے ہیں تو ان سے یہ توقع کرنا عبث ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق کوئی موافقانہ رائے قائم کریں گے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحقیق کا ایک حصہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعتراضات سے معمور ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے کام کے اس حصہ کو نظر ثانی کے بعد ان کی غیر منصفانہ تنقید سے پاک کریں۔ (۶۲)

علوم وفنون کی ترتیب نو:

اسلامی نقطہ نظر سے تمام علوم وفنون کو نئے اسلوب اور نئے طریقے سے مرتب کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں۔

پھر اسلام کے مطابق ہمیں ایک فلسفہ بھی درکار ہے جو انسان کے ذہن کی اس تلاش کو تسکین دے کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر یہ تسکین اس عقیدے کے مطابق دے جو اسلام نے ہمیں دیا ہے.... روس میں مغربی تہذیب سے بالکل مختلف ایک تہذیب اٹھانے کی کوشش کی گئی اور جب روسیوں نے کمیونسٹ طرزِ فکر کو اختیار کیا تو وہ کسی طرح سے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جس کو وہ بورژوا فلسفہ کہتے تھے، وہ اسے اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائیں، کیونکہ بحیثیت کمیونسٹ ان کے اپنے وجود کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک کمیونسٹ فلسفہ مرتب کریں اور اسے اپنی نئی نسلوں کو پڑھائیں کیونکہ جب تک وہ اس بورژوا فلسفے کو نہ ہٹائیں گے اور اس کی جگہ اپنا اشتراکی فلسفہ ذہنوں میں نہ بٹھائیں گے، اس وقت تک نہ تو طرزِ فکر بدل سکتا ہے اور نہ ایک کمیونسٹ نظام کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمارے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ایک اسلامی فلسفہ مرتب کریں، تمام علومِ عمرانی کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔ بلاشبہ واقعات اور حقائق وہی رہیں گے جو دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہیں لیکن ان واقعات اور حقائق پر ایک پورا نظامِ فکر و عمل مرتب کرنا خواہ وہ معیشت کا علم ہو اور خواہ قانون و فلسفہء قانون کا علم ہو۔ غرض جتنے بھی علومِ عمرانی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو باقاعدہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ (۶۳) اسلامی تہذیب کا عروج اسی وقت ممکن ہے جب ان علوم کو از سرِ نو اسلامی نقطہ نظر سے مرتب کیا جائے اور تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھیں اور تہذیب اسلامی کا عروج ممکن ہو سکے۔

فصل دہم

لسانی روابط اور مؤثر ذرائع ابلاغ کی صلاحیت

عصر حاضر میں جبکہ مسلم امہ مختلف اسلامی بلاک میں منقسم ہے،لسانی روابط کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔اگر چہ مسلم ممالک سیاسی اور معاشی تعاون کے لیے پیہم کاوشیں کررہے ہیں مگر انہوں نے لسانی اشتراک کے لیے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔زبان علوم کی ماں اور باہمی اتحاد کی سب سے بڑی قوت ہے۔مسلم اُمہ کو اس جانب بھی بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مشرقی اور مغربی دنیا میں مختلف النوع زبانیں مروج ہیں۔وسطی دنیا یعنی مسلم ممالک کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ ان کے ہاں چار بڑی زبانیں مروج ہیں۔یہ چار بڑی زبانیں عربی، فارسی، ترکی اور اردو ہیں۔یہ زبانیں اساسی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔عربی قرآن مجید اور دینِ اسلام کی زبان ہے،اس کی جڑیں فارسی میں بہت گہری ہیں اور جب فارسی ادبی صورت اختیار کرتی ہے تو وہ عربی کا روپ دھار لیتی ہے۔فارسی ادبی زبان کا بڑا حصہ عربی سے ماخوذ ہوتا ہے۔یہی حال اردو کا ہے کہ جب اس میں ادبی شان پیدا ہوتی ہے تو یہ فارسی وعربی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ترکی زبان کی صورت بھی ایسی ہی ہے،البتہ لاطینی رسم الخط کی وجہ سے اس کا موجودہ رخ یورپ کی طرف ہوگیا ہے۔فارسی اور اردو اگر چہ آبائی زبانیں ہیں مگر ان دونوں زبانوں نے صرف ڈھانچا آریائی سے مستعار لیا ہے اور ان زبانوں کی دیگر علمی ساخت جیسے: اصطلاحات،علوم ومعانی،اسلوب وطرز بیان اور درسی مواد بیشتر عربی سے اخذ کیے گئے۔عربی، فارسی اور اردو علمی ومعنوی لحاظ سے اتنی قریب ہیں کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں اس قدر قربت موجود نہیں ہے۔یہی حال عثمانی ترکی کا تھا۔

عربی، فارسی ترکی اور اردو ہر لحاظ سے مکمل زبانیں ہیں۔لغت،قواعد تراکیب،معنی،اسلوب اور ساخت کے اعتبار سے باصلاحیت اور مؤثر زبانیں ہیں۔حلقہء اثر کے لحاظ سے یہ زبانیں مراکش کے مغربی ساحل سے انڈونیشیا کے مشرقی علاقے تک تقریباً آدھی دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔عربی وفارسی ان جملہ علوم وفنون کی ماں ہیں، جو جدید مغربی دنیا کے علوم وفنون کی اساس ہیں، جسے شک ہو وہ مغربی ممالک کے کتب خانے جا کر دیکھ لے۔عربی وفارسی میں ترقی یافتہ علوم وفنون کا خام مواد موجود ہے اور انہیں اسے کسی دوسری زبان سے مستعار لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔انہیں صرف معلومات دوسری زبانوں سے اخذ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان زبانوں میں نئے علوم کو اپنے اندر جذب کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ عربی و فارسی نے اس سمت میں خاصی پیش رفت کر لی ہے۔(۶۴) اب مسلم امہ میں اتحاد کو فروغ دینے کے لئے لسانی روابط کو مستحکم کرتے ہوئے جرائد اسلامیہ جو کہ مکمل طور پر عالم اسلام کی عکاسی کرتے ہوں اسکا باقاعدہ اجراء ممکن بنایا جائے اور اسکی فراہمی بھی مستقل بنیادوں پر ہوتا کہ امت کے نوجوان حالات حاضرہ سے باخبر رہیں اور امت کے زور بازو کا کردار ادا کر سکیں۔

انسانی ایجادات نے حالات و معاملات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایجادات نعمت ہے۔ اگر اس نعمت کا صحیح استعمال اس فرد یا ملت کیلئے خیر ہو جاتا ہے۔ اور غلط استعمال اس کیلئے شر بن جاتا ہے۔ یہ اس انسان کی سیرت واخلاق پر منحصر ہے کہ ان بے جان چیزوں کے ذریعے جانداروں (انسانوں) کی فلاح و بہبود کا کام کر کے اسے انسانیت کی اعلیٰ دہلیز پر پہنچاتا ہے یا اس کے ذریعے فساد پھیلا کر اسے حیوانیت کے درجے میں جا گراتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریشِ مکہ کو دعوت اسلام دینے اور ان تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جو مروج تھا۔ اس زمانے میں عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی آدمی کو اپنے قصبے اور شہر کے لوگوں کو کسی اہم بات سے مطلع کرنا ہوتا مثلاً کسی حملہ آور لشکر سے متعلق بتانا ہوتا تھا تو وہ کسی اونچی جگہ پہاڑی وغیرہ پر چڑھ کر اہلِ قصبہ اور اہلِ شہر کو آواز لگاتا تھا، نیز اگر کوئی حادثاتی معاملہ ہوتا مثلاً دشمن حملے کے لئے سر پر آ چکا ہوتا تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر اور چیخ چیخ کر "یا صباحاہ" کہہ کر بلاتا تھا تا کہ لوگ جلد سے جلد اس کے پاس پہنچ کر اس کی بات سنیں اور اپنے تحفظ اور دفاع کے لئے فوری طور پر کمر بستہ ہو جائیں، چنانچہ اس مروج طریقہ ء ابلاغ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بالفاظ دیگر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ذرائع ابلاغ میں سے ایک معروف ذریعے کو اختیار کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی دعوت رکھی اسی طرح صلح حدیبیہ کے بعد بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت دینے کا مرحلہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس زمانے کے مروج طریقہء ابلاغ کے مطابق انہیں خطوط بھیجے، نیز مشرکین اور یہود آپ اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے اور اشعار کی صورت میں ہجو کرتے تو حضرت حسان بن ثابتؓ اور دیگر شعراء صحابہ اشعار کی صورت میں ان کا جواب دیتے تھے۔ یعنی زبانی طور پر نظم کی صورت میں یا قلم کے ذریعے، جس طرح بھی ہو سکا دعوت دی گئی۔(۶۵) دعوت میں جدید وسائل و ذرائع کے استعمال سے متعلق ایک حدیث ہے:

حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہود کا رسم الخط سیکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ''مجھے یہود کی کسی تحریر پر اعتماد نہیں ہے۔

لہٰذا ان کی زبان بھی سیکھو اور رسم الخط بھی۔

حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ صرف پندرہ دن میں میں نے انکا رسم الخط سیکھ لیا۔ اس کے بعد یہود کو آپ ﷺ جو کچھ فرماتے لکھتا، اور جب یہودیوں کا کوئی خط آپ ﷺ کے پاس آتا تو میں ان کا خط آپ ﷺ کو پڑھ کے سناتا''۔(۲۶)

لہٰذا ایک اسلامی انقلابی دعوت کے لئے عصری تقاضوں کے مطابق ذرائع ابلاغ کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ پر مکمل کنٹرول اسلام دشمن، سیکولر طاقتوں کا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں، جب چاہتے ہیں اور جیسے چاہتے ہیں دنیا کو اپنا پیغام پہنچاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ذرائع ابلاغ کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے اس کے قیام و اہتمام میں اپنا حصہ شامل کیا جائے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اور اسلامی ممالک میں ملکی سطح پر بھی مستحکم نیٹ ورک ہو جہاں سے تصدیق شدہ خبروں کے علاوہ اسلامی تعلیمات و قوانین کا پرچار بھی ہو۔

یہ تمام کام استحکام امت کے لیے پیش خیمہ بنے گا اور استحکام امت ہی سے عروج امت کی طرف پیش قدمی جاری و ساری رکھنے میں مدد ملتی رہے گی اور امت مسلمہ اپنے مقصد عظمیٰ کو پالے گی، جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔

وعداللہ الذین امنوا منکم وعملوا اصلحت لیستخلفنھم
فی الارض کمااستخلف الذین من قبلھم (۲۷)

ترجمہ: "اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اس طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔"

حواشی وحوالہ جات (باب ششم)

(۱) اقبال، محمد، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص:۴۱

(۲) ندوی، ابوالحسن علی، سید: "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص:۳۲۹

(۳) آتش، خواجہ حیدر علی: "کلیات آتش" مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۴۰۲

(۴) اقبال، علامہ: "کلیات اقبال "نویدائے شیخ، لاہور، ص: ۱۸۰

(۵) چیمہ، غلام رسول: "اسلام کا سیاسی نظام" علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء ص:۵۰۷ -۵۰۶

(۶) القرآن (۳:۱۱۰)

(۷) بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل: "صحیح بخاری" نور محمد کارخانہ کتب، کراچی، ۱۹۶۱ء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل

(۸) غامدی، جاوید احمد: "برہان" دارالاشراق، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص: ۲۶۰-۲۵۹

(۹) رضوی، واجد سید: "زوال ملت اور نشاۃ ثانیہ" مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۱۴۷-۱۴۶

(۱۰) ایضاً (محولہ بالا)، ص:۱۴۸

(۱۱) القرآن (۳:۱۰۴)

(۱۲) الخطیب العمری، امام ولی الدین محمد بن عبداللہ: "مشکوٰۃ شریف"، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ج:۲، باب الامر بالمعروف

(۱۳) ایضاً (محولہ بالا)

(۱۴) القرآن (۱۶:۱۲۵)

(۱۵) الخطیب العمری، امام ولی الدین محمد بن عبداللہ: "مشکوٰۃ شریف"، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ج:۱، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ

(۱۶) اقبال، محمد، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۳۰

(۱۷) غلام مرتضی، ملک، ڈاکٹر: "قرآن آسان" مرتضی ایجوکیشنل ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۶

(۱۸) ابن ابی شیبہ، ابوبکر عبداللہ: "مصنف ابن ابی شیبہ" مکتبہ الرشد، الریاض، ۱۴۰۹ھ، باب التمسک بالقرآن

(۱۹) القشیری، مسلم بن حجاج: "صحیح مسلم" نور محمد کارخانہ کتب، کراچی، ۱۹۶۱ء، باب فضل من یقوم بالقرآن و یعلمہ

(۲۰) ایازی، محمد علی، سید: "تفہیم القرآن ایک عصری اور عمرآنی تفسیر" ماہنامہ ترجمان القرآن، اشاعت خاص، لاہور، مدیر پروفیسر خورشید احمد، ج:۱۳۱، مئی ۲۰۰۴ء ص: ۲۸۹ - ۲۸۸

(۲۱) ترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسیٰ: "ترمذی شریف" مکتبہ رحمانیہ، لاہور، باب التفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ و من سورۃ التوبۃ

(۲۲) آزاد، ابوالکلام، مولانا: "ترجمان القرآن" مکتبہ مصطفائی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ج:۲، ص: ۱۲۵-۱۲۴

(۲۳) سواتی، عبدالحمید: "معالم العرفان فی دروس القرآن" مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ، ۲۰۰۹ء، ج:۹، ص: ۲۳۴

(۲۴) اقبال، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۴۸

(۲۵) اصلاحی، صدرالدین: "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ از افادات حضرت شاہ ولی اللہؒ"، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۶۷-۱۶۶

(۲۶) دہلوی، شاہ ولی اللہ، مترجم عبدالحق: "حجۃ اللہ البالغہ" دارالاشاعت، کراچی، ص: ۲۳۴

(۲۷) محمد شفیع، مفتی: "معارف القرآن" ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۸۷ء، ج:۷، ص: ۱۱۷

(۲۸) اصلاحی، صدرالدین: "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ از افادات حضرت شاہ ولی اللہؒ"، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۷۲-۱۷۱

(۲۹) القرآن (۴:۵۹)

(۳۰) البخاری، ابوعبداللہ محمد: "صحیح بخاری" نور محمد کارخانہ کتب، کراچی، ۱۹۶۱ء، باب الماۤءِ علی البول فی المسجد

(۳۱) وارثی، خورشید علی: "روح اتحاد امہ" وارثی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص: ۸۸

(۳۲) محمد شفیع، مفتی: "معارف القرآن" ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۸۷ء، ج: ا، ص: ۱۳۳

(۳۳) اقبال، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۲۶

(۳۴) القرآن (۳۹:۹)

(۳۵) اسرار احمد، ڈاکٹر: "عالمی خلافت کی نوید" شعبہ نشر و اشاعت تنظیم اسلامی، لاہور، ص: ۶۸

(۳۶) القرآن (۲۸:۷۷)

(۳۷) اقبال، محمد، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۷۸

(۳۸) صحافی، ابومسلم: "عصر حاضر اور اسلام" ادبستان، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص: ۱۷۲-۱۷۰

(۳۹) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۷۳

(۴۰) القرضاوی، یوسف ڈاکٹر: "اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۵۴-۳۵۲

(۴۱) اقبال، محمد، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۱۶

(۴۲) صحافی، ابومسلم: "عصر حاضر اور اسلام" ادبستان، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص: ۱۷۴-۱۷۳

(۴۳) القرضاوی، یوسف ڈاکٹر: "اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم" الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۵۵

(۴۴) اقبال، محمد، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۲۵

(۴۵) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث: "سنن ابی داؤد" مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۹۵۲ء، باب فی القوم یسافرون یومرون احدھم

(۴۶) احسان حقی، ڈاکٹر: "مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ" دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۱-۱۰

(۴۷) ایضاً (محولہ بالا)، ص: ۱۷-۱۵

(۴۸) محمد اسد، علامہ: "ملت اسلامیہ دوراہے پر" دارالسلام، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۸۱

(۴۹) اقبال، محمد، علامہ: "کلیات اقبال" نویدائے شیخ، لاہور، ص: ۳۰۸

(۵۰) القرآن (۳:۱۱۹)

(۵۱) حقی حق، ڈاکٹر: "ہوئے تم دوست جس کے" شفیق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۰۶

(۵۲) اقبال، محمد، علامہ: "ارمغان حجاز" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۲۶

(۵۳) القرآن (۳:۱۳۹-۱۴۰)

(۵۴) القرآن (۳:۱۷۳)

(۵۵) مودودی، ابوالاعلیٰ سید: "شہادت حق" اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۹-۱۸

(۵۶) ندوی، ابوالحسن علی، سید: "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص: ۳۲۳

(۵۷) اقبال، محمد، علامہ: "کلیات اقبال" نویدائے شیخ، لاہور، ص: ۳۰۸

(۵۸) القرآن (۲۹:۶۹)

(۵۹) ندوی، ابوالحسن علی، سید: "اسلامی بیداری" دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۶

(۶۰) طحان، مصطفیٰ محمد: "معتدل اسلامی فکر" مکتبہ المصباح، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۴۶۹

(۶۱) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید: "قوموں کے عروج وزوال پر علمی تحقیقات کے اثرات" ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۶۲

(۶۲) محمد رفیع الدین (مرحوم)، ڈاکٹر: "اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار"، البلاغ فاؤنڈیشن، لاہور ۲۰۰۳ء، ص:۶

(۶۳) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید: "قوموں کے عروج و زوال پر علمی تحقیقات کے اثرات" ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۶۵-۶۴

(۶۴) خان، محمد عطاء اللہ، ڈاکٹر: "ملت اسلامیہ کا جدید تصور اور لسانی روابط کے امکانات" ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، مدیر محمد اسلام نشتر، شمارہ: ۱۰، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص:۳

(۶۵) محمد زاہد اقبال، مولانا: "عصر حاضر میں غلبہ دین کا نبوی طریقہ کار" ادارہ نشریات محمود حسن، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۷۵

(۶۶) ندوی، جلیل احسن: "زادراہ" اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۷۶

(۶۷) القرآن (۵۵:۲۴)

خلاصہء بحث

بلا شبہ تمام تعریفیں اور شکر اللہ رب العزت کے لیے ہے جس کی بے پناہ عنایات اور فضل خاصہ سے میں اپنے اس تحقیقی مقالہ کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔ **و ما توفیقی الا باللہ۔** میں نے یہ مقالہ ایک ایسے عنوان پر لکھا ہے جس میں امت مسلمہ کی تاریخ کے دو اہم ادوار کا ذکر ہے۔ ایک دور امت مسلمہ کے عروج اور دوسرا دور امت مسلمہ کے زوال کا ہے۔ جس سے آج بھی ہم گزر رہے ہیں۔ دراصل تاریخ قوموں کے عروج وزوال کا ایک عبرتناک مرقع ہے۔ کسی قوم پر پستی وگمنامی کا طوق پڑا ہوا تھا کہ اچانک وہ قوم ابھرنا شروع ہوتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک مستحکم قوم بن کر فتح وغلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور دوسری قومیں نہ صرف اس کی طاقت کا لوہا ماننے لگتی ہیں بلکہ اس کے تہذیبی ولسانی اثرات کو بھی قبول کرنے لگتی ہیں۔ اور دوسری قوم اس کے مد مقابل آنے سے بھی گھبراتی ہے۔ یہ حالت ایک عرصے تک رہتی ہے۔ پھر ایک دور آتا ہے کہ وہی قوم زوال سے دو چار ہونے لگتی ہے، طاقت خاک میں ملتی نظر آتی ہے اور بلندی سے پستی کی طرف سرکنے لگتی ہے۔ اس کی شان وشوکت، شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہے، اس کی دھاک دلوں سے اٹھنے لگتی ہے یعنی اس کی ہوا اکھڑ جاتی ہے اور ایک دور وہ آتا ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے یہی تماشا ہو رہا ہے۔ بڑی بڑی طاقتیں جن کے یہاں سورج غروب نہیں ہوتا تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے بے طاقت ہو کر غروب ہو گئیں ہیں۔ اور جن کا دعویٰ تھا کہ وہ جہاں چلے جائیں وہاں سے واپس نہیں آتے، آج کہیں جانے کے قابل نہیں ہیں۔ روم، جرمنی، جاپان، اٹلی، فرانس، برطانیہ اور روس وغیرہ کی تباہی وبیچارگی یہ بالکل حال ہی کے واقعات ہیں۔ اور ہمارے سامنے ہیں۔ مسلم امہ اس سلسلے کی ایک عبرتناک ترین مثال ہے۔ امت مسلمہ ایک ہزار سال تک دنیا کی نظری، فکری وسیاسی قیادت کرتے اور عروج وکامیابی کے بلند مقام پر پہنچنے کے بعد آج انتہائی پستی، ذلت ونکبت اور روز افزوں انحطاط کا شکار ہے۔ جس قوم کی کل تک دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، جس کا لوہا مانا جاتا تھا آج وہ ترساں ولرزاں ہے۔

کل تک جس قوم کی تمام عالم میں ساکھ تھی آج اس کی ہوا اکھڑ چکی ہے۔ اور یہاں عروج کے انہی دوادوار کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ کہ وہ کون سے سنہرے اصول تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے آدھی دنیا سے زائد حصوں پر حکمرانی کی۔ یقینی بات ہے کہ کوئی عمارت بغیر مستحکم بنیاد کے قائم و دائم نہیں رہ سکتی۔ وہ مسلم امہ جس کی بنیاد خود رسول اللہ ﷺ نے وحی الٰہی کی روشنی میں اپنی مبارک جدو جہد سے مستحکم کی تھی۔ یہ آپ ﷺ کی دعوت و تربیت کے نتیجے میں تیار ہونے والی امت تھی جس نے دنیا کی قیادت و امامت کی اور پوری دنیا میں یہ ثابت کر دیا کہ اگر کوئی تہذیب و تمدن ہے، کوئی علم و تحقیق ہے اور کوئی عدل و انصاف ہے تو وہ امت مسلمہ کے پاس ہے۔ پھر کس طرح اس خیر امت میں انحطاط و زوال کا آغاز ہوا اور اس کو نہ صرف دنیا کی امامت و قیادت سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ مظلومیت و غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔

گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے مفکرین، ہمارے زوال پر کلام کرتے رہے جس سے کم از کم یہ احساس تو اجاگر رہا کہ تاریخ اب ہماری مٹھی میں نہیں ہے اور ہم صف اول سے ہٹا دیئے گئے ہیں۔ اس زوال کی نشاندہی کے حوالے سے مسلم مفکر راشد شاذ ادراکِ زوالِ امت میں لکھتے ہیں: "بغداد اور غرناطہ کے بعد اب تک اسباب زوال پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اتنا کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اہل دانش رأس المسئلہ سے اپنا دامن کیوں بچاتے رہے۔" یہ حقیقت ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اپنی کوتاہیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی تمام تر ناقدانہ صلاحیتیں دوسری اقوام کی تنقید پر صرف کرنے لگتی ہے۔ وحی ء الٰہی میں اس سنت الٰہی کو جو قوموں کے عروج و زوال کے حوالے سے کائنات میں کارفرما ہیں، متعدد مقامات پر بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَکُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ (۸:۵۳-۵۴)

ترجمہ: "یہ اللہ کی سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ آلِ فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطے کے

مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش
میں انہیں ہلاک کیا اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔"

لہٰذا سنت الٰہی یہی ہے کہ جب خیر کو چھوڑ کر شر، انصاف کو چھوڑ کر ظلم، بناؤ کے بجائے بگاڑ اور ہدایت کے بدلے میں گمراہی اختیار کرنے لگتے ہیں تو ان کی طاقت، عزت، خوشحالی، سربلندی اور جاہ وحشمت کو خاک میں ملا دیا جاتا ہے۔ امت مسلمہ کی تشکیل نو ۶۱۰ء میں نبی ﷺ نے اپنی دعوت سے کیا۔ ۶۳۲ء میں آپ ﷺ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک پیغام پہنچا کر اور **فلیبلغ الشاهد الغائب** فرما کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ لاکھوں درود وسلام رہبر اعظم ﷺ پر اس کے بعد خلفائے راشدین پیغام کو پہنچانے اور دنیا کو اس اسلامی انقلاب سے ہمکنار کرنے نکلے۔ اور انہوں ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران وعراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے کو اسلام کے نور سے روشن کر دیا۔ اس کے بعد بنوامیہ کے دور میں فتوحات اسلامیہ کے سیلاب نے مزید آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں مشرق میں سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ، اسپین اور مغربی یورپ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور عالم اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے۔ جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالم اسلام کی قیادت بنوامیہ اور بنوعباس کے پاس رہیں۔ لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنی قدر کھو رہے ہیں۔ گیارہویں صدی میں بنوامیہ کے بعد عالم اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلب اسلام کی طرف کھچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ یعنی کرد اور ترکان سلجوقی جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اسلام کو تقویت بخشی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں امت مسلمہ مغرب کے صلیبیوں سے نبرد آزما ہوئی اور اس کے بعد فتنہ تاتار نے مسلمانوں کو تہہ تیغ کر کے رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی، مگر قدرت کے قوانین ومنشا الگ ہیں، اس پر کسی کو دسترس حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ وہی جن کے ہاتھوں عالم اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی پاسبان اسلام بن گئے۔ اور پھر ترکان تیموری کے ہاتھوں ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد ڈلی۔ اور دوسری طرف ترکان عثمانی نے مسلم مملکت کو اٹلی وشمالی افریقہ تک پھیلا کر عالم اسلام کی عظمت کو دوبارہ عروج پر پہنچایا۔ ادھر سلطنت عثمانیہ مستحکم ہوئی اور مغرب میں دولت ہسپانیہ پندرہویں صدی عیسوی میں یورپی استعمار کے ہاتھوں زمیں بوس ہوئی۔ سقوط غرناطہ کے بعد یورپ نے نیا بحری راستہ تلاش کر کے عالم اسلام کے ممالک انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان کو زیرنگیں کرنے

کے حربے استعمال کرتے رہے اور دوسری طرف دولت عثمانیہ نے بھی "مرد بیمار" کی حیثیت اختیار کر لی۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر عظیم دولت عثمانیہ گھٹ کر اشیائے کوچک میں سمٹ چکی تھی۔ اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب تقسیم در تقسیم ہو کر یورپ کے زیر نگیں اور محکومی میں جا چکا تھا۔ اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں ترکی سے خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اسباب زوال امت:

جب مسلمانوں نے بھی ان احکام وقوانین سے روگردانی کرنی شروع کی جس کی بنیاد پر سنت الٰہی کے مطابق کوئی قوم معزول کر دی جاتی ہے، اور جب مسلمان اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ ان کی ترقی کی بنیاد ایمانی، اخلاقی اور عملی خصوصیات کی بناء پر ہے، وہ اس سے صرف نظر کرتے ہوئے مادی ساز وسامان ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے، دولت واقتدار کے حریص ہو گئے، لہو ولعب اور عیش کوشی کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی اخلاقی صفات کھوتے چلے گئے اور ان کے قدم جو ان صفات کی وجہ سے آگے کی جانب بڑھ رہے تھے پیچھے ہٹنے لگے۔ شروع شروع میں یہ اخلاقی وعملی تنزل سست رفتاری کے ساتھ ہوا تھا۔ مگر انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہ کی اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ اخلاقی وعملی تنزل کے باوجود وہ محض مادی ذرائع ووسائل کے بل بوتے پر ارتقاء کرتے رہیں گے اس چیز نے ان کو ایمانی واخلاقی تنزل کی طرف سے غافل کر دیا اور ان کے انحطاط کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ پھر ملوکیت کے پنجے اور گہرے ہوئے تو تخت وتاج کا حصول ہی نصب العین بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان آپس میں دست و گریباں ہونے لگے، ذرا ذرا سی مادی فائدوں کے لیے آپس میں تلوار چلنے لگی حتیٰ کہ بڑے بڑے جرنیل موت کے گھاٹ صرف اس لیے اتار دیئے گئے کہ خلیفہ کو اس کی بلا خیز حکمت وطاقت سے اپنی تخت خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ اس طرح سے مسلمانوں کی قوت کمزور اور منتشر ہو کر رہ گئی۔ پھر دیگر اقوام ان پر ٹوٹ پڑی جیسے بھوکے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پھر کسی جگہ ان کا قتل عام ہوا، کہیں ان کو حکومت واقتدار سے محروم کیا گیا اور جہاں ان کی حکومتیں باقی رہیں وہاں غالب قوموں نے انہیں اپنے اشاروں پر نچایا، اپنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنایا اور انہیں ایک دوسرے سے نبرد آزما کرا کے مسلمانوں کے ہاتھ مسلمانوں کی طاقت کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا۔

اس دنیا میں قوموں کی حیات وممات اور عروج وزوال کے سلسلہ میں قدرت کا اہم قانون "انفع واصلح" کا ہے یعنی جو خلق خدا کے لیے نافع ہو، جس سے انسانوں کو خیر وبھلائی حاصل ہوتی ہو۔

مگر امت مسلمہ نے اپنے پیغام شرف کو چھوڑ کر اس راستے کو اختیار کیا جو "مغضوب" ہوئے تھے پھر قدرت کا فیصلہ تو تبدیل ہونے والا نہ تھا۔

فلن تجد لسنت الله تبديلا ٥(٣٥:٤٣)

مسلمانوں کی علمی و مادی ترقیاں:

مسلم امہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کی ابتدائی چھ سات صدیوں کا دور دو لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ایک یہ کہ یہ دور اسلام کے وسیع پھیلاؤ کا دور ہے، جو عرب سے ہوتا ہوا ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے کو اسلام کی روشنی سے منور کر گیا۔ دوسرے لحاظ سے اس دور میں اسلام جہاں جہاں پہنچا وہاں ترقیوں کے دروازے کھل گئے۔ پہلے علمی ترقی کا آغاز ہوا اس کے بعد مادی ترقیاں اپنے عروج کو پہنچی۔دنیا کے یہ مسلم علاقے اپنے علوم وفنون اور ترقیاتی سرگرمیوں میں دوسرے علاقوں سے اس قدر ممتاز و منفرد ہو گئے کہ اسلام اور ترقی لازم و ملزوم سمجھی جانے لگیں۔

اسلام کا آغاز قرآن کی پاک کی پہلی وحی کے الفاظ ''اقراء'' کر کے علم ہی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور حضورﷺ کا وحی کو کتابت کروانے کا کام، دراصل یہ آغاز تھا علمی کام کا، پھر مسجد نبوی میں اصحاب صفہ کے لئے انتظام، بدر کے قیدیوں سے فدیہ کے طور پر مسلم بچوں کو تعلیم دینے سے لیکر جو صحابہ کرامؓ نے اجتہادی فیصلے کئے، مرتب کئے گئے۔پہلی دوسری ہجری میں احادیث کو جمع کرنے فقہی قوانین و مجموعے مرتب ہوئے۔اسکے بعد جب قرآن کی فہم کا معاملہ آیا تو قرآن کی تفسیریں لکھی جانے لگیں، کاتبان قرآن، مرتبین حدیث اور فقہاء کے بعد مفسرین کا یہ گروہ جس نے فہم قرآن کو عام کیا، یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔مسلمانوں نے اسماء الرجال کا فن ایجاد کر کے احادیث مبارکہ کو جانچنے اور پرکھنے کا اہتمام کیا اور دنیا کی ترقی کے باوجود آج تک مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور اس فن میں اپنا حصہ نہ ڈال سکا۔

اسی طرح مسلمانوں میں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی نے بہترین سیرت نگار اور موٴرخ پیدا کئے۔علمی کاموں میں حسن پیدا کرنے کا جذبہ جب پروان چڑھا تو خطاطی وخوش نویسی کے ذوق کو مسلمانوں نے پروان چڑھاتے ہوئے کئی قسم کے خطوط ایجاد کئے اور عبارت پر اعراب لگانے کا مرحلہ بھی طے کیا گیا، پھر یونانی فکر کے سدباب کے لئے علم الکلام کی بنیاد ڈالی اور ان فتنوں کا قلع قمع کیا گیا جو یونانی فلسفہ نے پیدا کئے تھے۔

مسلمانوں نے ان علوم کے علاوہ سائنسی علوم میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی اور اپنی تحقیق کی بنیاد تجربہ پر رکھ کر یونانی طریقہ عقل وقیاس کو رد کیا۔ مسلمانوں نے بیرون ملک تجارتی وتبلیغی اسفار کی بناء پر جغرافیہ اور فلکیات میں دلچسپی لیکر سمت معلوم کرنے کے طریقے دریافت کئے اور مختلف مقامات کا طول و بلد اور عرض بلد معلوم کیا۔ مسلمان سائنسدانوں کے سائنسی ایجادات وانکشافات کی یوں تو ایک لمبی فہرست ہے مگر مختصراً انہوں نے طب، کیمیا، روشنی، نظر، کسوف، بادوباراں، حیوانات، نباتات اور اشیاء کے خواص پر متعدد کتابیں لکھیں، بارود اور تیزاب ایجاد کیا، زمین کے محیط وقطر کی پیمائش کی، کاغذ کو ترقی دی، شیشہ گری میں مہارت حاصل کی اور دوربین بھی انہی کی ایجاد کردہ ہے۔

تاریک یورپ کا روشنی کی طرف میلان:

جس دور میں مسلمان علمی ومادی ترقی کی طرف روز افزوں گامزن تھے، یورپ اس زمانے میں جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کلیسائیت کے ہاتھوں اشاعت علم کو پابند سلاسل کردینے کے نتیجے میں یورپ کا یہ عہد تاریک جو (Dark age) کے طور پر جانا جاتا ہے چند عرصوں پر نہیں بلکہ پانچویں صدی عیسوی میں روم کے زوال اور عیسائیت کے عروج کے ساتھ شروع ہوا اور بارہویں صدی عیسوی تک، آٹھ سو برس تک جاری رہا۔ دوسری طرف اسی دور میں مسلمان علم وتحقیق میں مصروف تھے۔ کتابیں لکھنے، تجربے کرنے، مدرسے اور یونیورسٹیاں بنانے، کتب خانے قائم کرنے، رصد گاہیں نصب کرنے کا سلسلہ بلاد اسلامیہ میں بغداد سے لیکر ہسپانیہ تک جاری وساری تھا۔ روشنیءعلم کی کرنیں عیسائی یورپ کو خیرہ کرنے لگیں جب قرطبہ وغرناطہ وغیرہ میں مسلمانوں کے علم کا سورج اپنے پورے آب وتاب سے چمک رہا تھا لہٰذا اسپین کے اطراف اور فرانس، انگلستان، اٹلی اور سسلی وغیرہ سے شائق طلبہ حصول علم کے لئے اسپین آنے لگے اور پھر مختلف علوم طب، فلکیات، طبعیات، ریاضیات اور عمرانیات وغیرہ حاصل کئے اور جو اسپین نہ آسکے انہوں نے مسلم حکماء وعلماء کی کتابوں سے استفادہ کرکے علمی استعداد جمع کی۔ سائنس کا باوا آدم راجہ بیکن بھی انہی اسپین کے طلباء میں سے تھا اور مسلمانوں کے علوم نے ہی روسو، برونو، کیپلر، کوپرنیکس اور نیوٹن وغیرہ پیدا کئے۔ مسلمانوں سے علم کے حصول کے نتیجے میں یورپ کے طلباء جو استفادہ کرچکے تھے وہ مسلمان حکماء کی کتابوں کی اہمیت جان چکے تھے پھر انہوں نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ تمام طلباء کا اسپین آنا ناممکن ہے، ان علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے دارالترجمے کا قیام واہتمام اور اس کے بعد یونیورسٹیاں قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

مسلمانوں کے علوم یورپی زبانوں میں منتقل کرنے اور انکی اشاعت کا کام وقت ضائع کئے بغیر جس عزم واستقلال کے ساتھ انہوں نے انجام دیا، قابل تعریف ہے۔اس محنت شاقہ نے انہیں صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کرادی اور بالآخر یورپ آٹھ سو سالہ طویل دور تاریکی سے نکل کر نشاۃ ثانیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔دوسری طرف مسلمان آہستہ آہستہ اپنے علوم سے بے بہرہ ہوتے گئے اور خواب غفلت کا شکار ہو گئے۔اور برس تو دور کی بات ہے مسلمانوں نے صدیاں ضائع کیں۔

ایک وقت تھا کہ جب ہارون الرشید نے شارلیمن شاہ فرانس کو گھڑی بھیجی تھی تو اس نے گھڑی کی سوئیوں کی حرکت کو سحر وجادو کا کرشمہ سمجھا تھا اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ترکی جو عالم اسلام کا قائد تھا، نئی ایجادات ترقیوں سے اس قدر لاعلم تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ فضا میں اڑتے دیکھا تو حیران ہوتے ہوئے اسے سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھا۔اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ان ملکوں میں ترقی نہیں کرسکی تھیں۔ابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب" انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" میں لکھتے ہیں کہ" ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی (volney) جس نے اٹھارہویں صدی میں مصر کی سیر کی ہے اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ" یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہے کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہوجائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا"

مسلمانوں کا تنزل صرف علم وحکمت اور صنعت وحرفت میں نہ تھا بلکہ فنون حرب وآلات میں بھی تھا، جب دفاعی معاملات میں بھی کمزوری دکھائی گئی تو یورپ نے ان علوم پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ مسلم امہ اور مسلم علاقے یورپ کے قبضے میں چلے گئے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

عصر حاضر اور اعتراف حقیقت:

گذشتہ دو صدیوں میں تمام اسلامی دنیا نہ صرف سیاسی حیثیت سے مغرب کے ماتحت ہوگئی ہے۔بلکہ دینی وفکری استعداد سے عاری ہوکر ان کے فکر ونظر کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال لیا گیا ہے۔حکمت مغربی سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی کہ خلافت کی مرکزیت ختم ہوکر وطنیت کا باطل نظریہ عام ہوگیا اور اسلامی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے۔انکی نقالی میں مسلمان اتنے آگے بڑھے کہ علامہ اقبالؒ کے ارشاد کے مطابق **"وضع میں ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود"** کی مثال بن گئے ہیں۔

مسلمانوں نے اپنی حیثیت کوانکی تہذیب وتمدن میں گم کر کے رکھدیا ہے۔ مسلمان اگر اپنی عظمت رفتہ کی طرف نہیں پلٹ سکے ہیں تو اس کی ایک وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اس تہذیب کو اپنا لیا ہے جو آپ ہی اپنے خنجروں سے خودکشی کر رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ نے مادی لحاظ سے دنیا کو ترقی دی لیکن اخلاقی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے جسم انسانیت پر اتنے کچوکے لگائے ہیں کہ

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

''پورا جسم زخموں سے چور چور ہے (مرہم کا) پھاہا کہاں کہاں رکھوں''

مغرب مختلف نظاموں کا تجربہ کر کے مسائل حیات انسانی کو حل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ نظر کو خیرہ کرتے والی تہذیب جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ثابت ہو چکی ہے۔ جس قوم کے کمالات کی حد برق و بخارات ہو ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کے پاس ابتداء سے حکمت الٰہی کا کوئی سرمایہ اور صحیح علم کا صاف وشفاف چشمہ نہ تھا، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا جو حصہ بھی انکو پہنچا تھا وہ تحریف وتاویل کی آمیزش کر کے گم کر دیا گیا تھا اور یونان وروما کی تہذیب کو بدل کے طور پر استعمال کر کے جاہلی یونان وروما کی ساری خرافات کو نئے پیرہن سے مسجع کر کے انسانیت کے گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔

خدفراموشی کے ساتھ ساتھ مادہ پرستی اور زر پرستی مذہب کے طور پر چھا گیا ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدریں ذاتی مفادات کے مقابلے میں دب کر رہ گئیں ہیں۔ انسان کی حیثیت وقدر کی کوئی اہمیت نہی رہی ہے اور طاقت وقیادت کے نشے میں انسانی مسائل کے حل کے لئے دہرا معیار اختیار روا رکھا گیا ہے۔ غرض کہ مغرب کو قیادت کی جو امانت سپرد ہوئی تھی اسکا وہ حق ادا نہ کر سکا۔ دراصل قوموں کی زندگی کا یہی وہ فیصلہ کن موڑ ہے جہاں سے اس کو معزول کر کے دوسری اہل قوم کو قیادت کی ذمہ داری منتقل کر دی جاتی ہے۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں:

اللہ رب العزت نے عالم اسلام کو روشن مستقبل کے لئے ضروری ذرائع ووسائل چاہے وہ مالی ہوں یا مادی مالا مال کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کے پاس وہ صاف وشفاف سرچشمہ ہدایت بھی موجود ہے جس کی تلاش میں آج کی دنیا سرگرداں ہے۔ متلاشی دنیا کو صراط مستقیم کے خطوط پر گامزن کرنے کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسانیت کو صراط مستقیم پر گامزن وہی قوم کر سکتی ہے جو اسکی حامل ہو۔

بلاشبہ امت مسلمہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ناامیدی ومایوسی کے حصار توڑ کر قیادت انسانی کا منصب سنبھال لیں۔

دراصل عمل کا زوال جب طول پکڑ لیتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ قوم اپنی اصل حیثیت بھلا کر خود ناشناسی کی تاریکی میں گھر جاتی ہے۔ بعینہ امت مسلمہ کے ساتھ یہی ہوا۔ حالانکہ **ولا تحزنوا** اور **لا تخف** کا وعدہ آج بھی اسی طرح برقرار ہے، پس عزم وہمت کی ضرورت ہے۔

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

آج بھی دنیا کو مطلوب معاشرتی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی نظام کوئی قوم فراہم کرسکتی ہے تو وہ امت مسلمہ ہے۔ الحمدللہ! مساعی بیداری امت کے نتیجے میں آج امت مسلمہ کے اندر بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے اور یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا (انشاءاللہ)۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ اپنی اس لہر کا روشر سے خیر، گمراہی سے ہدایت، بگاڑ سے بناؤ، متزلزل سے استقامت، رذائل اخلاق سے حسن اخلاق کی طرف رواں رکھے تو پھر وہ وقت دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلم امہ کی بدحالی کو خوش حالی، کمزوری کو طاقت، خوف کو امن اور پستی وذلت کو عروج وبلندی سے بدل دے۔ کیونکہ اللہ رب العالمین کی سنت یہی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ وامَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا وَمَابِاَنْفُسِھِمْ ٥

''بلاشبہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی''۔

امت مسلمہ امید کامل کے ساتھ اپنے نصب العین ومقصد زندگی متعین کرلے اور اپنے اندر قیادت کی خلا کو پر کرلے تو وہ وقت زیادہ دور نہیں جب قیادت انسانی کے منصب پر دوبارہ فائز کردیا جائے۔

آخر میں اس مقالے کو سمیٹتے ہوئے یہی عرض کرنا ہے کہ امت مسلمہ کا عروج وزوال بھی دیگر قوموں کی طرح سنت الٰہی کے مطابق ہوا ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کے بعد **مغضوب علیھم** اور **الضالین** سے دوستی اور ان کی راہوں پر چلنا سراسر ظلم و ناانصافی تھا، جسکا نتیجہ وہی ہونا تھا جس سے آج امت مسلمہ دوچار ہے۔

فرمان الٰہی کے مطابق اگر امت اصلاح کو لازم کرلے تو

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (۲۱:۱۰۵) کا وعدہ موجود ہے۔ پس امت کی اصلاح کے لئے ہر فرد کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ امت مسلمہ عروج کی بلندی کو چھو سکے اور انسانیت کی فلاح دنیوی واخروی کا اہتمام ہو سکے۔ اس پوری بحث سے میں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ درج ذیل ہے۔

☆ امت مسلمہ کی بنیاد امام الانبیاء ﷺ نے اپنی تیئس سالہ دور نبوت میں مستحکم کر کے رخصت ہو گئے۔

☆ اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے نبی مہربان ﷺ کی تعلیمات کو امام بنا کر دنیا کی رہنمائی کی۔

☆ خلفائے راشدین کے بعد ملوکیت نے خلافت کی برکت اصلیہ سے محروم کر دیا۔ مسلم امہ جب تک شریعت کی پیروی کرتی رہی وہ فاتح علم وفن اور فاتح زمانہ رہی۔

☆ جب مسلمان مقصد امامت وقیادت سے صرف نظر کرنے لگے اور دنیاوی جاہ وجلال کو سب کچھ سمجھتے ہوئے اس کے حریص ہوئے تو فساد پھیلنا شروع ہوا پھر امت کو اس چمن کی قیادت ہٹا دیا گیا۔

☆ اس کے بعد جن کے ہاتھ قیادت وسیادت لگی اگر چہ انہوں نے مسلم امہ سے علم وفن سیکھے تھے مگر وہ ہدایت آسمانی سے بے بہرہ تھے لہذا وہ مادیت کے ترازو میں انسانیت کو تولنے لگے۔ اور اپنی طاقت کے زعم میں زبان قال و حال یہ کہہ رہے ہیں کہ **من ھواشد منا قوۃ**۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ایسی ہی صورت میں وہ قوم منصب قیادت سے ہٹا دی جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو اخلاق و کردار کے لحاظ سے بہتر ہو۔

☆عصر حاضر میں سسکتی انسانیت کی نظریں امت مسلمہ کی طرف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کے پاس سرچشمہ ہدایت اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور وہ احساس کو بیدار کرلے تو دنیا کی امامت کے ذریعے ایک بار پھر عالم انسانی میں بہار آسکتا ہے بقول جگر مرادآبادیؒ:

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ میرے اس مقالے کی حقیر کوشش کو قبول فرماتے ہوئے امت مسلمہ کی بحر کی موجوں میں وہ اضطراب پیدا کردے جو امت مسلمہ کے عروج کے لیے ضروری ہے۔ آمین

(ثم آمین)

وما علینا الا البلاغ المبین

کتابیات

نمبر شمار	مصنف	کتاب کا نام	پبلشرز	اشاعت	سن
۱۔	آتش، خواجہ حیدر علی	کلیات آتش	مقبول اکیڈمی	لاہور	۲۰۰۶ء
۲۔	آزاد، ابوالکلام	ترجمان القرآن	مکتبہ مصطفائی	لاہور	س ن
۳۔	آزاد، ابوالکلام	قرآن کا قانون عروج وزوال	مکتبہ جمال	لاہور	۲۰۰۷ء
۴۔	ابن خلدون، عبدالرحمٰن علامہ	تاریخ ابن خلدون	الفیصل ناشران وتاجران	لاہور	۲۰۰۴ء
۵۔	ابن خلدون، عبدالرحمٰن علامہ	مقدمہ ابن خلدون	الفیصل ناشران وتاجران	لاہور	۲۰۰۴ء
۶۔	ابن کثیر، عمادالدین، حافظ	تفسیر ابن کثیر	مکتبہ قدوسیہ ابوبکر قدوسی	لاہور	۱۹۹۴ء
۷۔	ابن ابی شیبہ، ابوبکر عبداللہ	مصنف ابن ابی شیبہ	مکتبہ الرشد	الریاض	۱۴۰۹ھ
۸۔	ابن ہشام، ابومحمد عبدالملک	سیرت ابن ہشام	ادارہ اسلامیات	لاہور	۱۹۹۴ء
۹۔	ابوداؤد، سلیمان بن اشعث	سنن ابی داؤد	مصطفیٰ البابی	مصر	۱۹۵۲ء
۱۰۔	احمد سجاد، ڈاکٹر	اسلام کا روشن مستقبل	ادارہ معارف اسلامی	لاہور	۱۹۹۲ء
۱۱۔	احسان حقی، ڈاکٹر	مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ	دعوۃ اکیڈمی	اسلام آباد	۱۹۹۸ء
۱۲۔	اسرار احمد، ڈاکٹر	امت مسلمہ کا عروج وزوال اور موجودہ احیائی مساعی کا جائزہ	تنظیم اسلامی	لاہور	۱۹۷۴ء

۱۳۔ اسرار احمد، ڈاکٹر — عالمی خلافت کی نوید — تنظیم اسلامی — لاہور — س ن

۱۴۔ اصلاحی، صدر الدین — اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ از افادات شاہ ولی اللہ — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۶۷ء

۱۵۔ افتخار حسین، آغا، ڈاکٹر — قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ — مجلس ترقی ادب — لاہور — ۱۹۷۹ء

۱۶۔ اقبال، محمد، علامہ — تشکیل جدید الٰهیات اسلامیہ — کریم احمد خان بزم اقبال — لاہور — ۱۹۵۸ء

۱۷۔ اقبال، محمد، علامہ — کلیات اقبال — نوید اے شیخ — لاہور — س ن

۱۸۔ اقبال، محمد علامہ — ارمغان حجاز — شیخ غلام علی اینڈ سنز — لاہور — ۱۹۵۵ء

۱۹۔ اقبال، محمد علامہ — جاوید نامہ — شیخ غلام علی اینڈ سنز — لاہور — ۱۹۵۵ء

۲۰۔ اکبر آبادی، سعید احمد، — مسلمانوں کا عروج وزوال — مکتبہ رشیدیہ — کراچی — ۱۹۴۷ء

۲۱۔ الازہری، پیر محمد کرم شاہ — ضیاء القرآن — ضیاء القرآن پبلی کیشنز — لاہور — س ن

۲۲۔ الخطیب العمری، امام ولی الدین محمد بن عبداللہ — مشکوۃ شریف — مکتبہ رحمانیہ — لاہور — س ن

۲۳۔ القشیری، مسلم بن حجاج — صحیح مسلم — قدیمی کتب خانہ — کراچی — ۱۹۵۶ء

۲۴۔ الحسینی، محمد زاہد — تذکرۃ المفسرین — دارالارشاد — اٹک — ۱۴۰۱ھ

۲۵۔ القرضاوی، یوسف، ڈاکٹر — اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم — الفیصل ناشران وتاجران — لاہور — ۲۰۰۴ء

۲۶۔ القرضاوی، یوسف، ڈاکٹر — غلبہ اسلام کی بشارتیں اور عملی تقاضے — منشورات — لاہور — ۲۰۰۴ء

۲۷۔ امیر علی، سید — تاریخ اسلام — محمد حنیف پرنٹرز — لاہور — س ن

۲۸۔	بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل	صحیح بخاری	نور محمد کارخانہ کتب	کراچی	۱۹۶۱ء
۲۹۔	برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر	اسلام اور عصر رواں	شیخ غلام علی اینڈ سنز	لاہور	۱۹۶۵ء
۳۰۔	بریلوی، لطافت	پی ایچ ڈی کیسے کریں	اسکالرز اکیڈمی	کراچی	۱۹۹۹ء
۳۱۔	بنگلوری، محمود	ٹیپو سلطان	گوشہء ادب	لاہور	۱۹۵۹ء
۳۲۔	بھٹو، محمد موسیٰ	اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیسے ہو	سندھ نیشنل اکیڈمی	حیدر آباد	۱۹۸۹ء
۳۳۔	پانی پتی، محمد ثناء اللہ	تفسیر مظہری	خزینہء علم وادب	لاہور	س ن
۳۴۔	پرویز	معراج انسانیت	ادارہ طلوع اسلام	لاہور	۱۹۶۸ء
۳۵۔	پرویز	اسباب زوال امت	ادارہ طلوع اسلام	لاہور	۱۹۷۰ء
۳۶۔	پکھتال، محمد مارمیڈیوک	تہذیب اسلامی	احسن برادرز	لاہور	۱۹۶۵ء
۳۷۔	تنزالوی، محمد سجاد، حافظ	اسلام کی معاشی تعلیمات	دعوۃ اکیڈمی	اسلام آباد	۱۹۹۳ء
۳۸۔	ترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسیٰ	ترمذی شریف	مکتبہ رحمانیہ	کراچی	س ن
۳۹۔	توکلی، نظام الدین	حضرت مجدد الف ثانی	سنگ میل پبلی کیشنز	لاہور	س ن
۴۰۔	تھانوی، اشرف علی	اصلاح انقلاب امت	ادارۃ المعارف	کراچی	۱۹۷۹ء
۴۱۔	ثروت صولت	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	اسلامک پبلیکیشنز	لاہور	۲۰۰۶ء
۴۲۔	جامعی، محمد نصیر، سید	سلمان سپہ سالار اور فاتح (حصہ دوم)	احسن برادرز	لاہور	۱۹۵۹ء
۴۳۔	جالندھری، حفیظ، ابوالاثر	شاہنامہ اسلام	حفیظ جالندھری ٹرسٹ	کراچی	۱۹۸۰ء
۴۴۔	جرمانوس، عبدالکریم، ڈاکٹر مترجم محمد سرور	مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب	ایچ وائی پرنٹرز	لاہور	۱۹۹۹ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	مقام	سال
۴۵۔	جعفری، رئیس احمد، سید	تاریخ اسلام (بارہ حصے)	اردو منزل	کراچی	۱۹۵۳ء
۴۶۔	جمیل احمد، خواجہ	دلاوران اسلام	اردو اکیڈمی	کراچی	۱۹۸۰ء
۴۷۔	جمعہ، محمد لطفی	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	مسعود پبلشنگ ہاؤس	کراچی	۱۹۶۴ء
۴۸۔	جمعہ، محمد بشیر	مؤثر اور کامیاب شخصیت	ٹائم منیجمنٹ کلب	کراچی	۲۰۰۶ء
۴۹۔	چراغ، محمد علی	انسائیکلو پیڈیا مسلم شخصیات	نذیر سنز	لاہور	۲۰۰۵ء
۵۰۔	چغتائی، محمد اکرام	جمال الدین افغانی اتحاد عالم اسلامی کا نقیب	سنگ میل پبلی کیشنز	لاہور	۲۰۰۵ء
۵۱۔	چیمہ، غلام رسول	اسلام کا سیاسی نظام	علم و عرفان پبلشرز	لاہور	۲۰۰۴ء
۵۲۔	حامدی، خلیل احمد	نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں	اسلامک پبلیکیشنز	لاہور	۱۹۶۳ء
۵۳۔	حفیظ الرحمن صدیقی، ڈاکٹر	مسلم نشاۃ ثانیہ	مطبوعات جاوید	کراچی	۱۹۸۹ء
۵۴۔	حقی حق، ڈاکٹر	ہوئے تم دوست جس کے	شفیق پبلیکیشنز	لاہور	۲۰۰۷ء
۵۵۔	حمید الدین، ڈاکٹر	تاریخ اسلام	فیروز سنز	لاہور	۱۹۶۴ء
۵۶۔	خان، غلام مصطفےٰ، ڈاکٹر	مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگذشت کابل	قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت	اسلام آباد	۱۹۸۰ء
۵۷۔	خورشید احمد، پروفیسر	امت مسلمہ کا مستقبل	مطبوعات جاوید	کراچی	۱۹۸۸ء
۵۸۔	خورشید احمد، پروفیسر	سود کی لعنت	منشورات	لاہور	۲۰۰۶ء
۵۹۔	درانی، عطش، ڈاکٹر	تناظرات اسلامی سائنس	فیروز سنز	لاہور	۱۹۹۴ء
۶۰۔	دہلوی، شاہ ولی اللہ مترجم عبدالحق دہلوی	حجۃ اللہ البالغہ	دارالاشاعت	کراچی	س ن
۶۱۔	راؤ، راما کرشنا	محمد (ﷺ)	منشورات	لاہور	۲۰۰۴ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	مقام	سن
۶۲۔	راشد شاز	اسلام مسلم ذہن کی تشکیل جدید	ملی پبلیکیشنز	دہلی	۲۰۰۸ء
۶۳۔	راشد شاز	مستقبل کی بازیافت	ملی پبلیکیشنز	دہلی	۲۰۰۵ء
۶۴۔	راشد ساز	ادراک زوال امت	ملی پبلیکیشنز	دہلی	۲۰۰۸ء
۶۵۔	رضوی، خورشید مصطفٰے	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	فیصل ناشران وتاجران	لاہور	۲۰۰۳ء
۶۶۔	رضوی، سید واجد	دانائے راز	مقبول اکیڈمی	لاہور	۲۰۰۵ء
۶۷۔	رضوی، سید واجد	زوال ملت اور نشاۃ ثانیہ	مقبول اکیڈمی	لاہور	۱۹۹۹ء
۶۸۔	زاہد ملک	مضامین قرآن حکیم	بن قطب انٹرنیشنل	اسلام آباد	س ن
۶۹۔	سلیمانی، احسان الحق	مسلمان یورپ میں	مقبول اکیڈمی	لاہور	۱۹۹۶ء
۷۰۔	سندھی، امام عبیداللہ	الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن	مکتبہ اوراق	لاہور	۲۰۰۵ء
۷۱۔	سندھی، امام عبیداللہ	خطبات ومقالات	دارالتحقیق والاشاعت	لاہور	۲۰۰۲ء
۷۲۔	سندھی، امام عبیداللہ	شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	سندھ ساگر اکادمی	لاہور	۱۹۴۵ء
۷۳۔	سواتی، صوفی عبدالحمید	معالم العرفان فی دروس القرآن	مکتبہ دروس القرآن	گوجرانوالہ	۲۰۰۹ء
۷۴۔	سیال، عمر حیات عاصم	آج کی اسلامی دنیا	یونائیٹڈ پبلشرز	کراچی	۱۹۹۱ء
۷۵۔	سید قطب شہید	جادہ ومنزل	اسلامک پبلی کیشنز	لاہور	۱۹۶۸ء
۷۶۔	شبلی نعمانی، علامہ	سیرت النبی ﷺ	آرمی بک کلب	پشاور	۱۹۷۹ء
۷۷۔	شریعتی، علی، ڈاکٹر مترجم سردار نقوی	فاطمہ فاطمہ است	ادارہ احیاء تراث اسلامی	کراچی	۱۹۹۳ء
۷۸۔	شریفی، ابراہیم، ڈاکٹر	تاریخ اسلام	مکتبہ الاسلام	کراچی	س ن

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	مقام	سن
۷۹۔	شکیب ارسلان، علامہ	اسباب زوال امت	دعوۃ اکیڈمی	اسلام آباد	۱۹۹۷ء
۸۰۔	شیرازی، عارف، سید	مسلمانوں کی غفلت وذلت کے اسباب اور بیداری ملت کے لیے ممکنہ عملی تدابیر	ظلال القرآن فاؤنڈیشن	راولپنڈی	۲۰۰۷ء
۸۱۔	صابری، عنصر	فتنہ یہود	تخلیق مرکز	لاہور	س ن
۸۲۔	صباح الدین، عبدالرحمٰن، مولانا	مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب	مجلس نشریات اسلام	کراچی	۱۹۹۴ء
۸۳۔	صحافی، ابومسلم	عصر حاضر اور اسلام	ادبستان	لاہور	۱۹۷۱ء
۸۴۔	صدیقی، ثناء الحق	زوال سلطنت مغلیہ	ادارہ دانش وحکمت	کراچی	۱۹۸۳ء
۸۵۔	طہٰ حسین، ڈاکٹر	ابن خلدون	دار الشعور	لاہور	۲۰۰۶ء
۸۶۔	طہٰ حسین، ڈاکٹر	اسلام منزل بہ منزل	شیخ غلام علی اینڈ سنز	لاہور	۱۹۶۳ء
۸۷۔	عباد اللہ، خواجہ	خلافت اسلامیہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ	لاہور	۱۹۵۱ء
۸۸۔	عبدالوحید خان، علامہ	مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان	دوست ایسوسی ایٹس	لاہور	۱۹۹۶ء
۸۹۔	عبدالسلام خورشید	سید احمد بریلوی	قومی کتب خانہ	لاہور	۱۹۵۲ء
۹۰۔	عتیق الرحمٰن، سید	عروج ملت اسلامیہ کا فیصلہ کن مرحلہ	عتیق الرحمٰن پبلشرز	کراچی	س ن
۹۱۔	علوی، سعید الرحمٰن، مولانا	اسلامی حکومت کا فلاحی تصور	مکتبہ جمال	لاہور	۲۰۰۳ء
۹۲۔	عمرپوری، عبدالغفار حسن	انتخاب حدیث	اسلامک پبلیکیشنز	لاہور	۲۰۰۶ء
۹۳۔	غامدی، جاوید احمد	برہان	دار الاشراق	لاہور	۲۰۰۱ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	مقام	سن
۹۴۔	غزالی، ابو حامد محمد	احیاء العلوم	مقبول اکیڈمی	لاہور	س ن
۹۵۔	غلام مرتضیٰ، ملک، ڈاکٹر	قرآن آسان	مرتضیٰ ایجوکیشنل ٹرسٹ	لاہور	۲۰۰۳ء
۹۶۔	غلام رسول چیمہ	اسلام کا سیاسی نظام	علم و عرفان پبلشرز	لاہور	۲۰۰۴ء
۹۷۔	فاروقی، برہان احمد، ڈاکٹر	قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل	علم و عرفان پبلشرز	لاہور	۱۹۹۹ء
۹۸۔	فرشتہ، محمد قاسم مترجم عبدالحیٔ خواجہ	تاریخ فرشتہ	شیخ غلام علی اینڈ سنز	لاہور	۱۹۶۴ء
۹۹۔	قاضی محمد ظریف	اقبال قرآن کی روشنی میں	کتاب منزل	لاہور	۱۹۵۸ء
۱۰۰۔	کلیفورڈ ای بوسورتھ مترجم یاسر جواد	اسلامی سلطنتیں	نگارشات	لاہور	۲۰۰۷ء
۱۰۱۔	کیرن آرم سٹرانگ	مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال	نگارشات	لاہور	۲۰۰۳ء
۱۰۲۔	گیلانی، اسعد، سید	امت مسلمہ سے خطاب	ادارہ ترجمان القرآن	لاہور	س ن
۱۰۳۔	گیلانی، اسعد، سید	رسول ﷺ کا معیار زندگی	منشورات	لاہور	س ن
۱۰۴۔	مالک، الامام	مؤطا امام مالک	مکتبہ رحمانیہ	لاہور	س ن
۱۰۵۔	ماجد حسین، پروفیسر	جغرافیہ عالم اسلام	ملٹی لائن بکس	لاہور	۲۰۰۲ء
۱۰۶۔	مبارک علی، ڈاکٹر	تاریخ کی آواز	فکشن ہاؤس	لاہور	۲۰۰۵ء
۱۰۷۔	محمد اسد، علامہ	ملت اسلامیہ دوراہے پر	دارالسلام	لاہور	س ن
۱۰۸۔	محمود حسن، سید	ترجمان الحدیث	اسلامک پبلیکیشنز	لاہور	۲۰۰۲ء
۱۰۹۔	محمد بدر عالم، مولانا	ترجمان السنہ	ایچ ایم سعید کمپنی	کراچی	س ن

۱۱۰۔	محمد افضل، میاں	اعلائے کلمۃ الحق کی روایت اسلام میں	الفیصل ناشران وتاجران	لاہور	۲۰۰۳ء
۱۱۱۔	محمد نوح، سید، ڈاکٹر	تیس دروس احادیث	مکتبہ اسلامی	راولپنڈی	۲۰۰۳ء
۱۱۲۔	محمد زاہد اقبال، مولانا	عصر حاضر میں غلبہ دین کا نبوی طریقہ کار	ادارہ نشریات محمود حسن	لاہور	۲۰۰۸ء
۱۱۳۔	محمد شفیع، مفتی	معارف القرآن	ادارۃ المعارف	کراچی	۱۹۸۷ء
۱۱۴۔	مریم جمیلہ	اسلام ایک نظریہ ایک تحریک	محمد یوسف خان	لاہور	۱۹۷۸ء
۱۱۵۔	مصطفٰے محمد الطحان، ڈاکٹر	معتدل اسلامی فکر	مکتبہ المصباح	لاہور	۲۰۰۸ء
۱۱۶۔	مظفر علی حسن، پروفیسر	امت مسلمہ کا زوال کیوں؟	مکتبہ اخوت	لاہور	۲۰۰۳ء
۱۱۷۔	منصور پوری، محمد سلیمان سلمان، قاضی	رحمۃ للعالمین	مکتبہ اسلامیہ	لاہور	۲۰۰۶ء
۱۱۸۔	مودودی، ابوالاعلیٰ، سید	تفہیم القرآن	مکتبہ تعمیر انسانیت	لاہور	۱۹۷۹ء
۱۱۹۔	مودودی، ابوالاعلیٰ، سید	قوموں کے عروج وزوال پر علمی تحقیقات کا اثر	ادارۂ ترجمان القرآن	لاہور	۱۹۹۲ء
۱۲۰۔	مودودی، ابوالاعلیٰ، سید	تجدید واحیائے دین	اسلامک پبلیکیشنز	لاہور	۱۹۶۱ء
۱۲۱۔	مودودی، ابوالاعلیٰ، سید	شہادت حق	اسلامک ریسرچ اکیڈمی	کراچی	۲۰۰۸ء
۱۲۲۔	میرٹھی، زین العابدین سجاد، مفتی	تاریخ ملت	ادراۂ اسلامیات	لاہور	۱۹۹۱ء
۱۲۳۔	میرزا ادیب	جمال الدین افغانی	یونائیٹڈ پبلشرز	لاہور	۱۹۴۷ء
۱۲۴۔	ندوی، جلیل احسن مولانا	زادراہ	اسلامک پبلیکیشنز	لاہور	۱۹۹۵ء

۱۲۵۔	ندوی، ابوالحسن علی، سید	مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	مجلس نشریات اسلام	کراچی س ن
۱۲۶۔	ندوی، محمد الیاس	مسلم دنیا ماضی اور حال	مجلس نشریات اسلام	کراچی ۱۹۹۷ء
۱۲۷۔	ندوی، ابوالحسن علی، سید	اسلامی بیداری	دعوۃ اکیڈمی	اسلام آباد ۱۹۹۷ء
۱۲۸۔	ندوی، محمد شہاب الدین	اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں	مجلس نشریات اسلام	کراچی ۱۹۸۳ء
۱۲۹۔	ندوی، ابوالحسن علی، سید	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	مجلس نشریات اسلام	کراچی س ن
۱۳۰۔	ندوی، سید سلیمان، مولانا	خطبات مدراس	مکتبہ خلیل	لاہور س ن
۱۳۱۔	ندوی، شاہ معین الدین	تاریخ اسلام	علم وعرفان پبلشرز	لاہور ۲۰۰۳ء
۱۳۲۔	ندوی، مسعود عالم	محمد بن عبدالوہاب	مکتبہ چراغ راہ	کراچی ۱۳۶۱ھ
۱۳۳۔	ندوی، ابوالحسن علی، سید	عالم اسلام کی بنیادی اور عمومی ضرورت	دعوۃ اکیڈمی	اسلام آباد ۱۹۹۸ء
۱۳۴۔	وارثی، خورشید علی، سید	اتحاد ملت اسلامیہ	وارثی پبلی کیشنز	کراچی ۱۹۸۳ء
۱۳۵۔	وارثی، خورشید علی، سید	روح اتحاد امۃ	وارثی پبلیکیشنز	کراچی ۱۹۸۲ء
۱۳۶۔	ول ڈیورانٹ مترجم یاسر جواد	اسلامی تہذیب کی داستان	نگارشات	لاہور ۲۰۱۰ء

137 Michal H Hart "The 100" Citadel Press New York 1987

138. Mazhar ul Haque " A short history of Islam" Book Land Lahore 1977

139. Bertrand Russell "The impact of science on society" London George Allen, 1959

140. Ameer Shakeeb Arsalan "Our Decline and its causes" Sh Muhammad Ashraf Lahore 1968

۱۴۱۔ ترجمان القرآن ،لاہور، ماہنامہ، اشاعت خاص، مئی ۲۰۰۷ء

۱۴۲۔ ترجمان القرآن ،لاہور، ماہنامہ، اشاعت خاص، مئی ۲۰۰۴ء

۱۴۳۔ دعوۃ، اسلام آباد، ماہنامہ، مئی ۱۹۹۹ء

۱۴۴۔ اخبار اردو، اسلام آباد، ماہنامہ، اکتوبر ۲۰۱۰ء